عفّت موہانی

کا ضخیم ناول

راستہ پھولوں کا

قیمت

ستائیس روپئے

ناشر

نسیم بک ڈپو۔ ۲۵ لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ ۱۸

فون: آفس:۔ ۴۴۵۵۹
رہائش:۔ ۴۵۳۳۴

باہتمام:۔ نہیم انہونوی (بار اول ۱۹۸۷ء) پرنٹر:۔ سرفراز پریس لکھنؤ

سعید صاحب آفس سے نکل کر اپنی کار کی طرف بڑھے۔ اس روز انھیں
غیر معمولی طور پر مصروف رہنا پڑا تھا۔ چند غیر ملکی بزنس مین اپنے کاروبار
کی سب برانچس یہاں بھی قائم کرنا چاہتے تھے۔ ان کے ساتھ دیر تک گفتگو
میں لنچ بھی گیا اور سہ پہر کی چائے بھی نہ مل سکی۔ شام کے پانچ بجے تھکن
کے مارے ان کا حال یہ ہو رہا تھا کہ قدم اٹھانا اور کار ڈرائیو کرکے گھر
پہونچنا ایورسٹ کے سر کرنے کے برابر لگ رہا تھا۔ اور ایسی حالت میں
انھیں دفعتہً معین میاں دکھائی دیے جو لمبے لمبے ڈگ بھرتے انھی کی طرف
آرہے تھے۔ سعید صاحب نے ایک طویل سانس لی اور کار کی چھت پر
ہاتھ ٹیک کر ان کے قریب پہونچنے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔ معین
میاں۔ چلتے پھرتے اخبار مشہور تھے۔ اگر کوئی اہم یا غیر اہم خبر کسی کے
کانوں تک نہ پہونچی ہو تو معین میاں سے رجوع کرنا کافی تھا۔ خبر سنا
کر اس پر معقول تبصرہ کرکے وہ سننے والے کو خاطر خواہ سزا دے دیتے
تھے۔ اکیلے آدمی تھے۔ نہ کوئی گھر بار نہ کہیں روٹی روزی کا ٹھکانہ۔
معلوم نہیں کس ترکیب سے چند شرفا سے شناسائی قائم کر لی تھی جو ان
کے کھانے پینے کا سامان کر دیتے تھے۔ یا تو کبھی کسی کی ڈیوڑھی میں پڑ

رہتے۔ یا پھر اللہ کا گھر بھلا کہاں گیا تھا۔ ادھر اذان ہوئی کہ انھوں نے نمازیوں کی آنکھ بچا کر باہر کی راہ لی۔ کہیں نہ کہیں حلق کے بھیگنے کا انتظام ہو ہی جاتا تھا۔ بڑے چرب زبان، بکار خویش ہوشیار بظاہر سیدھے سادے تھے۔ انتہا سے زیادہ باتونی۔ سارے شہریوں کا کچا چٹھا ان سے سن لیجئے۔ جب بھی کسی سے ملتے ایک نہ ایک اہم خبر سنا کر کھانے چائے کے حقدار بن بیٹھتے!"

زیادہ قریب آ کر وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر آس پاس کی پرواہ کیے بغیر چیخے۔

"رکیے جناب۔ ٹھہریئے۔ میں تو آپ کے دولت خانے پر حاضری دینے کی نیت سے نکلا تھا۔ مولا کا احسان ہے کہ آپ راستے میں مل گئے آج حضور کو دفتر میں دیر ہو گئی!"

"آپ مجھ سے کس لیے ملنا چاہتے تھے۔ براہ کرم جلدی بتائیے اور اجازت دیجیے"۔ سعید صاحب نے جھنجلاہٹ کے باوجود لہجہ خوشگوار ہی رکھا۔ "بہت تھک گیا ہوں۔ اور گھر جانا چاہتا ہوں۔ کیا کوئی بہت ضروری اور اہم بات ہے!؟"

"اے حضور ایسی بات ہے کہ مجھے ڈر ہے۔ آپ اسے سننے کے متحمل بھی ہو سکیں گے۔ یا پھر مجھے جھوٹا کذاب اور افترا پرداز خیال فرمائیں گے۔ بہرحال وہ معاملہ یہ ہے کہ یہاں سر راہ بتانے کا نہیں ہے"۔

"آپ نے تو تھکن بڑھا دی معین میاں۔ خیر چلیے گھر ہی چلتے ہیں آئیے بیٹھ جائیے۔ گھر چل کے اطمینان سے کہیئے گا!" سعید صاحب نے کار کا دروازہ کھولا۔ معین میاں ٹوٹی پھوٹی پان زدہ بتیسی نکالے اگلی سیٹ

پر ٹِک گئے۔ سعید صاحب نے اپنی نشست سنبھالی اور کار اسٹارٹ کر دی وہ دل ہی دل میں بے زار ہو رہے تھے۔ یہ پیر تسمہ پا کہاں سے لپٹ پڑا وہ گھر پہونچ کر آرام کرتے۔ لیکن بڑی دلجمعی سے معین میاں کی بکواس سن رہے تھے! پھر کچھ نہ کچھ کہنے کی غرض سے بولے۔

"معین میاں آپ نے اتنی عمر خوامخواہ برباد کی۔ آخر کیا وجہ تھی کہ آپ نے شادی نہ کی۔ آج آپ بھی بیوی بچوں کے درمیان زندگی کا لطف اٹھاتے۔ میں سمجھتا ہوں۔ خدا نظر بد سے بچائے۔ آپ پچپن کے تو ہو گئے ہیں!"

"سرکار پورے باسٹھ کا ہوں۔!" وہ رعب سے بولے۔

"ماشاءاللہ ماشاءاللہ۔!"

"حضور کا لڑکپن اور زمانہ شباب بھی ان آنکھوں نے دیکھا ہے۔ خدا بخشے۔ آپ بہتیری بار جنت مکانی بڑے سرکار کے ساتھ والد صاحب مرحوم کے ادارے تشریف لائے تھے۔ وہ مکانوں کی دلالی کرتے تھے یہ موجودہ دولت خانہ بابا واہی کی ایما پر بڑے صاحب نے خرید اتھا۔"

"واقعی!"

جی ہاں۔!" معین میاں نے اپنی اہمیت جتائی۔"میں سمجھتا ہوں کہ آپ مجھ سے پندرہ سولہ سال ضرور چھوٹے ہیں۔"

"ارے جناب! جب آپ والد صاحب کے دوست ہیں اور عمر میں بھی مجھ سے بڑے ہیں تو پھر یہ سرکار اور حضور کا تکلف کیا ہے۔ کیا آپ مجھے شرمندہ کرنا چاہتے ہیں معین صاحب!"

یہ تو آپ کا نمک کہلواتا ہے۔ میاں!" معین میاں نے اپنی حسرت آلود

سانس لی اور اس لہجے میں یہ بات کہی کہ سعید صاحب چپ ہو گئے!۔
گھر پہونچ کر سعید صاحب نے انھیں اسٹڈی میں بٹھایا اور اندر جانے لگے تو معین میاں انھیں متوجہ کر کے بولے۔
"بادشاہ آپ کے مزاج میں تکلف اور مروّت زیادہ ہے۔ اب آپ میری ضیافت کے لیے کشتیاں اور سینیاں لبریز کر کے نہ بھجوا دیجئے گا سہ پہر کو میں چائے کے ساتھ صرف بھنے ہوئے گردے اور چار بسکٹ لیتا ہوں۔ زیادہ زحمت کی کوئی ضرورت نہیں!۔
گردے تو شاید اس وقت نہ ہوں۔ بہرحال پوچھتا ہوں۔!" یہ کہہ کر سعید صاحب گھر کے اندر چلے گئے!۔
انھوں نے ان کے لیے بسکٹ چائے باہر بھجوا دی۔ پھر خود ناشتہ کر کے اور تھکن اتار کر باہر پہونچے تو معین میاں سارے برتن خالی کر کے ایک دوسری میز پر رکھ چکے تھے!۔ سعید صاحب نے صوفہ پر بیٹھ کر انھیں مخاطب کیا۔
"فرمایئے۔! کون سی اہم بات آپ مجھ سے کہنے والے ہیں:" پھر انھوں نے ایک سگریٹ سلگائی اور سگریٹ کیس لائیٹر کے ساتھ ان کے سامنے سرکا دیا۔
چند کش لگا کے معین میاں نے خود کو تیار کیا اور پھر بولے: "سعید صاحب میں عرض کر چکا ہوں کہ بات ذرا ناقابل برداشت ہے۔
فرمایئے تو عرض کروں۔ ورنہ یہ بات ایسی ہے کہ آپ کو معلوم ہو ہی جائے گی۔! میں ڈرتا ہوں کہ کہیں آپ۔!"
سعید صاحب کے ضبط کا پیمانہ چھلک گیا: "تمہید بہت ہو چکی جناب

کہہ دیجئے صاف صاف! کیا بات ہے۔ میں ہر طرح کی باتیں برداشت کر سکتا ہوں۔ کیا میرے دفتر کا کوئی معاملہ ہے؟"

"جی نہیں۔ میاں۔ بات اپنی صاحبزادی کی ہے!" وہ دھیمی آواز میں بولے۔ اور نظریں جھکا لیں۔ سعید صاحب سیدھے ہو بیٹھے۔

"صاحبزادی کی۔ کیا مطلب ہے آپ کا۔ روحی سے کوئی شکایت ہے آپ روحی کا تذکرہ کر رہے ہیں نا!

روحی سعید صاحب کی بڑی نازوں کی پالی لڑکی تھی۔ ڈگری کالج سے گریجویشن کر کے ایم۔ اے کے پہلے سال میں داخلہ لیا تھا۔ وہ بڑی خوبصورت سمجھدار، اور مہذب تھی۔ سعید صاحب اسے بے حد چاہتے تھے۔ اس سے چھوٹا ایک بھائی تھا۔ وہ اپنے چچا کے پاس دہرہ دون میں رہتا تھا چچا لاولد تھے۔ اور اتفاق سے چچی اس کی سگی خالہ بھی ہوتی تھیں۔ لہٰذا بیگم سعید نے اپنی بہن اور دیور کی محرومی کا خیال کر کے عبید کو انہیں دے دیا تھا۔ نوید صاحب اسے حقیقی بیٹے کی طرح چاہتے تھے۔

چند لمحوں بعد سعید صاحب کے استفسار پر معین میاں نے کہا۔ "آپ کو معلوم ہے کہ میری دن بھر کی آوارہ گردی میں میرا گذر ہر گلی کوچے سے ہوتا ہے۔ آج ہفتہ بھر سے مسلسل میں روحی بٹیا کو ایک لڑکے کے ساتھ دیکھ رہا ہوں۔ پہلے تو میں یہ سمجھتا تھا کہ وہ ان کے ساتھ پڑھنے والا کوئی ہوگا۔ اتفاقاً دونوں پارک میں آ بیٹھے ہوں گے۔ میں نے کوئی اہمیت نہ دی۔ پھر میں نے انھیں ایک۔ ۔ ۔"

سعید صاحب کی پیشانی پسیجنے لگی۔ اس سطحی انسان نے اگر واقعی یہی دیکھا ہے جو کہہ رہا ہے تو معلوم نہیں کہ رائی کا ہمالیہ کس طرح بنا دے۔

ہو سکتا ہے کہ یہ نظری دھوکا ہو۔ چنانچہ انھوں نے دل کڑا کرکے پوچھا۔

"آپ کو یقین ہے کہ وہ روحی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ اتنی بیباک اور دلیر ہے کہ کسی غیر آدمی کے ساتھ پبلک مقامات پر دکھائی دے۔! آپ نے بنجانے کسے دیکھا ہے اور میرے پاس دوڑے آئے ہیں۔ روحی ایسی نہیں ہے۔"

پہلے میں بھی یہی سمجھا تھا صاحب!" معین میاں نے فراخدلی سے ایک اور سگریٹ سلگا کر کہا۔ "شاید کوئی اور لڑکی ہے اپنی صاحبزادی سے ملتی جلتی ہوئی۔ میں اس واقعہ کو بھول ہی گیا تھا۔ لیکن کل صبح گیارہ بجے میں نے اس لڑکے کے ساتھ صاحبزادی سلمہا کو میوزیم کے پارک میں اور آج دوپہر کو خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ کانٹی ٹل کے بڑے ہوٹل میں دیکھا اور۔"

کانٹی نینٹل ہوٹل۔؟؟" سعید صاحب نے کہا۔

"جی بس وہی۔" معین میاں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میں باہر ہی کھڑا سگریٹ خرید رہا تھا۔ میری نظر ان دونوں پر پڑی۔ لیکن انھوں نے مجھے نہیں دیکھا۔ باتیں کرتے اندر چلے گئے۔ سگریٹ خرید کے میں بھی اندر گیا سعید صاحب، اور ایک طرف بیٹھ کر ان کی باتیں سنیں۔ کچھ زیادہ پلے نہ پڑ سکا صرف یہ کہ صاحبزادی اس لڑکے کو شکیل شکیل کہہ کر مخاطب کر رہی تھی۔ واقعہ یہ تھا میاں کہ لڑکا سچ مچ اسم بامسمّٰی تھا۔ قد آور، خوبصورت!

شکیل۔" سعید صاحب کے ذہن میں ایک بجلی سی چمکی۔ روحی کے ایم اے میں داخلے کے بعد انھوں نے اس کے کلاس فیلوز کے بارے میں پوچھا تھا تب روحی نے تین چار نام بتاتے ہوئے خصوصیت سے ایک لڑکے شکیل

کے متعلق بہت تفصیل سے بتایا تھا۔ اس نے آنرز میں ٹاپ کیا تھا۔ بڑا
ذہین تھا۔ بے حد سنجیدہ اور مہذب تھا۔ دوسرے لڑکوں کی طرح چھچھورا
نہیں تھا۔ یہ اور وہ۔ بہت سی تعریف روحی نے شکیل کی کر دی تھی
اس وقت تو سعید صاحب نے کچھ خیال نہ کیا تھا مگر اب وہ بڑی گہرائی تک
پہونچ رہے تھے۔ اور گم صم تھے۔

معین میاں نے اپنا فرض ادا کر دیا تھا۔ اور اب غور سے مخاطب کے
چہرے کے اتار چڑھاؤ کا مطالعہ کر رہے تھے۔ سعید صاحب نے پوچھا۔

"یہ تو تھوڑا بہت آپ نے سنا ہی ہوگا کہ ان کی گفتگو کا موضوع کیا تھا!
یونیورسٹی سے باہر ملاقات کا کچھ مقصد ان کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا؟"

"انگریزی ملی اردو بول رہے تھے۔" معین میاں نے جواب دیا۔ "میں
انگریزی سوائے یس اور نو کے اور کیا جانتا ہوں۔"

"خیر۔ آپ کا شکریہ۔ میں تحقیق کروں گا کہ کیا قصہ ہے۔ سعید
صاحب کے دل میں طوفان سا مچا تھا۔ لیکن واقعہ کی اہمیت کو کم کرنے
کی غرض سے انھوں نے بالکل بے پروائی سے کہا: "اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکے
لڑکیاں ذہنی طور پر اتنے وسیع النظر اور کیا کہتے ہیں کچھ دلیر اور بیباک
ہو جاتے ہیں کہ اس طرح ملنا جلنا اور باتیں کرنا معیوب نہیں سمجھتے!
بہر حال آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے میری بچی کو اپنی بچی سمجھ کر اس
کی کسی لغزش پر مجھے آگاہ کرنا ضروری خیال کیا۔ لیکن ایک گزارش
آپ سے ہے کہ اس واقعہ کی اپنے احباب میں تشہیر نہ کیجئے گا!"

"کیا بات کرتے ہیں آپ بھی میاں۔" معین میاں نے کچھ برا مان
کر جواب دیا۔ "کون سی خاص بات ہے جس کا میں چرچا کرتا پھروں گا!"

شکریہ جناب!"۔ سعید صاحب کھڑے ہو گئے۔ مطلب یہ تھا کہ معین میاں بھی دفع ہو جائیں۔ چنانچہ وہ بھی طوعاً وکرہاً کرسی سے اٹھے اور زیر لب یوں، کہ سعید صاحب سُن سکیں۔ بولے:"

پتہ نہیں شہر نو کی سرائے تک جاتے جاتے کتنی رات ہو جائے۔ دروازہ جلدی بند کر دیا تو رات کے کھانے کا خدا ہی حافظ ہے مروت تو کم بخت کو چھو نہیں گئی"۔ حالانکہ انھوں نے کوئی دل خوش کن خبر نہیں سنائی تھی مگر سعید صاحب کو اخلاقاً کہنا ہی پڑا۔

کوئی فکر کی بات نہیں۔ آپ گھوم پھر کے آٹھ بجے رات کو آسکیں تو کھانا یہیں کھا لیجیے گا!"

انھیں دفع کر کے سعید صاحب اندر آگئے۔! بے حد فکر مند لگ رہے تھے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ نوجوان بیٹی سے کس پیرائے میں استفسار کریں۔ کیا سوچے گی وہ۔ اگر یہ خبر سچ نکلی تب کیا ہوگا۔ سعید صاحب نئی روشنی کے پروردہ بھی تھے اور روشن خیال بھی تھے۔ لیکن اس حد تک بھی نہیں کہ اپنی مشرقیت کو بھول کر مغرب کے رنگ میں ڈوب جاتے۔ ان کے گھر کی تہذیب گنگا جمنی سی تھی۔ اگر ان کے ہاں مرد خدمتگار تھے تو ایک پرانی سی مغلانی بوا بھی تھیں۔ کچن میں خانساماں کام کرتا تھا مگر بیوی اور بیٹی بھی ہر قسم کے کھانے پکانا جانتی تھیں۔ لڑکی کو انھوں نے انگریزی تعلیم دلائی تھی لیکن وہ مذہبی امور کی بھی پوری پابندی کرتی تھی۔ نماز تلاوت اور روزے باقاعدہ رکھے جاتے۔ سعید صاحب بھی پابندی وقت باقاعدہ نماز پڑھتے۔ ان کی بیوی بھی مشرقیت کی زندہ تصویر تھیں۔! اپنی بیٹی کو مشرق و مغرب کی تہذیب سے روشناس

کرنے میں بیوی ہی کی کوششیں زیادہ تھیں۔! انھیں روحی پر فخر تھا اگر وہ بہترین انگریزی بول سکتی تھی تو نہایت خوش الحانی سے تلاوت بھی کر سکتی تھی۔ اس ماحول، وفضا میں کلبوں کی حاضری اور ہوٹل بازی کا کہیں گزر ہی نہ تھا!۔

لیکن روحی کے ہوٹل میں بیٹھ کر کسی مرد ساتھی سے بات چیت کرنے کا تصور سعید صاحب کے لیے اس قدر سوہان روح ہو رہا تھا کہ ان کا چہرہ بھی فکر و تشویش کی آماجگاہ بن کر رہ گیا تھا!۔ وہ دالان میں آئے اور روزمرہ کی طرح ہنسنے بولنے اور گپ شپ کرنے کی بجائے کسی اجنبی کی طرح تخت کے گوشے پر ٹک گئے اور بے مدعا ادھر ادھر دیکھنے لگے!۔ ان کی نظر اچانک روحی پر پڑی۔ مغرب کی نماز کے لیے وضو کر کے اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ اس کا چہرہ ہمیشہ کی طرح پاکیزہ، معصوم اور بھولا بھالا لگ رہا تھا۔ وضو نے جیسے تر و تازہ کر دیا تھا۔ زیادہ نکھار دیا تھا۔ ایک ملکوتی تبسم سعید صاحب کو اس کے چہرے پر دکھائی دیا اور وہ سوچنے لگے۔ کیا سچ مچ یہ محجوب شرمیلی سی لڑکی کسی مرد کے ساتھ ہوٹل میں بیٹھ کر باتیں کر سکتی ہے؟۔

روحی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی اور سعید صاحب اسی رخ پر تکتے رہ گئے!۔

"کیوں کیا بات ہے۔ آپ کچھ سوچ رہے ہیں!" دفعتہ بیگم سعید نے پوچھا۔ سعید صاحب نے سر اٹھایا ایک اداس سی سانس لی اور بیوی کی طرف دیکھا۔ ان کی پریشانی بیگم سعید کے چہرے پر بھی کود رہی تھی!۔

سعید صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور چپکے سے بولے " ذرا میرے ساتھ میرے کمرے میں آؤ " اور تیز تیز قدم اٹھاتے باہر چلے گئے۔ وہ ان کے پیچھے لپکیں، اور کمرے میں پہونچ کر بولیں۔ کچھ کہیئے بھی تو آج کوئی نئی بات ہوئی ہے کیا۔ آپ کا چہرہ کیوں اترا ہوا ہے "

" سنو آمنہ! بات کچھ ایسی ہی ہے۔ وہ متین صاحب ابھی تشریف لائے تھے۔ ایک عجیب خبر سنا رہے تھے۔ میں نے تو خیر ان کی بکواس کا یقین نہیں کیا لیکن ایک ناگواری لاحق ہوگئی ہے کہ وہ جو کچھ کہہ رہے تھے۔ واقعی پرسچ تو نہیں ہے۔ ارے تم بیٹھ جاؤ۔ ایسی بھی وحشت ناک بات نہیں ہے! "

آمنہ بیگم کچھ بوکھلائی سی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ اور جلدی سے بولیں متین میاں کی بکواس بھی کچھ یقین کرنے والی ہوتی ہے۔ انکی عادت ہے بے پر کی خوب اڑاتے ہیں۔ آپ سے کیا کہا انھوں نے۔ ؟

" مجھ سے وہ بے پر کی نہیں اڑا سکتے " سعید صاحب نے کہا " خاص کر روحی کے بارے میں "

روحی کے بارے میں " آمنہ بیگم کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں " خدا خیر کرے۔ کیا کہہ رہے تھے وہ روحی کے متعلق۔ ؟ میرا تو دل دھڑکنے لگا! "

" تم یہ بتاؤ آمنہ کہ روحی یونیورسٹی سے کب آتی ہے۔! "

" ہمیشہ اپنے پرانے وقت پر۔ تین بجے! "

" اچھی طرح معلوم ہے!۔ "

" ہاں۔ کیوں۔ کہیئے نا کیا بات ہے؟ "

" میں نے سنا ہے کہ۔ کہ۔ وہ خدانخواستہ اپنے کسی کلاس فیلو شکیل

نالی لڑکے کے ساتھ پارکوں میں پھرتی ہے۔ ہوٹل بازی شروع کر رکھی ہے اس نے۔ یہ سب خبریں معین میاں ہی نے مجھے پہونچائی ہیں۔ اور میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ انھوں نے مجھ سے جھوٹ نہیں کہا۔ اتنی ہمت وہ نہیں کر سکتے! امیں نے انھیں ٹال دیا ہے۔ لیکن میں خود بڑا پریشان ہو رہا ہوں۔ کیا واقعی وہ شکیل کے ساتھ وہاں گئی ہے جہاں، میرا گمان تک نہیں جا سکتا! مجھے یہ معلوم ہے کہ شکیل اس کا کلاس فیلو ہے۔ اسی نے اس کا تذکرہ میرے سامنے کیا تھا۔ اب تم بتاؤ کہ کیا کیا جائے۔ اگر واقعی وہ اس بدعت کی مرتکب ہوئی ہے۔ تو کیا نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟"

شکیل کی تعریفیں تو وہ میرے سامنے بھی کرتی ہے: آمنہ بیگم نے عجیب سے وحشت خیز لہجے میں کہا۔ مگر میں نہیں سمجھتی کہ روحی یکبارگی اتنی نڈر اور بیباک ہو سکتی ہے کہ پارک میں گھومے پھرے۔ ہوٹل میں جا بیٹھے! آپ کو یقین کیسے آگیا اس چھوکرے کی بات پر؟"

بات کو سمجھا کرو۔ نہ وہ جھوٹا ہے نہ اس کی بات غلط ہو سکتی ہے۔" سعید صاحب جھنجلا گئے۔ "تم اسی خیال میں رہ جاؤ گی اور وہاں معاملہ بڑھ جائے گا۔ میرا مشورہ مانو۔ کسی طرح روحی سے پوچھو۔ آخر بات کیا ہے؟۔

اگر خدانخواستہ۔!" آمنہ بیگم نے سہم کر پوچھا۔

"خدانخواستہ یہی کی بات ہوئی تو میں اسے گھر بٹھا دوں گا۔ گریجویٹ ہو چکی ہے۔ مزید تعلیم کی کوئی ضرورت نہیں۔" سعید صاحب نے کہا "بہرحال تم دریافت حال کے بعد مجھے رات کے کھانے کے بعد یا صبح کو جواب دینا میں آج بہت مصروف تھا۔ آرام کرنا چاہتا تھا مگر اب کہاں کا آرام۔ سر میں درد شروع ہو گیا ہے۔!

آپ آرام کیجئے میں چائے بھجواتی ہوں: یہ کہہ کر آمنہ بیگم چلی گئیں اور سعید صاحب آنکھوں پر کہنی ڈھانک کر صوفے پر لیٹ گئے۔

آمنہ بیگم کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ روحی سے کیا پوچھیں گی۔ یہ بات کیا ان کے منھ سے نکل سکے گی کہ کیا اس نے کسی لڑکے سے دوستی کر رکھی ہے اور اس کے ساتھ یہاں وہاں گھومتی پھرتی ہے۔!

روحی نے ہمیشہ کی طرح مغرب کی نماز پڑھ کر کتابیں سنبھالیں اور ہوا کے رخ پر دریچے میں آبیٹھی تھی۔ موسم گرما شباب پر تھا۔ دن بھر سورج کی تیز کرنیں زمین کو جھلساتی رہیں گرم ہوائیں یوں چہرے پر لگتیں جیسے لو نے تھپڑ مارا ہو۔ درخت خشک تھے۔ نیچے چھوٹے سے باغ میں جھاڑ جھنکار ڈاکھڑا ہو رہا تھا۔ ہشت پہلو خوبصورت حوض جو شفاف پانی کا فوارہ اچھالتا تھا اب ویران ہو گیا تھا۔

شام ہو چکی تھی چراغ جہاں تہاں روشن ہونے لگے تھے۔ لیکن شام اب بھی گرم تھی۔ جاتی ہوئی دھوپ تپش میں بدل رہی تھی۔ خنک و خوشگوار ہوا کا کہیں گزر نہ تھا۔

سیلنگ فین آہستہ آہستہ گھوم رہا تھا۔ اور نسبتاً ہلکی پھلکی ہوا پھینک رہا تھا۔ روحی نے کھڑکی کے پٹے سے کتاب اٹکا دی اور گھٹنے پر ٹھوڑی ٹیک کر سطروں پر نظریں دوڑانے لگیں!۔ اس کے لبوں پر ایک پر معنی مسکراہٹ تھی اور چہرہ دمک رہا تھا! رہ رہ کر اس کی نگاہیں کتاب پر سے اچٹتیں اور خلا میں تکنے لگتیں۔

"روحی۔!" آمنہ بیگم نے اسے مخاطب کیا۔ پردے کے پیچھے کھڑی دیر سے اس کی محویت و فراموشی کا نظارہ کر رہی تھیں! ان کا گہرا مشاہدہ کہہ رہا

تھا کہ روحی کی مسکراہٹ میں کوئی راز چھپا ہوا ہے۔!

"آیئے ممی۔!" اس نے کتاب پھٹ سے بند کی اور بستر پر اچھال دی۔ پھر خود بھی دریچے سے اُتری اور پردہ سرکایا۔

پڑھ رہی تھیں"۔ آمنہ بیگم نے اندر آکر بڑی متجسس نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا تھا۔ شاید کوئی ایسی چیز دکھائی دے جائے۔ کوئی ننھا سا تحفہ۔ کوئی خط نما کاغذ۔ ان کی چبھتی ہوئی نظروں کا جائزہ روحی بھی لے رہی تھی۔ اور حیران تھی۔ کیا بات ہے ممی!۔ وہ پریشان سے لہجے میں بولی۔ "بیٹھ جاؤ تو بتاؤں!۔ آمنہ بیگم نے کہا اور کرسی پر ٹک گئیں۔ ان کے بیٹھنے کے بعد روحی بھی ایک طرف بیٹھ گئی۔ ماں کے مغائرانہ سلوک کو متحیرانہ انداز میں دیکھ رہی تھیں۔

آپ بہت فکرمند لگ رہی ہیں ممی۔ خیریت تو ہے نا۔!" اس نے پوچھا۔ "آپ نے صبح کو کہا تھا چچا جی کا خط آیا ہے۔ کیا لکھا ہے انھوں نے!"

سب خیریت ہی ہے بیٹی۔!" آمنہ بیگم نے جواب دیا۔ "مجھے تو پریشانی دوسری ہی بات کی ہے۔ مجھ میں نہیں آتا کہ میں تم سے کیا کہوں۔ آج مجھے معلوم ہوا ہے کہ۔ تم اپنا کالج چھوڑ کر ادھر ادھر تفریحیں کرتی پھرتی ہو۔ اور خدا نخواستہ تم اکیلی بھی نہیں ہوتیں۔۔ یہی تم سے پوچھنا تھا روحی۔ کیا یہ سچ ہے۔ کون لڑکا ہوتا ہے تمھارے ساتھ!؟"

یکبارگی روحی کا دمکتا ہوا چہرہ سفید ہو گیا! اور یہ انداز آمنہ بیگم سے پوشیدہ نہ رہ سکا! ان کا دل دھڑکنے لگا! لیکن دوسرے لمحے روحی نے کہا۔

"ٹھیک ہے ممی۔! مجھے بلیاسہ میں امتحان کی فیس بھرنی تھی۔ چونکہ میں صبح کو دیر سے پہونچی تھی۔ میری ساتھی سب لڑکیاں جا چکی تھیں۔ اور پھر۔

"پھر۔؟" آمنہ بیگم نے لقمہ دیا۔

آپ کو میں نے بتایا تھا ممی کہ شکیل نامی ایک صاحب میرے ساتھ پڑھتے ہیں۔ چونکہ انھوں نے کبھی فیس نہیں بھری تھی لہٰذا انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں، اگر آپ تنہا جاتے گھبراتی ہیں تو میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ وہ میرے کلاس فیلو ہیں اور ہم چھ ماہ سے ساتھ پڑھ رہے ہیں۔ کوئی اجنبیت اور نیا پن ہم میں نہیں ہے۔ اس لیے میں ان کے ساتھ گئی تھی۔ اور ممی میں آپ سے چھپاتی نہیں۔ واپسی میں گرمی بہت محسوس ہو رہی تھی اس لیے ہم پندرہ بیس منٹ کے لیے پارک میں بیٹھ گئے تھے۔! آپ سے جس نے میری مخبری کی ہے۔ وہ کچھ ناقابل اعتبار اور افترا پرداز بھی معلوم ہوتا ہے۔!"

"اور اس کے بعد تم اسی لڑکے کے ساتھ کسی بڑے ہوٹل بھی گئی تھیں!" انھوں نے گویا اس کی چوری پکڑ لی۔

"جی۔!"

"کیوں گئی تھیں۔ غیر مردوں کے ساتھ ہوٹل بازی کرنا کسی شریف لڑکی کا کام نہیں ہے۔ آج تک تم نے ایسی حرکت نہیں کی تھی۔ کیا یہ مردوں کے ساتھ پڑھنے کا نتیجہ ہے کہ تم اتنی دیدہ دلیر اور بیباک ہو گئی ہو۔؟ روحی سنو!۔ تمھیں اس لڑکے کے ساتھ تمھارے باپ کے ایک ملنے والے نے دیکھ لیا ہے۔ انھی نے یہ سب کچھ ان سے کہا تھا اب وہ بہت فکر مند ہیں۔ ایک نا واجب حرکت تم نے کی ہے مگر شرمندہ ہو رہے ہیں وہ۔!"

"اس میں شرمندگی کی کیا بات ہے۔" روحی نے اپنی عادت کے بخلاف تیز لہجے میں جواب دیا۔ "ڈیڈی کے دوست نے کسی، مجھی کو

دیکھا تھا۔ ارے ممی۔ ہمارا سارا گروپ آئس کریم کھانے کانٹی نینٹل ہوٹل گیا تھا۔ میں اکیلی نہ تھی۔!

"شکیل تو تھا تمھارے ساتھ!" تیکھے لہجے میں آمنہ بیگم نے کہا۔

"شکیل تو دن بھر میرے ساتھ رہتے ہیں۔ کلاس میں۔ لائبریری میں سیمنار میں۔ وہ میرے ہم جماعت ہیں۔ ہمیں ساتھ رہنا ہی پڑتا ہے"

روحی کے اس جواب نے آمنہ بیگم کو پریشان اور خوفزدہ کر دیا۔

"کئی اور بھی تو لڑکے ہیں تمھارے ہم جماعت" انھوں نے برہم ہو کر کہا "پھر یہ شکیل ہی کیوں"

"دوستی اچھے آدمی سے کی جاتی ہے ممی۔ آپ کو کیا معلوم کہ دوسرے ساتھی کیسے بدتمیز اور لفنگے ہیں!"

"روحی تم پڑھنے جاتی ہو۔ دوست بنانے ان کے ساتھ گھومنے پھرنے نہیں" ابکی آمنہ بیگم کا لہجہ تیز اور غصہ ور تھا "مجھے حیرت ہے کہ تم سی شرمیلی پردہ نشین اور حیادار لڑکی اتنی بدل کیوں گئی ہے۔ کچھ نہیں۔ یہ سارا مخلوط تعلیم کا کیا دھرا ہے۔ تمھارا اعلیٰ تعلیم کا شوق دیکھتے ہوئے ہم نے تمھارا مردوں میں پڑھنا گوارہ کر لیا تھا۔ لیکن اگر وہاں لفنگوں اور بدمعاشوں کی رفاقت تمھیں اس قدر نڈر اور بےباک بنا رہی ہے تو ایسی اعلیٰ تعلیم کو ہمارا دور سے سلام۔ ہم تمھیں گھر بٹھا لیں گے۔ یہ ہم کیسے گوارہ کر سکتے ہیں کہ تم کسی لڑکے کے ساتھ گھومتی پھرا کرو۔ تمھیں جانے پہچانے لوگ دیکھا کریں اور ہماری عزت نیک نامی اور تمھاری آبرو خطرے میں پڑ جائے"

"میں لفنگوں سے خود بھی نہیں ملتی"۔ روحی نے بھی سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "اور یہ مجھے معلوم ہے کہ شکیل نہ تو لفنگے ہیں نہ بدمعاش۔ چھ سات ماہ میں

ان کا اچھی طرح جائزہ لے لیا ہے میں نے۔ وہ بہت شریف، مہذب اور سنجیدہ آدمی ہیں۔ میں نہیں سمجھتی کہ اگر میں ان کے ساتھ کچھ دیر کہیں گھوم پھر لیتی ہوں تو یہ کوئی بے عزتی، بدنامی اور بے آبروئی کی بات ہے!۔

"روحی۔ یہ سب کچھ تم کیا کہہ رہی ہو۔ بیٹی"! آمنہ بیگم انگشت بدنداں تھیں۔ انھیں یوں لگ رہا تھا جیسے ان کے سامنے ان کی شرمیلی بے زبان بچی نہیں بیٹھی تھی۔ یونیورسٹی کے آزاد و بے باک ماحول کی پروردہ کوئی غیر ہستی تھی۔ ورنہ ناممکن ہی تو تھا کہ روحی انھیں کسی نامناسب حرکت کی یوں تائید کرے۔

"آپ یہ کیوں نہیں سوچتیں ممی کہ میں اب دس برس کی نا سمجھ بچی نہیں رہی ہوں۔ اپنی بھلائی یا برائی سمجھنے کی تمیز مجھ میں پیدا ہو چکی ہے!"۔ روحی نے گویا تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔

آمنہ بیگم غصہ سے تھر تھر کانپتی کھڑی ہو گئیں۔ اور اسے گھورتی ہوئی بولیں "مجھے تو قائل کر رہی ہو تم۔ اب تمھارے ڈیڈی ہی تمھیں بتائیں گے تمھارا برا کیا ہے اور بھلا کیا"۔ یہ کہہ کر وہ نہایت برہمی کے عالم میں کمرے سے نکل کر چلی گئیں!۔

کالی گھٹا دیر سے تلی کھڑی تھی مگر اس کا اندازہ نہ تھا کہ بارش اس طرح اچانک آ لے گی!۔ لنچ کر کے بی ہوسٹل کے چند اسکالرز اپنے سپروائزر سے ملنے آرہے تھے۔ ابھی کیفے ٹیریا تک نہ پہونچ سکے تھے کہ بڑی بڑی بوندوں

کے ساتھ پانی برسنے لگا اور آناً فاناً دھواں دھار ہو گیا۔ پانچوں آدمی قہقہے لگاتے اور آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا بنا کر بھاگے۔ دو تو کینٹین میں گھس پڑے اور باقی ادھر بھاگے !۔ بارش کا پانی یوں آنکھوں پر پردہ سا تان رہا تھا کہ آگے کچھ سجھائی دینا مشکل تھا۔ لہٰذا اشکیل کی ٹکر کسی سے ہو ہی گئی۔ ایک نرم و نازک سی چیخ سن کر اس نے گھبرا کر پیچھے قدم ہٹائے اور کسی اور سے ٹکرا گیا۔

"یا خدا۔ کیا آپ کو بالکل دکھائی نہیں دیتا۔ جناب !" پیچھے والی آواز نے جھنجھلا کر اسے ایک طرف دھکیل دیا۔ راجن اور کمال ہنس رہے تھے۔

"معاف کیجئے گا۔ یہ پانی۔ آپ کے کہیں چوٹ تو نہیں لگی ۔ !" اس نے بڑی لجاجت سے معافی مانگی !۔

"معاف تو خیر ہم کر ہی دیں گے ۔ !" پیچھے والی شوخ و شریر آواز نے جواب دیا۔ "مگر تعجب ہے کہ آپ صرف بارش سے ڈر کر ایسے اندھا دھند بھاگے ہیں جیسے خدا نہ کرے گولیاں چل رہی ہوں ۔

"میں ایک مرتبہ اور معافی چاہتا ہوں ۔ !" چونکہ وہ لڑکیوں سے ڈرتا تھا پھر معافی مانگ لی ۔

"نہیں بار بار کی ضرورت نہیں۔ ہم نے آپ کی صورت دیکھ کر پہلے ہی آپ کو معاف کر دیا تھا۔ آپ ایسے بھولے بھالے لوگ جان بوجھ کر کوئی شرارت نہیں کرتے !" شریر لڑکی نے کہا۔ "اف نوہ آپ تو بھیگ کے چوہا بن گئے ہیں جلدی سے سر پونچھ لیجئے۔ اللہ نہ کرے نزلہ یا زکام ہو جائے تو کونیل ایسی جان کے لالے پڑ جائیں !"

"اُف۔ نجما، یہ کیا حماقت ہے۔" دوسری لڑکی نے کہا۔ "اب چلو جلدی سے۔ تم ہر ایک سے الجھنے کھڑی ہو جاتی ہو۔ !"

دونوں ایک طرف ہٹ گئیں۔ اور لڑکے ہنستے ایک دوسرے پر فقرے کستے ہوئے اوپر بڑھ گئے!۔ جب وہ اوپر لاونج میں پہونچ کر نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تو بینا نے سر ہلایا۔ اور چٹک چھاپ لہجے میں بولی۔ "تمہاری تقدیر جس سے پھوٹی تھی۔ وہ چہرہ تھا بڑا پُرکشش، میری منگنی اگر تمہارے بہنوئی سے نہ ہو چکی ہوتی تو سالم دل سے ان پر ڈاؤن ہونے میں کچھ قباحت نہ تھی! خیر۔ میرا بدلہ تم چکا لینا۔ دیکھا تو تھا نہ جی بھر کے!"

"ارے خدا کے لیے ہر وقت ایسی واہیات بکواس نہ کیا کرو۔ بینا" روحی نے کہا "خدا کی مار تم پر۔ ابھی شادی ہوئی نہیں اور احسان بھائی کو میرا بہنوئی بنا دیا۔ سچ کہتی ہوں۔ ایسے پر پرزے تمہارے کیوں نکل آئے ہیں۔ میں حیران ہوں۔!"

"وہ دیکھو بیوی۔ تمہارے والے سچ مچ آنکھوں کے چمگادڑ ہی تھے" بینا نے کہا "زینے کے پرلی طرف اپنی کوئی ڈائری یا جانے کیا پھینک گئے ہیں۔ اٹھا تو دوڑ کر تقریب بھر ملاقات اچھی ہے۔ نام پتہ اس پر لکھا ہو تو کل انھیں دے آنا۔ وہ شکریہ ادا کریں گے۔ بس یہ سمجھو کہ پریم اسٹارٹ ہو گیا۔"

"تمہاری ایسی تیسی!" روحی نے ہنستے ہوئے کہا اور لپک کر چھوٹی سی کتھئی جلد والی نوٹ بک اٹھا لی۔ بینا نے چکر مکر دیدے نچائے۔

"ورق الٹو نام پڑھو۔ ایسے موقع بار بار نہیں آتے۔ میں تو جانوں کہ تمہاری چاند سی شکل دیکھ کر وہ مردوا خود پھینک گیا۔ باؤلا ہو گیا تھا نگوڑا اتنے سے پانی سے ڈر کے بھاگا۔ اے نوج۔!"

"شکیل احمد نیر" روحی نے ڈائری میں لکھا نام پڑھ کر کہا "ارے بینا اس میں تو مار کے اشعار بھرے پڑے ہیں۔ بیاض معلوم ہوتی ہے۔

چلو توقع کے اشعار بھی مل گئے! نینا مسکرائی۔

"کچھ پاگل ہوئی ہو۔" روحی بولی: "اپنی طرح سب کو سمجھ رکھا ہے۔ جہاں اچھی صورت نظر آئی۔ اور لگیں آہیں بھرنے۔ تم اگر اللہ نہ کرے لڑکی نہ ہوتیں۔ مرد ہوتیں تو معلوم نہیں کہ کس آفت کی ہرجائی ہوتیں!"

"ہر اچھے چہرے میں مولیٰ کا جلوہ نظر آتا ہے۔" نینا نے آنکھیں بند کر کے عقیدت سے کہا: "خدا کی قدرت کا تماشہ دیکھتی ہوں۔"

"بڑی ولی اللہ ہو۔ احمق!۔ اب سر کوئی اپنی جگہ ہے کہ یہیں مرنے کا ارادہ ہے۔ پی بی گھنٹی بجے بیس منٹ ہو چکے ہیں۔" روحی چپکے سے گرجی "اس سہانے موسم میں کاہے کی کلاس۔ تم تو لیڈیز روم میں چلو۔ اور شعر سناؤ مجھے اس نگوڑی بیاض کے۔ جو تمہارا دادا لا گرا کے بھاگا ہے۔"

"مار بیٹھوں گی نینا۔ اگر پھر تمہارا دادا لا ہمارا دادا لا کہا ہے تو۔"

"لکھ کے رکھ لو۔ مرشد کی زبان کا نکلا پتھر کی لکیر وہ تمہارا دادا لا ہی ہے۔"

روحی نے ایک گھونسہ کس کے نینا کی پیٹھ پر جما دیا۔ وہ بے خبری میں اچھل کر کئی زینے اتر گئی۔ روحی ہنستی ہوئی اس کے پیچھے بھاگی!۔

نینا نے روحی کو بھی کلاس میں جانے نہ دیا۔ دونوں لیڈیز روم میں۔ ایک طرف بیٹھی بیاض سے شعر چن چن کے پڑھ رہی تھیں۔ انتخاب اتنا عمدہ تھا کہ روحی تو خیر متاثر ہو ہی رہی تھی۔ نینا بھی جھوم جھوم اٹھی ۔

میری اک عمر تجھ سے وابستہ
میں تجھے کیسے بھول سکتا ہوں

"کیا بات ہے قسم سے۔ شعر کہنے والے کا منہ چوم لوں۔" نینا بولی۔

"ہٹو۔" روحی غرائی: "زبان میں کم بخت کے کوئی رنگ ہی نہیں ہے۔

فرماتی ہیں منہ چوم لوں۔ ارے کچھ تو شرم کیا کرو نینا!۔
تم دوسرا اسا ذ جی۔ ٹخ ٹخ مت کرو۔!" نینا بھی غرائی۔" ٹیسٹ ادھورا رہ جائے گا!۔"

روحی نے مزے لے لے کے پڑھا سو

خالد! لب گویا ہے نہ گوش شنوا
بے نور ہوئی روشنیٔ شہر نوا
انبوہ خلائق میں ہے گم صم شاعر
دل خستہ جگر سوختہ تنہا تنہا

سچ سچ یہ تو کوئی نئی آواز ہے روحی"۔ نینا اب سنبھل کر بیٹھ گئی اور حیرت سے بولی:
ہمارے ہاں کے گھسے پٹے شاعروں کا لب ولہجہ تو ہی گھگھیایا ہوا ہے۔ یہ لحن یہ انداز بالکل منفرد اور دل کو چھو لینے والا ہے۔ اچھا تم اور پڑھو! قسم سے مجھے تو وجد آنے لگا!۔ ہیں اور بھی اچھے شعر؟ کیوں۔!"
مجھ پر وجد کا عالم طاری ہونے لگا! یوں بولتے ہیں:" روحی نے اصلاح کی۔ پھر جلدی سے شعر پڑھنے لگی۔

جنت کا ہوں خواہاں نہ جہنم سے ہراساں
کاہے کو پڑوں کشمکش سود و زیاں میں

"مزیدار۔! نینا نے آنکھیں نکالیں۔ چونکہ وہ زیادہ آہو چشم تھی۔ لہٰذا اس کی آنکھیں بھی زیادہ ہی نکل کر رہ گئیں۔
کتنی دیر تک دونوں گرد و پیش سے بے خبر اشعار پڑھتی۔ ان پر تبصرہ کرتی اور ہنستی رہیں۔ نینا کچھ بذلہ سنج اور لاابالی سی تھی۔ وہ زیادہ متاثر نہ ہوئی لیکن

روحی جو بہت جذباتی اور بے صبر تھی۔ وہ تو نہ صرف شعروں پر بلکہ انھیں انتخاب کرنے والے سے بھی سو فیصدی متاثر ہو گئی!۔

باہر بارش نے اب بھی اپنے جھنڈے گاڑ رکھے تھے۔ حالانکہ اب یونیورسٹی کا وقت ختم ہو چکا تھا مگر اب بھی یہ دنیا آباد تھی۔ لڑکے لڑکیاں بارش کا تماشہ دیکھنے کے لیے کوریڈور میں نکل آئے تھے۔ لیڈیز روم کے سامنے برآمدے میں نینا اور روحی بھی کھڑی تھیں۔ بڑا دلفریب منظر تھا۔ ہوسٹل کی عمارتیں۔ سربلند دیودار اور یوکلپٹس کے درخت گہری دھند میں کھو گئے تھے۔ یوں لگتا تھا زمین آسمان ایک لامتناہی بلند و متواج بحر بیکراں میں سما کر رہ گئے ہوں۔ روحی نے ایک متاثر کن سانس لی۔ اور بولی۔

"ایسے موسم میں تو بس مر رہیئے۔! ہائے۔ کیا سماں ہے نینا، تم ایسی کوری لٹھ نہ ہوتیں تم میں اگر مناظر قدرت سے محظوظ ہونے کی صلاحیت ہوتی تو تم سے باتیں کرنے میں کتنا لطف آتا۔ بھلا بتاؤ تو کہ یہ بارش یہ دھند یہ کہر یہ لطیف سی خنکی پھوار کو ادھر ادھر اڑانے والی شریر ہواؤں اور تند جھکڑوں میں رکوع و سجود کرتے درختوں کو دیکھ کر تمھارے دل میں کس قسم کے شاعرانہ جذبات پیدا ہو رہے ہیں!"

"کاہے کے موئے جذبات پیدا ہوتے: نینا نے برجستہ جواب دیا: بس پانی برس رہا ہے ہر موسم میں ایک آدھ بے تکی جھڑی سی لگ ہی جاتی ہے۔ مجھے تو غصہ آ رہا ہے۔ امی نے تاکید کر دی تھی کہ جلدی چلی آنا۔ وہ بھئی کچھ میری نندیں وندیں آنے والی تھیں۔ امی ان کی ضیافت کا معقول انتظام نہیں کر سکتیں۔!"

"سچ کہتی ہوں تم بالکل بھینس ہو" روحی جل گئی: اور یہ جم بیہودہ کتنی بڑی ہو۔ ابھی شادی کا نام نشان نہیں اور یہ نندیں دیور جیٹھ سب زبان پر رہنے لگے۔ پڑھتی کاہے کے لیے ہو۔ باوا کی رقم نالی میں جا رہی ہے۔ مزے میں شادی کر کے گھر بیٹھو

میاں کے بچے پالو۔"

اب تمہاری سی سوجھ بوجھ بادا کہاں سے لائیں" نینا نے ہنسی ضبط کر کے روحی کو اور چڑھا دیا۔" وہ کہتے ہیں کہ بس پڑھے جاؤ۔ اتنا نہیں سوچتے میری عمر نکل جائے گی تو کیا سفید سر پر نگوڑا سہرا بندھے گا۔ بادا کی عقل ماری گئی ہے" یک بیک وہ اُچھل پڑی اور ایک چٹکی روحی کے لے کے کان میں گنگنائی " وہ دیکھو۔ جھالردار شیروانی کے پیچھے۔ تمہارے شعروں والے۔ واہ۔ مولیٰ قربان تیری کاریگری کے۔ کیا چہرہ بنایا ہے۔ ہائے میں تو جانوں۔ یہی حضرت تھے۔ جو ہمارے کالج میں کھیلے ہوئے ڈرامے میں راجہ دشینت بنے تھے۔ کیا بہروپ تھا روحی کہ اگر سچ مچ راجہ دشینت دیکھ لیتا تو دانتوں تلے انگلی داب کے رہ جاتا۔"

" آہستہ بولو دیوانی۔" روحی بوکھلا گئی۔ اس نے ادھر دیکھا تھا اور اس کا دل دھڑک کے رہ گیا تھا۔ بے شک وہی لڑکا تھا۔ اب روحی نے غور سے اسے دیکھا سیاہ پتلون اور خوش رنگ آسمانی رنگ کے قمیص میں وہ واقعی بے حد خوبرو اور پرکشش لگ رہا تھا۔ چہرہ قدرت کی صناعی کا شاہکار تھا۔ شہابی رنگ، بلند ناک، لمبی لمبی پلکوں سے سجی ہوئی آنکھیں۔ بے شکن پیشانی، کسی کی بات پر وہ ہنسنے لگا تھا اور خوشنما دانت کچھ دیر کے لیے ضیا بار ہو گئے تھے!۔ سچ مچ کیا بے داغ حسن ہے۔" روحی مسحور ہو گئی۔ اسم بامسمیٰ ہے۔ نام سوچ سمجھ کے رکھا ہے رکھنے والوں نے۔!

اس کے دل میں دفعتہً بڑا چور آ بیٹھا تھا۔ وہ نینا کے پیچھے چھپ گئی۔ اور خود کو بظاہر بے پرواہ پوز کرنے لگی!۔

ابھی اسے یونیورسٹی آئے دن ہی کتنے ہوئے تھے۔ بڑی مشکل سے بزرگوں کی ہزار خوشامدوں کے بعد اسے مردانہ درس گاہ میں داخلے کی اجازت ملی تھی۔ اگر وہ ابھی

سے کسی ایک سے متاثر ہو جائے گی تو پھر اگلی تعلیم کسی اور ہی موضوع پر ہونے لگے گی
اس نے خود کو سمجھانے کی کوشش کی۔ اچھے چہروں سے یوں متاثر ہونا بڑی سطحی
ذہنیت کی بات ہے۔ لیکن وہ اس لڑکے کا خیال ذہن سے دل سے نہ نکال سکی۔

اس کا کنبہ ذرا محتاط تھا۔ وہاں عورتوں کی آزادی کے کوئی معنے ہی نہ تھے۔ اور
نہ دونوں کی مساوات کا کوئی سوال پیدا ہوتا تھا۔ کسی نے آج تک یہ مانا ہی نہ تھا
کہ مرد عورت برابر ہو سکتے ہیں۔ عورت کا بغاوت کر کے مرد کے برابر آنے کی ضد کرنا
ہی اس ثبوت پر دال تھا کہ وہ مرد کے برابر نہیں پیدا کی گئی۔ جب ان کی تخلیق ہی مختلف
انداز میں ہوئی ہے۔ ان کے آپس کے فرائض مختلف ہیں۔ ان کے جذبات، ان کی فطرت
میں بھی کوئی مماثلت نہیں ہے تو پھر مساوات کاہے کی؟ عورت گورنر بن جاتی ہے۔
[illegible] جاتی ہے سینکڑوں ماتحتوں کی سلامی لیتی ہے اونچی کرسی پر بیٹھ جاتی ہے لیکن کس طرح وہ
عورت کے بجائے کچھ اور نہیں بن جاتی۔ تخلیقی مرحلے سے اسی کو گزرنا پڑتا ہے۔ احقوق
اس کے تب بھی کم رہتے ہیں۔ ترکے سے برابر کا نہیں ملتا۔ ضعف اسی پہ زیادہ آتا ہے
وہ طاقت سے زیادہ بوجھ برداشت نہیں کر سکتی۔ اندھیرے اجالے اسی کو عزت آبرو
کا خطرہ لگا رہتا ہے۔ پکڑی جاتی ہے تو کمزوری کی چیخ اسی کے منہ سے نکلتی ہے۔ بے آبروئی
کی صورت میں خودکشی اسی کا مقدر ہوتی ہے۔ تو پھر کیا چیز ہے مساوات، برابری
آزادی۔ یہ ساری باتیں صرف وقت گزاری کا مشغلہ ہیں۔ عورت صرف عورت ہے۔
اپنے حدود کے اندر رہنے والی وہ مخلوق جو گھر سے بندھے فرائض کی انجام دہی کے لیے پیدا
کی گئی ہے۔ اس کا زیادہ اچھلنا کودنا نعرے بازی کرنا اور مساوات کی آواز بلند
کرنا مردوں کی برابری کرنا سب غلط، اگر دونوں برابر ہی ہوتے تو خدا نے مرد عورت
کا جھگڑا ہی نہ کھڑا کیا ہوتا۔ دونوں کو الگ جسم، الگ دل و دماغ، الگ جذبات
حسیات دے کر دنیا میں بھیجا ہے۔ مرد کو آزاد، عورت کو پابند بنا کر۔ مرد ہر

معاملہ میں آزاد ہے۔ عورت نیدی۔ مرد اپنے جذبات اور تمناؤں کا علی الاعلان اظہار کر سکتا ہے۔ عورت اپنے جذبات کو خود سے بھی چھپانا چاہتی ہے۔!

تو ایسے خاندان میں جہاں پابندیاں تھیں، کچھ حدیں تھیں۔ کچھ قدریں تھیں وہاں یہ ناممکن سا لگ رہا تھا کہ مردانہ درس گاہ میں قدم رکھتے ہی لڑکی محبت کا کھیل کھیلنے لگے۔ مگر محبت تو ایک قطعی غیر اختیاری چیز ہے اور دل بھی اپنے بس میں نہیں!۔

تو بے چاری روحی جو پہلی دفعہ ہمت کر کے پردے سے باہر نکلی تھی۔ پہلی ہی مرتبہ کسی مردانہ چہرے سے متاثر ہوئی تھی۔ خود پر قابو نہ رکھ سکی! وہ تو بری طرح زخمی ہوئی لیکن اس کی پہلی پہلی محبت میں بھی ایک وقار تھا۔ تمکنت تھی۔ رازداری تھی اور وہ خود کو مطمئن کرتی تھی کہ اس کی محبت ملوث بھی نہ تھی۔ بے داغ تھی! وہ دل ہی دل میں اس چہرے کی پرستش کرنے لگی!۔

اسے یونیورسٹی جاتے کتنے دن گزر گئے۔ وہ پھر شکیل کی دید کی متمنی تھی۔ روز اس کی ڈائری اپنی کتابوں میں یا پرس میں چھپا کر لے جاتی۔ شاید کہیں نظر آجائے اور جیسا کہ نینا نے کہا تھا۔ تقریب بہر ملاقات ہو جائے!۔ اس نے شکیل کی بیاض کا مطالعہ کیا تھا۔ اس میں ایک سے ایک عمدہ شعر درج تھے۔ جو روحی نے اپنی بیاض میں نقل کر لیے تھے!

نینا ہفتہ بھر سے غیر حاضر تھی۔ اور اکیلے روحی کا جی نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے ابھی تک کسی لڑکی کو اپنا دوست نہیں بنایا تھا۔ وہاں بہت سی طالبات تھیں لیکن سب الگ الگ مضامین کی۔ نینا ہی اس کی کلاس میٹ تھی! اب لیڈیز روم میں ایک طرف بیٹھ کر بیاض کے شعر پڑھ کر محظوظ ہونے کے سوا روحی کا کوئی دوسرا کام نہ تھا۔ یا پھر شکیل کی دید کی تمنا تھی جو پوری نہ ہو سکی تھی۔ اب روحی کو بھی صبر آچلا

تھا۔ نجانے وہ میڈیسن یا انجینئرنگ کا طالب علم تھا یا تو پھر یہاں پڑھتا ہی نہ تھا شاید اس روز اپنے دوستوں سے ملنے چلا آیا ہو۔ ورنہ یہیں کا طالب علم ہوتا تو دوسری دفعہ تو اسے کہیں نہ کہیں نظر آنا ہی تھا۔

اس روز بھی یہی صورت حال درپیش تھی۔ لسانیات کے پروفیسر چشتی صاحب تین چار دن سے نہیں آرہے تھے۔ وہ اکیلی بیٹھی کبھی دوسری لڑکیوں کی گفتگو سننے لگتی کبھی باہر چمکیلے آسمان میں تیرتی چڑیوں کو دیکھنے لگی اور حد سے زیادہ بور ہو رہی تھی!۔ اس کے کیمنار کے پیون نے اندر جھانکا۔

"صاحب آگئے ہیں۔ آپ کو بلا رہے ہیں!" اس نے روحی سے کہا۔ اور مڑ کر چلا گیا۔ روحی نے اطمینان کی سانس لی۔ اٹھی۔ کونے میں رکھی خوبصورت ڈریسنگ ٹیبل کے بڑے آئینے میں اپنے سراپا کا جائزہ لیا۔ بال درست کیے۔ ڈوپٹہ کا آنچل برابر کیا اور فائیل اور پرس سینے سے لگائے باہر نکلی!

ڈیپارٹمنٹ کے ہاف ڈور کے سامنے وہ ایک پل ٹھٹھکی تھی اندر سے بھاری آواز آئی۔

"آجائیے!"

زیر لب وہ منمنائی "جی۔!" اور دروازہ کھول کر اندر قدم رکھے۔ کچھ گھبرا رہی تھی۔

"آیئے روحی بی بی۔ بیٹھ جائیے۔!" چشتی صاحب نے بڑی شفقت سے کہا اسے دیکھ کر مسکرائے "تین دن سے میں آ نہیں سکا تھا۔ لیکچرز کا بڑا نقصان ہو گیا ہے۔ خیر۔ نیور مائینڈ۔ ابھی تو امتحان کے بہت دن پڑے ہیں بیک اپ کرا دوں گا۔ آپ ادھر سامنے کی کرسی پر بیٹھے!"

اس نے کرسی سرکائی اور اس لڑکے کو دیکھا جو دھاری دار قمیض میں ملبوس

تھا۔ کرسی کا ہینڈل روحی کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچا!۔ اور اس کا دل اچھل کر حلق میں آ پھنسا۔

خود کو ہینڈل کرنے میں وہ خاصی بیوقوف ہوئی جا رہی تھی!۔

غیر متوقع طور پر اپنے سے بالکل قریب اپنے سامنے شکیل کو دیکھ کر اس کے حواس باختہ ہو رہے تھے!۔ لیکن اس نے خود پر قابو رکھا اور کرسی سرکا کر ٹک گئی۔

"پچھلی دفعہ نوٹس میں نے کہاں ختم کیے تھے۔؟" چشتی صاحب نے پوچھا۔ پھر شکیل سے مخاطب ہو گئے!: "میں تو خیر دلی چلا گیا تھا۔ آ نہ سکا مگر تم نے انھیں نوٹس لکھا کیوں نہ دیے۔ کلاس فیلوز کو ایک دوسرے کی اتنی مدد تو کرنی ہی چاہیے۔ تمھیں تو میں لسانی مبادیات کی کتاب دے گیا تھا!"

"آپ تشریف نہیں لائے تھے جناب عالی اور کوئی بھی کلاس میں نہیں آیا۔ میں کسی کو کیسے نوٹس لکھاتا۔!" شکیل نے جواب دیا۔ اسی کی آواز بھی چہرے ہی کی مانند مسحور کن تھی!۔ جسے بار بار اور ہمیشہ سنتے رہنے کا دل چاہے۔

"یہ سب۔ کیا نام۔ انصاری، رحمان، بینا اور محسن۔ کیا کوئی بھی کلاس میں قدم نہیں رکھتا تھا؟" حیران ہو کر چشتی صاحب نے پوچھا۔

شکیل نے نظریں جھکا لیں۔

"خیر۔ آپ بھگتیں گے۔" انھوں نے کھنکھار کر کہا: "اچھا تو اب میں ڈکٹیٹ کراتا ہوں ذرا تیز قلم چلانا۔ بہت لکھنا ہے!۔

اب بھی کلاس میں شکیل اور روحی دو ہی تھے۔ چشتی صاحب کی آمد کی خبر دوسرے طلبا کو نہیں لگی تھی۔ حسب معمول دوسری تفریحوں میں مگن تھے۔

"لکھو!" انھوں نے کہا۔

پھر پارٹ ڈور کھلا اور چپراسی نے جھانکا!۔

"کیا ہے!" وہ کچھ جھلا گئے!۔

"کمیٹی روم میں چانسلر صاحب بلا رہے ہیں صاحب!"

"ارے ہاں" وہ یکبارگی اٹھ کھڑے ہوئے۔ کف سرکا کر گھڑی دیکھی "میں تو بھول ہی گیا تھا۔ ساڑھے گیارہ بجے کمیٹی روم میں اہم اجلاس ہے۔ مطلب یہ کہ آج کا بھی ناغہ۔ مگر کیوں ناغہ۔ شکیل؟۔

"جناب!"

"کتاب میں جہاں جہاں نشان لگے ہیں وہ روحی کو لکھا دینا" انھوں نے میز پر سے اپنی عینک اور رومال اٹھا کر جاتے ہوئے کہا "بہت اہم موضوع ہے وہ سمجھے؟"

"جی!"

وہ چلے گئے۔ چند لمحے ڈیپارٹمنٹ میں خاموشی چھائی رہی۔ روحی مضطرب تھی اور شکیل بھی پَر تولنے کے لیے بے قرار تھا۔ پھر اس نے چپکے سے کھانس کر کہا۔

"میں آپ کو یہ کتاب دیے دیتا ہوں۔ اس میں جہاں جہاں پروفیسر صاحب نے نشان لگا دیے ہیں۔ وہ لکھ لیجئے۔ اور براہ کرم کل کتاب لیتی آیئے گا! مجھے یہ واپس کرنی ہے"

"لکھا دیجئے۔!" روحی دل کی اچھل پھاند کو قابو میں کرکے بولی۔

"نہیں نہیں۔ میں لکھا نہیں سکتا۔ اس طرح بہت وقت صرف ہو جائے گا۔ میں کتاب چھوڑے جاتا ہوں۔ آپ لکھ لیجئے گا۔!" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اپنی کتابوں میں سے ایک کتاب نکال کر میز پر رکھ دی۔!

روحی نے اسے اٹھا لیا "بہت سا لکھنا پڑے گا۔ مجھے پتہ ہی نہ تھا کہ یہ آپ کے پاس ہے اور آپ بھی میرے کلاس فیلو ہیں۔ ورنہ میں آپ سے لے لیتی

آپ پھر دکھائی ہی نہیں دیے" بے ساختہ اس کے منھ سے نکل گیا۔ اور وہ یکبارگی سرخ ہو گئی۔

"مجھے معلوم تھا کہ چشتی صاحب دہلی گئے ہوئے ہیں" تسکین نے کہا "میں آ کے کیا کرتا" شاید آپ کو بھی پتہ نہیں تھا کہ میں بھی آپ کی کلاس فیلو۔۔!"

جی ہاں مجھے معلوم تھا" وہ خفیف سا مسکرایا "اور پھر بے ضابطہ طور پر بھی آپ سے ملاقات ہوئی تھی!"

روحی بھی مسکرائی "اس روز غلطی میری تھی۔ جلدی جلدی زینے اتر رہی تھی میں" اس کا مطلب تھا کہ اسے باتوں میں الجھا رکھے۔ اور وہ الجھ بھی رہا تھا۔ ابکی وہ ہنس پڑا "ہم لوگ بھی چھوٹے بچوں کی طرح بارش سے ڈر کے بھاگ رہے تھے۔ ٹھیک ہی تو کہا تھا آپ کی ساتھی نے۔ پانی سے ایسا ڈر بھی کیا۔ جیسے گولیاں چل رہی ہوں۔ وہ پھر نظر نہیں آئیں۔

"جی ہاں وہ اپنی امی کے ساتھ بنگلور چلی گئی ہے۔ آج کل میں آجائے گی۔"

روحی نے کہا پھر بولی۔ آپ کھڑے ہیں۔ بیٹھ جایئے؟"

"آپ ڈسٹرب ہوں گی!"

"کاہے سے!"

"آپ کو لکھنا ہے نا!"

"کتاب لیے جا رہی ہوں۔ گھر جا کے لکھوں گی"

"اچھا اچھا"

"کیا آپ نے کتاب سے دیکھ کے نوٹس بنا لیے ہیں؟"

"جی ہاں۔!" وہ دروازے کے پاس پڑی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"تو پھر آپ چاہیں تو مجھے دردِ سری سے بچا سکتے ہیں!" روحی بولی۔ وہ تو اس

سے مل بیٹھنے اس سے باتیں کرنے اور اسے دیکھنے سے خوشی کے مارے پھولے نہ سما رہی تھی۔

آپ کا مطلب یہ ہے کہ میں ڈپلیکیٹ کرا دوں! یہ شکیل نے پوچھا۔

"آپ اپنے نوٹس مجھے دے دیجئے۔ ایک دو روز میں واپس کر دوں گی۔ اب نشان زدہ عبارت کو پھیلا کے لکھنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔" روحی ہنسنے لگی۔

شکیل نے کچھ کہے بغیر ایک دبیز فائل اس کی طرف بڑھا دیا۔ اور بولا۔ "اطمینان سے لکھ کے واپس کیجئے گا۔ مجھے اس کی جلدی نہیں ہے!"

"بہت بہت شکریہ شکیل صاحب!" روحی پھر بے اختیار بول پڑی۔

"اس میں شکریہ ادا کرنے کی کون سی بات ہے؟" شکیل اس کی زبان سے اپنا نام سن کر مسکرایا۔ "ہم ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔ ہمیں دو سال تک مزید ساتھ رہنا ہے۔ ایک دوسرے کی مدد کرنے کی اسپرٹ تو ہم میں ہونی ہی چاہیئے!"

"آپ کو راحت صاحب اور کمال صاحب کے ساتھ دیکھ کر میں سمجھی تھی کہ آپ بھی اسکالر ہیں۔ آپ کو اپنا ساتھی دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے!" روحی کو گفتگو کا سرا مل گیا۔

"ہاں وہ پچھلے ہفتے فائن آرٹس اکیڈمی میں ایک ادبی مقابلہ ہوا تھا۔ اس سلسلے میں وہ لوگ زبردستی مجھے پکڑ لے گئے تھے۔ ایک مقابلہ بیت بازی کا بھی تھا۔ مگر تقدیر دیکھئے کہ میری وہ بیاض جس میں منتخب اشعار تھے۔ کہیں کھو گئی۔!"

"تو پھر مقابلہ میں آپ نے حصہ نہیں لیا؟"

"لیا تو تھا۔ لیکن جیسا کہ میرا خیال تھا۔ اولیت مجھے حاصل ہوگی غلط نکلا وہ بہت اچھا انتخاب تھا جو ضائع ہو گیا!"

اب وہ دونوں یوں گفتگو کر رہے تھے جیسے برسوں کے شناسا ہوں۔ شکیل کی بات چیت اور بے تکلفی میں بھی ایک حجاب اور رکھ رکھاؤ تھا۔ لیکن عجیب سے دلی... محسوسات نے روحی کو از خود رفتہ کر رکھا تھا۔ وہ اس سے زیادہ سے زیادہ متاثر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی صورت اور سیرت سے اس کی گرویدگی بڑھتی ہی گئی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے یہ کوئی اجنبی نہیں تھا۔ وہ برسہا برس سے اسے جانتی آ رہی تھی۔ وہ کوئی غیر بھی نہ تھا۔ وہ اتنا اپنا تھا کہ دل کھول کر اس کے سامنے رکھا جا سکتا تھا! اپنی اس کیفیت کو وہ کوئی نام نہ دے سکی۔ یہ محبت نہیں تھی۔ محبت تو پھر عواقب سے تھوڑی بہت باخبر ہوتی ہے مگر یہ جذبہ جو برتر از اندیشۂ سود و زیاں تھا۔ کیا تھا۔ محبت سے بھی ارفع و اعلیٰ کوئی جذبہ جس میں جانثاری کی شان بھی تھی اور والہانہ سپردگی کا انداز بھی۔!

شکیل کی بات سن کر وہ مسکرانے لگی اور اس طرح جیسے کہ وہ اس کا پرانا دوست ہو۔ بولی۔

"کوئی انعام دیجئے گا اگر وہ بیاض آپ کو واپس مل جائے۔!"

"تو کیا۔؟" اس نے چونک کر اسے دیکھا۔ روحی نے محسوس کیا اس کے چہرے میں سب سے زیادہ پرکشش چیز اس کی آنکھیں ہی تھیں گھنی کشیدہ بھنوؤں کے نیچے گہری سیاہ آنکھیں، لمبی اور خمدار پلکوں سے آراستہ خوشنما آنکھیں۔ پل بھر کے لیے دونوں کی نگاہیں ملیں۔ پھر روحی گڑبڑا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ لیکن شکیل کی نظریں دیر تک اس کے گلابی شرمیلے چہرے پر جمی رہی تھیں!

خاموشی سے گھبرا کر روحی بول پڑی۔

"آپ۔ آپ کی۔ بب بیاض۔ مجھے مل گئی تھی۔ شاید آپ کے ہاتھ سے

نکل کے زینے سے نیچے جا پڑی ہوگی۔ آپ نے دیکھا نہیں ہوگا۔ میں جب نیچے اُتری تو میں نے اسے پڑے دیکھا اور اٹھالیا۔ آپ اس عرصے میں اگر ملتے تو وہ میں آپ کو واپس کر دیتی!" اول جلول سے فقرے کہہ کر وہ یوں لمبی لمبی سانسیں لینے لگی جیسے سخت مشقت کر کے بیٹھی ہو۔

شکیل اس کی کیفیت بھانپ گیا تھا۔ اس عرصے میں جب اس نے روحی کو دیکھا نہ تھا۔ سارا وقت اسی کے بارے میں سوچتے ہوئے گزارا تھا۔ لیکن اس کے جذبات گہرے اور سنجیدہ تھے۔ اپنے تاثر کو وہ جلدی سے ظاہر نہیں کرتا تھا اپنے دلی محسوسات کو چھپانے میں اسے مہارت تھی! ۔ وہ روحی سے متاثر تھا۔ مگر جتنی جلدی روحی نے خود کو ظاہر کر دیا تھا۔ اس نے نہیں کیا۔ بڑے سرسری انداز میں اس نے پوچھا۔

"مجھے تو بیاض کے کھونے کا بہت افسوس تھا۔ اب اطمینان ہو گیا۔ ہاں۔ اشعار آپ نے پڑھے؟ کیسے لگے؟"

"میں بھی اچھے اشعار کا انتخاب کرتی ہوں۔ مگر سچ مانیے کہ آپ کا انتخاب اپنی مثال آپ تھا۔ اتنے عمدہ ایسے بہترین اور سحر انگیز اشعار میں نے آج تک نہیں پڑھے تھے۔ مجھے بے حد پسند آئے۔ آپ کی اجازت کے بغیر وہ سب میں نے اپنی بیاض میں لکھ لیے ہیں!۔

"اس کی کیا ضرورت تھی!"

"کیوں۔ وہ تو آپ کو واپس کرنا ہے"

نہیں نہیں" شکیل نے بڑی مسحور کن آواز میں کہا" اس کے واپس کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے" پھر وہ ہنسنے لگا!۔

آپ نے پوچھا تھا کہ بیاض مل جائے گی تو میں کیا انعام دوں گا۔ اب اس

بیانس کو آپ میرا انعام سمجھیے!۔ اچھا!۔ اب میں چلتا ہوں۔ انشاء اللہ کل ملیں گے: خدا حافظ۔!" اس نے کتاب پیشانی تک لے جا کے روحی کو الوداعی سلام کیا اور دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔

روحی دم بخود کسی من چاہے خواب کے حصار میں گم صم بیٹھی رہی۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں مگر وہ بیداری کا سپنا دیکھ رہی تھی!۔ شکیل کا متبسم چہرہ، اس کی بولتی ہوئی آنکھیں، اس کے خوبصورت ہونٹ۔ وہ دیدہ زیب سڈول جسم، سحر انگیز آواز۔ اس کی من موہ لینے والی باتیں۔

اللہ۔ روحی نے گہری سانس لی۔ انسان کے روپ میں غلمان۔ وہ اس کا نائیل الٹتی پلٹتی رہی۔ اور پاگل سی جذباتی لڑکی یہ سوچ سوچ کر خوش ہوتی رہی کہ جس جگہ سے وہ اوراق الٹ رہی ہے۔ اسی جگہ یہاں وہاں شکیل کے ہاتھ بھی لگے ہوں گے۔

وقت کافی گزر چکا تھا اور آہستہ آہستہ یونیورسٹی خالی ہوتی جا رہی تھی۔ اسے احساس ہی نہ تھا۔ حتیٰ کہ چپراسی کو کہنا پڑا۔ اس کی گاڑی آگئی ہے!۔

سعید صاحب کا اصول تھا کہ وہ اپنے بچوں کی تعلیم میں دلچسپی لیتے تھے۔ ان کے ساتھ مل بیٹھتے اور اکثر ان کے ہوم ورک میں ان کی مدد کرتے تھے۔ اگر وہ اپنی مصروفیت کی بنا پر وقت نہ دے سکتے تو بیگم سعید بچوں کو لے کر بیٹھ جاتیں اب تو بہت دنوں سے عبید یہاں نہ تھا۔ لہٰذا ماں باپ کی مکمل توجہ اور محبت کا مرکز روحی رہ گئی وہ بچپن ہی سے ذہین تھی اور بڑی جلدی جلدی کسی کلاس میں فیل ہوئے بغیر

تعلیمی مدارج طے کر رہی تھی۔ لہٰذا وہ جب کم عمری میں گریجویٹ ہوگئی تو سید صاحب نے سوچا اسے آگے پڑھوایا جائے۔ حالانکہ آمنہ بیگم اس کے سراسر خلاف تھیں۔ انھوں نے بھی اپنے زمانے میں یونیورسٹی سے آنرز کیا تھا اور مخلوط تعلیم کے نقصان و مضرات سے بخوبی واقف تھیں۔ ان کا زمانہ اتنا ترقی پسند نہ تھا۔ ان پر پابندیاں تھیں۔ ان کے ساتھیوں نے بھی حد سے باہر قدم نہ نکالے تھے۔ لیکن انسانی فطرت تب بھی نقاب پوش ہوکر اپنا رنگ دکھاتی تھی۔ انسانی نیچر فرشتگانہ نہیں ہوسکتی چنانچہ انھیں اب بھی یاد تھا کہ کس طرح لڑکے لڑکیوں نے ایک دوسرے کا دائمی ساتھ تلاش کر لیا تھا اور سارے ضابطے، معاشرے کی انگشت نمائی، شماتت ہمسایہ اور بزرگوں کا ادب لحاظ بالائے طاق رکھ کر من پسند شادیاں کر لی تھیں۔ انھوں نے اس چیز کو ہمیشہ نفرت کی نظر سے دیکھا تھا۔ وہ بزرگوں کی پسند کو ترجیح دیتی تھیں۔ اور اس سلسلے میں قطعی ترقی پسند نہ تھیں! ان کا منشا نہ تھا کہ روحی یونیورسٹی جائے۔ انھوں نے حتی الامکان مخالفت بھی کی تھی۔ مگر روحی کی گریہ وزاری اور سید صاحب کی ضد کے آگے ان کی ایک نہ چلی۔ روحی پردے کی دنیا سے نکل کر ایک کھلی ہوئی روشن اور آزاد فضا میں پہونچ گئی۔ اسے جدت پسند ساتھی ملے۔ عجیب سا ماحول ملا۔ جنس مخالف کا سامنا ہوا۔ اور اس نے رفتہ رفتہ محسوس کیا کہ ابھی تک وہ آہنی خول میں بند گھٹی گھٹی سانسیں لے رہی تھی۔ زندگی اور صحیح معنوں میں جینے کا شعور تو اسے اب ملا تھا۔ وہ پہلے ہی سے ذہین اور آزادی پسند تھی۔ اب تو بسیط فضا اور میں اڑانیں بھرنے کے لیے اسے پر مل گئے۔ ساتھ نصیب ہوا تھا نینا بی کا۔ خالص مذہبی نام تھا رابعہ فاطمہ۔ گھر میں کبھی رابی کبھی فاطمہ ہی پکاری جاتی تھی۔ مگر انھیں شوق اٹھا تھا افسانہ نویسی کا۔ لہٰذا قلمی نام نینا اختیار فرما لیا تھا۔ افسانہ نگاری کا حشر تو یہ ہوا کہ تین چار بے سر پیر کے افسانے لکھے اور مختلف رسائل میں بھیجے بھی تھے۔ مگر وہ سب

کے سب ایڈیٹر صاحب کے شکریے کے ساتھ واپس موصول ہو گئے تو یہ شوق ٹھنڈا پڑ گیا لیکن نقلی نام اصلی نام کے ساتھ تابع جمل کی طرح اٹکا رہا۔ اب وہ اسی نام کو پسند بھی کرتی تھی۔ لڑکی کیا تھی آفت کی پرکالہ تھی۔ نچلا بیٹھنا اس نے سیکھا نہ تھا۔ کسی سے دب کر رہنا جانتی نہ تھی۔ صاف کھری منہ پھٹ ادب سے صرف تیز طرار۔ پچھلے دو سال سے روحی کی دوست تھی۔ پڑھنے میں بھی سب سے آگے۔ چنانچہ جب فرسٹ ڈویژن میں بی اے کیا تو اس کے مزاج ہی ملنے بند ہو گئے۔ کالج کی ساری سیدھی سادی لڑکیاں اس سے گھبراتی اور پناہ مانگتی تھیں مگر روحی کو وہ بہت پسند تھی کیونکہ اپنی ساری تیزی کے باوجود وہ مخلص، بے لوث اور پُر محبت بھی اتنی ہی تھی۔ اس کی دو سال کی رفاقت نے روحی کو بھی بے باک، صاف گو اور نڈر بنا دیا تھا۔ اور یونیورسٹی کی فضا تو تیزی طراری اور ذہانت کی متقاضی بھی تھی۔ یہاں سیدھے سادے لوگ زیادہ پنپ نہ سکتے تھے۔ اونچے درجے کے طلبا انھیں چٹکیوں میں اُڑا دیتے!

تو اس فضا میں سانس لیتے روحی میں بھی بیباکی، دلیری اور آزادی کے جراثیم حلول کر ہی گئے۔ گھر میں وہ ہمیشہ کی طرح سیدھا سادا انداز اختیار کیے رہتی تھی۔ ماں کے ساتھ کچن میں ہاتھ بٹاتی۔ نماز اس سے ایک بھی نہ چھوٹتی تھی۔ ماں باپ کی خدمت پر بھی وہ کمربستہ رہتی۔ گھر بلو روش اس سے کسی طرح نہ بدلی لیکن اس کی اندرونی فطرت میں کتنا بڑا انقلاب آ گیا تھا۔ اس کی خبر بہت دنوں تک کسی کو نہ ہو سکی!۔

سعید صاحب اس سے غافل نہ تھے۔ یونیورسٹی میں داخلے کے کچھ دنوں بعد انھوں نے اس سے پوچھا تھا۔

رات کے کھانے کے بعد کافی کا دور چل رہا تھا۔ بڑا مسرور ماحول اور خوشگوار فضا تھی۔ باہر ہلکی ہلکی پھوار جلترنگ سا بجا رہی تھی کبھی کبھار بجلی چمکتی اور

دریچے کے رنگین شیشوں پر قوس و قزح سی بکھر جاتی! ۔ اور پھر بادل غصّے سے
گرج اٹھتا۔ کبھی ہوا کے فراٹے پانی کو اپنے ساتھ لے اڑتے۔ اور درختوں میں
تالیاں سی بجنے لگتیں۔

آمنہ بیگم نے کافی کی پیالی ٹرے میں رکھ کر نقشین پاندان اٹھا لیا۔ سعید
صاحب نے کھانس کر گلا صاف کیا اور روحی کی طرف دیکھا جو صوفے کے ہتھے
سے لگی بیٹھی ایک ننھی سی کتاب پڑھنے میں بری طرح مشغول تھی۔!

"ہاں بیٹی تم نے کچھ بتایا نہیں" سعید صاحب نے پوچھا: "وہ نیا ماحول تمہیں
کیسا لگا۔ میں بھی تم سے پوچھنا بھول گیا تھا۔ کچھ بتاؤ تو تمہارے نئے پروفیسر صاحب
کیسے ہیں۔ کتنے لڑکے لڑکیاں تمہارے ساتھ ہیں۔ اور یہ سب ہیں کیسے؟ پڑھائی
کیسی چل رہی ہے۔" روحی نے کتاب بند کر کے اپنے پہلو میں دبا لی اور چہکتی ہوئی سی
آواز میں بولی: "سب کچھ بہت اچھا ہے ڈیڈی۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے میں
کسی قفس کا دروازہ کھول کر بہت بڑی چمکیلی دنیا میں پہونچ گئی ہوں۔ ڈیڈی!
وہ یونیورسٹی ہے کہ ایک نئی رنگین دنیا۔ وہاں کا ماحول بے حد علمی ہے۔ میرے
پروفیسر صاحبان بھی بہت شفیق مہربان اور خوش مزاج ہیں۔!"

"اچھا" سعید صاحب نے ہنس کر کہا: "خدانخواستہ کوئی غصہ ور اور سخت گیر
تو نہیں ہے۔ سب تم سے کیسا سلوک کرتے ہیں؟"

"نہیں ڈیڈی سب پروفیسر لیکچرر سب کے سب! بہت ہنس مکھ اور خوش اخلاق
ہیں" وہ جوش و خروش سے بولی: "یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ ہمارے استاد ہیں
بس طالب علموں میں دوستوں کی طرح گھلے ملے فری رہتے ہیں۔!"

"کیا خاک رعب داب طالب علموں پر باقی رہتا ہوگا!" آمنہ بیگم نے تیوریاں
چڑھا کر نکتہ چینی کی: "استاد آخر استاد ہوتے ہیں۔ انھیں تو لیے دیے رہنا

چاہیئے۔! اسی لیے تو طالب علم ان کی قدر و قیمت نہیں جانتے۔ ان کی عزت نہیں کرتے۔ حد ہے کہ استاد اگر شاگرد کا کہا نہ مانے تو شاگرد اسے پیٹ کے رکھ دیتے ہیں یہ مرتبہ ہے استاد کا جسے اسلام نے دوسرے باپ کا درجہ دیا ہے!"

"نہیں ممی۔ وہ بے ہودگی تو سر پھرے بدمعاش طالب علم کرتے ہیں۔ جو شریف سنجیدہ اور مہذب طالب علم ہیں وہ سچ مچ باپ ہی کی طرح استادوں کا ادب کرتے اور انھیں مانتے ہیں!" روحی نے جواب دیا: "اب جیسے کہ ہمارے ایم اے پریویس کی کلاس میں" وہ رک گئی۔

"ہاں۔ تمھاری کلاس میں" سعید صاحب نے پوچھا "تم اپنے ساتھیوں کے بارے میں بتاؤ۔ استادوں کا ذکر رہنے دو۔ ان میں سے تین چار کو میں جانتا بھی ہوں۔ تمھارے ساتھی تو سب شریف اور سنجیدہ ہیں نا؟"

"جی ڈیڈی۔ میرے ساتھی" روحی کی آواز لڑکھڑا سی گئی: "ایک تو یہ اپنی نینا ہی ہے۔ دوسرے ــــ!"

"کون۔ نینا" سعید صاحب نے کہا "تم ڈاکٹر کرمانی صاحب کی بچی رابعہ کو تو نہیں کہتیں؟"

"جی ہاں وہی ہے" روحی نے بتایا: "اور باقی سب لڑکے ہیں۔!" اس نے چور نظروں سے آمنہ بیگم کو دیکھا۔

"لڑکے۔؟" حسب توقع وہ چونک کر بولیں "لڑکوں کو تو ہونا ہی ہے۔ کتنے ہیں؟"

"کل چار ہیں۔ ممی۔!" وہ بولی۔

"خاصے بڑے ہوں گے تم سے!"

"جی ممی۔ مجھ سے تو یقیناً بڑے ہوں گے!"

مگر ایسے تو نہیں ہیں کہ تم دو لڑکیوں کو کلاس میں دیکھ کر چار دن کچھ آوازے کستے یا فقرے بازی کرتے ہوں ۔!" سعید صاحب نے کہا۔

"نہیں ڈیڈی ۔ بالکل نہیں ۔" روحی نے کہا: "بلکہ وہ ہمیں اپنے ساتھ دیکھ کر ہمارا بڑا خیال رکھتے ہیں ۔ ہم سے بات تک نہیں کرتے ۔ ہماری طرف دیکھتے بھی نہیں چپ چاپ کلاس میں بیٹھے رہتے ہیں ۔ اور جیسے ہی گھنٹی بجتی ہے ۔ اٹھ کر باہر چلے جاتے ہیں ۔ کلاس میں آتے بھی دیر سے ہیں ! سب کے سب بے حد شریف ہیں ڈیڈی کیا رحمان اور انصاری اور محسن ۔ سب ہمیں چھوٹی بہنوں کی طرح ٹریٹ کرتے ہیں ۔ اور ایک لڑکا اور ہے ڈیڈی ۔ شکیل احمد ۔ وہ تو بہت ہی اچھے ہیں ۔ وہ تو سب سے بازی لے گئے ۔ انھوں نے آنرز میں ٹاپ کیا تھا ۔ میرٹ ہولڈر ہیں ۔ ان کا ذہن اتنا اچھا ہے ڈیڈی کہ وہ صرف لیکچر سنتے ہیں اور بعد کو حافظے کی مدد سے لکھ لیتے ہیں ۔ انھیں شارٹ ہینڈ میں بھی مہارت حاصل ہے ۔ ایک دفعہ میں نے دیکھا کہ پروفیسر کے لیکچر کے دوران کاپی میں لکیریں اور کچھ ترچھی بینڈی شکلیں بنا رہے تھے ۔ بعد کو میں نے پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ لیکچر شارٹ ہینڈ میں لکھ رہے تھے ۔ بعد کو انھوں نے اسے انگریزی میں لکھ لیا تھا ۔! میں تو حیران رہ گئی ۔

معقول لڑکا معلوم ہوتا ہے ۔ سعید صاحب نے رائے دی ۔

"معقول تو وہ بہت ہیں ڈیڈی ۔!" روحی نے مزید کہا: "سب لوگ ان کی بہت تعریف کرتے ہیں ۔ وہ میگزین کے ایڈیٹر ہیں ۔ یونیورسٹی یونین کے وائس پریزیڈنٹ بھی ہیں ۔ جتنی ادبی اور شعری محفلیں ہوتی ہیں ۔ سب میں ان کی شرکت لازمی ہے ان کا ادبی ذوق بہت بلند ہے اور ان کا شاعری کا انتخاب بھی بہت اعلیٰ پایہ کا ہے مگر ڈیڈی ۔ آپ کو یہ سن کر حیرانی ہوگی کہ اتنی بہت ساری خوبیوں کے باوجود ان میں ذرہ برابر غرور و تکبر نہیں ہے ۔ اتنے منکسر المزاج اور سادگی پسند ہیں کہ کچھ پوچھ

ان کی تعریف نہیں کی جا سکتی!"

آمنہ بیگم نے شک و شبہ سے بھرے ہوئے لہجے میں پوچھا: "تم سے ان سے شعر شاعری ہوا کرتی ہوگی۔ دیکھو بیٹی۔ یہ اچھی بات نہیں! شعر ہی کون سے حمد و نعت کے ہوتے ہوں گے۔ وہی نامراد عشق عاشقی سے بھرے ہوئے، بے ہودہ گھٹیا ناقابل برداشت شعر ہوتے ہیں۔ شریف لڑکیوں کے لیے ان کا سننا بھی معیوب بات ہے۔"

روحی نے بیاض ٹٹولی اور سوچا کہ انھیں تین چار اشعار سنا دے۔ مگر اسے اندیشہ تھا کہ اس کا یہ قیمتی سرمایہ کسی کا گرانقدر انعام جو اس کے لیے نوبل پرائز سے بھی کہیں بڑھ کر تھا۔ کہیں بحق بزرگی ضبط نہ ہو جائے! خطرے کی بو اس نے محسوس کرلی تھی اور اپنی حماقت بھی۔ بھلا شکیل کی خوبیوں کو اس جوش و خروش سے گنوانے کی اسے ضرورت بھی کیا تھی۔ چنانچہ اس نے بے پروائی سے ہنس کر کہا۔

"یہ تو ہمارا نصاب ہی ہے ممی۔ اس میں معیوب بات کیا ہے۔ بی۔ اے میں تو ہم نے مثنوی سحرالبیان اور گلزار نسیم تک پڑھی تھی۔ فارسی نصاب میں گلستان بوستان بھی تھی۔ کیا یہ ساری کتابیں حمد و نعت اور میلاد کی ہے۔ آپ نے بھی ان کا مطالعہ کیا ہی ہوگا۔ کیا ان ساری کتابوں میں یہی گھٹیا کوالٹی کے جذبات بیان نہیں کیے گئے ہیں۔ ان کا پڑھنا لڑکے لڑکیوں کے لیے یکساں نقصان دہ ہے۔ مگر اب یہ نصاب بنانے والی کمیٹی سے فریاد کرنے کی بات ہے کہ ان چیزوں کو وہ طالب علم کے لیے ضروری کیوں سمجھتی ہے۔ آئندہ زندگی گزارنے کے لیے ان سے کیا مدد مل سکتی ہے۔ سچ ممی۔ ان مثنویوں میں بعض اشعار ایسے بھی ہیں کہ وہ ہمارے پروفیسر یا لیڈی لیکچرر بھی نہیں پڑھاتے۔ انھیں بھلانگ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔"

"ہے تو واقعی سوچنے کی بات" سعید صاحب نے تائید کی۔ "یہ چیزیں آئندہ زندگی میں مفید نہیں ثابت ہو سکتیں۔ اب اگر مقصد یہ ہوتا ہے کہ طلبا کلاسیکس سے بھی واقف ہو جائیں تو وہ اپنے مطالعہ کے دوران اپنے قدیم سرمایۂ ادب سے واقف ہو ہی جاتے ہیں!"

"مگر تمہارا نصاب تو انگریزی میں ہے!" آمنہ بیگم نے جرح کی۔

"ممی انگریز شاعر ادیب ڈرامہ نگار سب کے سب فرشتے تھے کیا؟" روحی نے جواب دیا۔

"بس آج کل کی لڑکیوں کو تو یکبارگی ان پڑھ ہی رکھا جائے۔" جل کر آمنہ بیگم نے کہا۔

"ہاں ممی کسی مرض کو ختم کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ مریض ہی کو ختم کر دیا جائے۔" روحی ہنسی

"بند کرو یہ بحث!" سعید صاحب جھلا گئے "اور سنو۔ آج دوپہر مجھے کمشنر صاحب کا کارڈ ملا ہے۔ ان کے بچے کی تیسری سالگرہ ہے۔ کل شام ہمیں ان کے ہاں چلنا ہے۔ یاد رکھنا اور مجھے بھی یاد دلا دینا۔ ایسا نہ ہو کہ ہم سب بھول جائیں!"

"اوہ! ڈیڈی ان کے ہاں تو بہت ہجوم اکٹھا ہو جاتا ہے" روحی نے ناک سکوڑ لی "اور پھر آپ کے یہ دوست سالگرہ وغیرہ جیسی تقریبوں پر آرکسٹرا بھی ارینج کر لیتے ہیں۔ انہیں وحشت نہیں ہوتی؟"

"ہر کوئی ہماری طرح زندگی سے دور بھاگنے والا قنوطی نہیں ہوتا بیٹی" سعید صاحب نے ہنس کر کہا "انسان کی دلچسپی، غموں سے فراریت۔ اور مل بیٹھنے دل بہلانے کے یہی کچھ تو بہانے ہوتے ہیں۔ روزمرہ زندگی کو خوشیاں کہاں نصیب ہوتی

ہیں۔ ہر ایک اپنے مقصد اور جدوجہد کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ مگر مجھے تعجب ہے کہ تم ایسے جلسوں اور کھیل کود کی تقریبوں کو پسند نہیں کرتیں۔ لڑکیوں کو تو گانے بجانے سے بڑی دلچسپی ہوتی ہے۔"

مجھے اتنی زیادہ نہیں ہے ڈیڈی۔" روحی بولی۔

"بہر حال وہاں چلنا بہت ضروری ہے۔ ان سے میرے روابط بہت اہم ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ انھیں ہم سے شکایت ہو!"

"ضرور چلیں گے ڈیڈی۔!" روحی یہ کہہ کر جب چلی گئی تب سعید صاحب نے کہا۔ "اس کے مزاج میں عجیب سا تغیر ہو رہا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟"

"میں نے تو نہیں محسوس کیا۔" تعجب ہے آمنہ بیگم نے کہا۔

"ہے! میں نے محسوس کیا ہے۔" سعید صاحب نے پر تکلف لہجے میں کہا۔ "پہلے وہ مجھ سے زیادہ گفتگو کرنے میں حجاب برتتی تھی۔ میرے سامنے ہی نہیں نکلتی تھی۔ اپنے خیالات کا اظہار یوں کبھی نہ کرتی تھی۔ مگر اب۔ خیر شاید۔ یہ یونیورسٹی کے ماحول کی تاثیر ہو۔!"

"آپ نے میرا کہا مانا نہیں ہے۔ میں کہتی ہوں اب بھی سویرا ہے۔ اسے مردانہ درسگاہ سے اٹھا لیجئے اور بڑے بھائی جان کے دیے ہوئے پیغام پر غور کیجیے۔ آخر آپ کو ناصر کیوں نہیں پسند ہے۔ ابھی اسی سال ایم۔ کام کر کے ایل ایل بی کر رہا ہے۔ اور بھائی جان کہہ رہے تھے کہ جونیر کالج میں لیکچر رکھی ہے۔ کیا آپ کو یقین نہیں ہے کہ وہ اپنی بچی کو خوش رکھ سکے گا!"

"میں نے یہ تو نہیں کہا۔" سعید صاحب نے جواب دیا۔ "ناصر مجھے بھی پسند ہے مگر سوال تو یہ ہے کہ تمھاری بھاوج محترمہ نے پیغام نہیں دیا۔ اب کیا ہم اپنے منہ سے کہیں گے کہ ہماری بچی کو ازراہ بندہ پروری و خدا ترسی قبول

فرمالیں :

"توبہ ۔ بات کا بتنگڑ بناتے ہیں آپ " آمنہ بیگم ہنسنے لگیں : "مجھے آپ کی مرضی کب معلوم تھی ۔ اس لیے میں نے یہ سلسلہ ہی نہیں چھیڑا ۔ اب کبھی جاؤں گی تو کہوں گی ۔ ہمیشہ بھابی رونا روتی ہیں کہ ناصر کے لیے لڑکی دیکھو ۔ انھوں نے بیسیوں لڑکیاں دیکھ ڈالیں ۔ ناصر کے قابل ایک نہ لگی :

"کیسے لگے گی ۔ ناصر ماشاء اللہ سینکڑوں میں ایک ہے : سعید صاحب نے کہا "گورا چٹا قد آور ۔ مردوں کے چوڑے شانے ، ارے اسے کمی کیا ہے ۔ لڑکی والے تو اسے آنکھ بند کر کے پسند کرلیں گے ! "

آپ سمجھے نہیں ! " وہ نادم سے لہجے میں بہت چپکے سے بولیں ۔ سعید صاحب مستفسرانہ انداز میں انھیں دیکھنے لگے ۔ چنانچہ آمنہ بیگم نے کچھ جھینپتے ہوئے کہا "بھابی نے جو لاکھوں روپے خرچ کر کے لبنیٰ ، ناخرہ اور سلمیٰ کی شادیاں کیں نا ، تو اب چاہتی یہ ہیں کہ ناصر کی شادی کر کے یہ کسر پوری کرلیں ۔ یہی تو وجہ ہے کہ پچاسوں گھر چھان لیے ۔ کوئی لڑکی کوئی نہ ملی ۔ جہاں صورت ہے وہاں دولت نہیں ۔ اور جہاں دولت کی ریل پیل ہے وہاں لڑکی انھیں اچھی نہ لگی ۔ اب وہ دولت مند کالی کلوٹی بہو تو لانے سے رہیں ۔ ناصر کی سی حسین اس کی دلہن بھی چاہیے ! "

"بخدا میں حیران ہوں ۔ ! " سعید صاحب سنبھل کر بیٹھ گئے " یعنی یہ کہ تمھارے بھائی صاحب قبلہ محمد احمد صاحب نے اس لغویت کی اجازت بیوی کو کیونکر دے رکھی ہے ؟ وہ تو خدا کے فضل سے حاجی ہیں ۔ دینیات کے معلم ہیں ۔ کیا بیٹے کے بیاہ کے سلسلے میں انھوں نے اپنی مذہبی معلومات طاق پر دھر دی ہے ۔ لاحول ولا قوۃ ۔ میں انھیں ایسا لالچی نہیں سمجھتا تھا"

"وہ نہیں ہیں لالچی!" آمنہ بیگم خفیف ہو گئیں۔ "لاکھ چیختے ہیں۔ بیوی کو برا بھلا کہتے ہیں۔ اور ناصر کو بھی شہ دیتے ہیں کہ وہ خود ہی اپنے کالج میں کسی کو پسند کرے۔ اس پرخچ پرخچ سے نجات ملے کسی طرح۔ بھابی حشر اٹھا دیتی ہیں۔ کچھ کہا کے سو رہوں گی۔ ایک ہی تو بیٹا ہے۔ اس کے بیاہ پر ارمان نہ نکلے تو کب نکلیں گے۔ بھائی جان ہار کر چپ ہو رہتے ہیں۔ ان کی کچھ چلتی بھی ہے!"

"مگر ایک سطر کا کیوں" سید صاحب بولے: "عامر اور شاکر بھی تو ہیں۔ اور بھئی واقعہ تو یہ ہے کہ مثالی حسین یہ دونوں بچے بھی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان ہی کا اثر تم میں بھی رہا ہو کچھ کم خوبصورت ہو!"

آمنہ بیگم گلابی ہو کر زیر لب مسکرائیں۔ "میرے حسن کا قصیدہ پھر پڑھیے گا۔ اور اب تو یہ بتائیے کہ اگر بھاوج نے ناصر کیلئے کہا تو منظور کر لوں؟"

"منظوری تو جب ہو گی جب آپ کے برادر معظم اور بھاوج محترمہ مجھ سے بھی پانچ لاکھ جوڑے کے اور پانچ لاکھ میں شادی کا مطالبہ نہ کریں۔ میں اتنا سرمایہ دار نہیں کہ ایک لڑکی کا بیاہ دس لاکھ میں کر دوں۔ میرے بجٹ میں بس بہت سے بہت پچاس ہزار کی گنجائش ہے۔ تم یہ ان پر واضح کر دینا۔"

"ارے کیا مجھ سے بھی مطالبہ کریں گے!" آمنہ بیگم کو برا لگا!۔

"تو پھر اب تک انھوں نے کہا کیوں نہیں؟۔ روحی پر ان کی نگاہ انتخاب کس لیے نہ پڑ سکی۔ اسی لیے نا کہ وہ سمجھتی ہیں تم ان کا مطالبہ پورا کرنے کے قابل نہیں ہو۔" سعید صاحب نے کہا۔ اور پھر انگڑائی لے کر اٹھ گئے۔ "اب تو میں سونے جا رہا ہوں۔ شاید پونے دس ہو رہے ہیں۔ یہ بارش نے اور بور کر رکھا ہے۔ مسلسل جلترنگ سا بج رہا ہے۔ پانی کا یہ تو اثر مجھے پسند نہیں اچھا میں چلا۔ شب بخیر!"

ان کے جانے کے بعد آمنہ بیگم کچھ دیر ڈرائنگ روم میں بیٹھی عُبید کو خط لکھتی رہیں۔ پھر وہ بھی اپنی خوابگاہ کی طرف چلی دیں۔!

اس رات موسم بڑا فسانہ آور ہو رہا تھا۔ پھوار کی رم جھم بجلی کی ہلکی ہلکی چمک، اور بدلیوں کا غصے سے غرّانا۔ ایک عجیب سا سماں تھا۔ روحی نے اپنے کمرے کی لائٹ گل کر دی۔ اور دریچے کے دونوں پٹ وا کر کے دریچے میں آ بیٹھی دُور دُور تک سا چمکیلی دھند بکھری ہوئی تھی۔ قرب و جوار کی عمارتوں میں جلتی ہوئی روشنیاں اس دھند میں پلکیں سی جھپکاتی لگ رہی تھیں!۔ کبھی ہوا کا رخ بدلتا اور وہ اپنے جھونک میں پانی لاتی روحی پر انڈیل کر سنسناتی ہوئی کمرے سے گزر جاتی!۔

جب تک روحی محبت نام کے کسی جذبے سے آشنا نہ ہوئی تھی۔ اسے موسم کی لطافت یا کثافت سے کبھی سروکار نہ تھا! مگر اب محبت کے حسین جذبے نے اسے ہر شے سے حسن کشید کرنا سکھا دیا تھا! وہ دور خلا میں دیکھ رہی تھی اور اپنے ذہن میں دن بھر میں ہوئے واقعات کو دوہرا رہی تھی۔

شکیل سے اس کی دوستی نے بے تکلفی کے ابتدائی مراحل طے کر لیے تھے۔ شکیل تو اپنے اور اس کے تعلیمی تعلقات کو محض رسمی ہی سمجھ رہا تھا۔ مگر روحی نے اپنے دل کی گہرائیوں سے کچھ اور مان لیا تھا۔ شکیل حسن صورت میں منفرد تھا حسن سیرت میں بھی اپنی مثال آپ تھا۔ اتنا نرم مزاج، نیکدل، بامروت، بُردبار اور مخلص انسان تھا کہ اس کی یہ خوبیاں فرشتگانہ بن چکی تھیں۔ وہ اپنے سارے دوستوں کے محسوسات کی پذیرائی کرتا تھا۔ کسی کی دل شکنی اس کے مشرب میں گناہ تھا۔ لہٰذا روحی جو اس سے عمر میں کم تھی۔ کمزور لڑکی تھی۔ اس کے التفات اور توجہ کی مستحق بن گئی جسے روحی نے اپنی دانست میں محبت سمجھا!۔ اور رفتہ رفتہ قدم

اس کی محبت میں ڈوب گئی! ۔ وہ اس سے عجیب طرح کے ناز اٹھواتی ۔ اب تک بہانے بہانے سے اس کے اہم فائیل لے چکی تھی ۔ بس مانگنے کی دیر تھی ۔ وہ خود ہی دے بھی دیتا تھا! ۔ اب یہ سارے فائیل، کتابیں، بیاض سب کچھ روحی کا سرمایۂ جان تھا! ۔

چونکہ کسی کا کہا ٹالنا شکیل کے لیے دل آزاری کے مترادف تھا ۔ اس لیے روحی جو بھی کہتی وہ مان لیتا! ۔

روحی کہتی ۔ "مجھے تو کلاس میں بیٹھنا نہیں ہے ۔ پروفیسر صاحب ہی جب نہیں آئے ۔ یہاں بیٹھ کے آپ کو کیا کرنا ہے ۔ ؟

"کچھ نہیں ۔ میں بھی تو فری ہوں!"

"تو پھر چلئے نا ۔ لائبریری میں چل کے بیٹھیں گے!"

"روحی آپ ایسی جگہوں پر اپنی کسی سہیلی کے ساتھ جایا کیجئے ۔ آپ یونیورسٹی کی دنیا کی نئی باشندہ ہیں ۔ یہاں کی آب و ہوا ۔ یہاں کا ماحول اور فضا آپ کے ڈیفینس کالج کی سی نہیں ہے ۔ یہاں میرا آپ کے ساتھ جانا بہت سے تمسخر انسانوں کا عنوان بن جائے گا ۔ اور میں بھی پسند نہیں کرتا کہ آپ کا نام میرے ساتھ لیا جائے آپ کا دل چاہتا ہو تو آپ اکیلی لائبریری چلی جایئے ۔ میں نہیں جا سکتا!"

"کہہ دیجئے نا صاف صاف کہ یہ بہانہ ہے آپ کو میرا ساتھ ہی گوارا نہیں ہے ۔!" اسے اتنا خاکسار، سیدھا سادا دیکھ کر روحی اس پر چھا گئی تھی ۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے ۔!" وہ فرد مس ہونے لگا: "آپ میرا مطلب نہیں سمجھیں ۔ یہاں کے بعض لڑکے بہت مفسد اور شریر ہیں وہ مجھے آپ کو بنانے لگیں گے! ۔ کیا ان کا معنی خیز انداز میں مسکرانا آپ برداشت کر سکتی ہیں!"

"نہیں!"

"تو پھر جائیے۔ مجھے معاف کیجئے۔۔!"

روحی نے اس پر رعب جمانے کے لیے سنجیدہ ہو کر کتابیں سمیٹیں اور کلاس سے اٹھ کر تنتناتی نکل گئی!۔

شکیل کے چہرے پر کرب سا چھا گیا!۔

کچھ دیر تک وہ بیٹھا کسی کتاب کے پڑھنے کی کوشش کرتا رہا مگر پڑھ نہ سکا اسے خود بھی یہ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ آخر وہ روحی کی موجودگی میں موم کی طرح کیوں پگھلتا ہے۔ اس کے سینے میں گوناگوں ناقابل فہم جذبات کا سمندر سا کیوں موجزن ہو جاتا ہے۔ اور وہ نہ جانے کیا چاہنے لگتا ہے!۔ اب تک اس نے مخلوط تعلیم ہی حاصل کی تھی۔ لڑکیوں کا قرب ان سے بات چیت اس کے لئے کوئی نیا سنسنی خیز تجربہ نہ تھا تو پھر ۔۔۔ یہ روحی۔ ؟ وہ شکست خوردہ سا ہونے لگتا!۔

اس روز بھی یہی صورت حال ہو گئی تھی۔ روحی نے اس سے موڈل دیکھنے کی فرمائش کر دی تھی۔ موڈل کا راستہ عام راستہ تھا۔ طلبا اور اساتذہ صاحبان مسلسل آتے جاتے تھے۔ اور یہ شکیل کو گوارہ نہ تھا کہ لوگ اسے ایک لڑکی کے ساتھ گھومتے پھرتے دیکھ لیں۔ اس نے ہمیشہ کی طرح انکار کر دیا اور اس کی پرواہ کیے بغیر کہ وہ کلاس میں بیٹھی ہے کہ چلی گئی۔ کلاس سے نکل کر چل دیا تھا۔

روحی کو اپنی بات کے گرنے کا بڑا غم تھا۔ وہ جانے اس سے کس سلوک کی متقاضی رہتی تھی۔ لیبڈیز روم میں آئی تو یوں جیسے دکھ کے بارسے بیمار سی ہو رہی تھی۔ اور بے ساختہ دل بھرا آ رہا تھا۔ اپنی پڑھائی لکھائی یہاں آنا جانا اسے سب فضول لگ رہا تھا۔ اس نے ایک طرف بیٹھ کے نہایت تنوطی پن سے سوچا کہ اب یہ اس کا آخری دن ہے۔ بس کل سے وہ اس درسگاہ کو خیرباد کہہ دے گی۔

اور بچیوں کی تمام کتابیں کاپیاں اس کی بیاض سب واپس کر دے گی۔

اس روگ سے بہتر یہ ہے کہ انسان تارک الدنیا ہو جائے۔ اس نے دوسری طرف رخ کر کے آنسو پونچھے اور خود کو دنیا بھر کی مظلوم سمجھ کر اپنے آپ پر ترس کھانے لگی!

نینا کا درس کی کلاس اٹنڈ کر کے آئی۔ ہمیشہ کی طرح تر و تازہ چونچال اور مسرور لگ رہی تھی!۔ خوشنما فیروزے رنگ کے لباس میں ملبوس۔ اونچی سی شوخ چوٹی گوندھے ہوئے۔ جس میں وہ ایم۔ اے کی متعلمہ نہیں لگتی تھی۔ ہائی اسکول کی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ روحی نے اسے آتے نہیں دیکھا وہ برآمدے سے باہر خلاء میں چکرانے والے طیور کو دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ نگوڑے کتنے بے فکر ہیں۔ بس دانہ دنکا چنا۔ اور مزے سے اپنے آشیانے میں جا سوئے! دفعتہً نینا نے مجلد کاپی اس کے سامنے پٹخی اور روحی ہلکی سی چیخ مار کے بھڑک پڑی۔ اس کی پیشانی پر ناگواری کی شکنیں پڑ گئیں!۔

"مارے دل دھڑک کے رہ گیا!" وہ اس پر الٹ پڑی "تمہاری عمر بیس ہونے کو آئی ہے۔ مگر حرکتیں بچوں جیسی کرتی ہو۔ ابھی کوئی اور ہوتا میری جگہ تو دس باتیں سنا کے رکھ دیتا۔ میں جو چپ رہتی ہوں تو اس کا مطلب۔!"

"لے بس۔ اب اتنی ننھی بھی نہ بنو بیوی" نینا اس کے پاس جگہ نہ ہونے کے باوجود گھس گئی "یہ البتہ کہو کہ تم اپنے چینی کے بووے کی دھن میں ڈوبی تھیں میرا آنا ناگوار گزرا ہے۔ تو بھائی چلے جاتے ہیں۔ یہاں عمر گزارتے نہیں آئے۔ اور سنو کہ وہ تمہارے مٹھو میاں منہ لٹکائے انٹرنس ہال کی طرف سے جا رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر بسورنے کے انداز میں مسکرائے تھے۔ میں نے یہ کہہ کر منہ پھیر لیا کہ چل دور موئے۔ مجھے دیکھ کے کا ہے کے لیے دانت نکوسے دے رہا ہے۔ مسکرا اپنی کسی لگی سگی کے سامنے"

کسی بات میں تمہاری تک ہے۔" روحی مسکرائی۔ "ایک زمین کی کہیں، ہو دوسری آسمان کی۔ اور میں) نے منع کیا تھا کہ خبردار کسی کو مجھ سے منسوب نہ کرنا کسی نے اڑتی اڑتی سن لی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے!۔ مگر تمہیں بھی قسم ہے جو میری مانو۔"

"نہیں سچی۔ !" عینا نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "کیا بات ہے۔ بے چارے بہت بے بس ہیں تجھے۔!"

"مجھ سے پوچھ رہی ہو۔" روحی تیز ہو کر بولی۔ "میں ان کی لگی ہوں کہ ان کے موڈ کی رپورٹ دینا پڑے فرائض میں داخل ہے۔!"

"ہائے ہائے تو بندریا کی طرح خوخیاتی کیوں ہو۔ کہہ دو کہ مجھے نہیں معلوم۔" عینا نے کہا۔

"نہیں معلوم!" روحی نے گال پھلا لئے۔

"اب میں چلی۔" عینا نے کہا۔ "دل گواہی دے رہا ہے کہ آج تمہارے بہنوئی کا خط آیا رکھا ہوگا۔ ارے روحی ایمان سے وہ ہجر کا مارا مرد ایسی شاعری بھر دیتا ہے اپنے خط میں کہ غریب پر مجھے ترس آنے لگتا ہے۔ نجانے نگوڑے کے نصیب میں وصل کب ہے!"

روحی بے ساختہ ہنس پڑی۔

عینا اس کا بگڑا موڈ درست کر کے چل دی تب روحی پر پھر بے نام سی اداسی نے حملہ کر دیا۔ وہ بھی اپنی گاڑی کا انتظار کر رہی تھی!۔ دو بج چکے تھے اور بہت سے لوگ جا بھی چکے تھے۔ تب کسی نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔

"روحی!۔ پلیز! باہر آئیے گا!" کھلے کواڑوں سے چاند جھانک رہا تھا

روحی کو کسی غیر مرئی طاقت نے اٹھا کر کھڑا کر دیا!۔ وہ باہر نکلی!۔ یہاں وہاں سب سناٹا تھا!۔

"کیا ہے!" وہ خشک لبوں پر زبان پھیرتی ہوئی بولی۔

"آپ کی کار آئی تھی!"

وہ اسے تکتی رہی!

"آپ کے ڈرائیور کو میں نے ہدایت کر دی ہے کہ موڈل کے پاس ٹھہرے اور میں آدھے راستے سے واپس آ گیا ہوں آپ کو لینے کے لیے۔!"

"کیوں؟"

"آپ موڈل دیکھنا چاہتی تھیں نا۔ چلیے دکھائے لاتا ہوں!"

"مگر آپ۔!"

"ہاں۔ تب میں نے مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اب سارے لوگ جا چکے ہیں۔ اب کوئی حرج نہیں۔ آیئے چلیں۔!"

"آپ سب سے اس قدر ڈرتے کیوں ہیں شکیل صاحب!" وہ تیز تیز قدموں سے اس کے ساتھ چلتی ہوئی بولی۔

"ہم جس معاشرے میں سانس لے رہے ہیں۔ وہاں ڈرنا ہی پڑتا ہے روحی۔ اگر کسی بد نفس نے کچھ کہہ دیا تو کیا آپ اس کی تردید کرتی پھریں گی۔ جبکہ آپ کو یہ بھی اطمینان نہیں ہوتا کہ آپ کی تردید کسی نے قبول کی بھی ہے کہ نہیں۔ اسے ڈر نہیں۔ احتیاط کہیے۔!"

روحی ہنسنے لگی "میں تو یہ سمجھتی ہوں کہ آپ مجھ سے ڈر گئے ہیں!"

"آپ سے نہیں۔ آپ کی خفگی سے" وہ بھی بے آواز ہنس دیا "میں کبھی نہیں چاہتا کہ آپ کی دل شکنی ہو۔ یا جو خواہش آپ کی میں پوری کر سکتا ہوں وہ پوری نہ کروں۔ یا پھر آپ نے ایک بڑے شاعر کا یہ مصرعہ نہیں سنا ؎

روٹھتے ہیں وہی جن کے ہوں منانے والے

اور پھر روحی نے ٹھنڈی فضا کو مزید منجمد کر دینے والی آہ سرد بھری! اتنی دیر وہ شکیل کے ساتھ موڈل کی نمائش دیکھتی پھری تھی۔ جتنی دیر وہ اس کے

قریب رہی تھی۔ وہ لمحے گنتے گنائے نہ تھے۔ روحی اس سرد تنہائی میں بھی ان کا شمار نہ کر سکتی تھی!!

اپنے باپ کے گہرے دوست کمشنر ہاشم صاحب کے ہاں چھوٹی موٹی تقریبوں میں روحی اکثر جایا کرتی تھی۔ لیکن یہ ضرور تھا کہ ان کے کنبہ والوں سے الرجک بھی تھی: ہاشم صاحب کا پورا کنبہ ہی بڑا ترقی پسند اپٹوڈیٹ اور فیشن ایبل تھا۔ وہ لوگ مجلسی زندگی کے بڑے شائق تھے۔ ذرا سی بھی کسی معمولی تقریب کو ہر طرح دھوم دھڑکے میں تبدیل کر دیتے۔ اگلی بار تو ان کے ہاں ان کے اپنے بچے کی سالگرہ تھی لہٰذا ہنگامہ بھی شباب پر تھا۔ اس غیر مذہبی رسم پر انھوں نے خاصا روپیہ بہایا تھا اپنی خوبصورت عالیشان کوٹھی کی آرائش پر ہزاروں روپیہ پھونکا ہی ہوگا کیونکہ ان کے گیٹ سے لے کر باہر سڑک تک رنگ برنگی قمقموں کی چھت بنائی گئی تھی اس میں یہاں وہاں چمکیلی سنہری جھنڈیاں بھی آویزاں تھیں۔ جب ہوا چلتی تو عجیب سی لطیف نغمگی فضا میں پھیل جاتی۔ کوٹھی کے سامنے اور عقب میں بے شمار خوشنما کرسیاں رنگین چھتریوں کے نیچے پڑی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی میزوں پر عمدہ گلدان سجے تھے۔ جن میں لگے ہوئے پھولوں کی اپنی ایک مہک سی تھی۔

متعدد مہمان وہاں براجمان تھے۔ اور ان کی آمد کا سلسلہ جاری ہی تھا۔ کوٹھی کے سامنے وسیع میدان چھوٹی بڑی کاروں، اسکوٹروں اور دوسری سواریوں سے تقریباً پُر ہو چکا تھا۔

روحی نے اس شان و شوکت کو بڑے تعجب سے دیکھا۔ کیونکہ وہ اور عابد بھی

بہت لاڈلے بچے تھے لیکن سعید صاحب نے ان کی کوئی سالگرہ کبھی نہیں منائی تھی۔ ایسے بچے نہ تھی۔ سالگرہ بھی کوئی ایسی چیز تھی۔ غریبوں کے نصیب میں کہاں ہوتی ہے۔ ان کے لیے یہ خوشیاں!۔

ادھر ادھر کے دلفریب و حیرت فضا مناظر دیکھتی وہ سب کے ساتھ برآمدے میں پہونچی تھی۔ تبھی ایک اپٹوڈیٹ سے صاحب نے پُر مسرت سا نعرہ لگا کر سعید صاحب کو روک لیا۔

"ارے تم ہو۔! سعید صاحب نے ان سے پُرزور مصافحہ کرتے ہوئے کہا "پھر تم کب آئے پنجاب سے؟ اچھے تو رہے تھے وہاں!؟"

"جی ہاں" انھوں نے روحی کی طرف کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا "میں پچھلے ہفتے آیا۔"

"ابھی تو رہو گے شاید!؟" آمنہ بیگم نے بھی بڑی اپنائیت سے پوچھا۔

"کہہ نہیں سکتا آنٹی۔!" پھر وہ جیسے بولا "آگے کا۔ چلا جاؤں گا۔ فوج کی ملازمت کا بلاوا۔ بس کوہ ندا کی پکار سمجھیے!۔ ارے آپ حضرات اندر چلیے نا۔ میں سمجھتا ہوں کہ باجی آپ کی منتظر تھیں۔!"

"ہاں ہاں۔!" آمنہ بیگم نے کہا۔

ان صاحب نے ایک بار پھر روحی کو دیکھا۔ دھڑکتے سے گلابی لباس جس پر روپہلا جال بکھرا تھا۔ وہ بڑی پرکشش ہو رہی تھی۔ آمنہ بیگم کی سرزنش سے مجبور ہو کر اس نے اپنی آنکھوں میں کاجل بھی لگا رکھا تھا۔ اور سفید و گلابی عارض پر وہ سیاہ و خوشنما آنکھیں یوں جگمگا رہی تھیں۔ جیسے کسی معبد میں دو معصوم چراغ روشن ہوں!۔

سعید صاحب باہر چلے گئے!۔ تب انھوں نے کہا۔

"آیئے نا آنٹی۔ میں آپ کو لیے چلتا ہوں!۔"

وہاں تو بار کے خواتین بھری ہوں گی۔" آمنہ بیگم نے کہا۔ "تم بھلا وہاں کیسے جا سکو گے؟

کوئی تم سے پردہ نہیں کرتا؟"

"جی نہیں، ابھی تک تو کوئی خاتون ایسی نہیں ملیں جو مجھے دیکھ کر آنچل کا پردہ کر لیں"

وہ مسکرائے "میں سمجھتا ہوں۔ وہ سب کچھ نہ کچھ عزیز قریب کی بہنیں یا خالائیں ہوتی

ہیں)۔ ورنہ پردہ تو واقعی کیا جاتا!"

"مصطفیٰ!" کسی نے آواز دی "کس سے باتیں کر رہے ہیں آپ؟"

"یہ میری ایک پیر تسمہ پا ہیں۔" مصطفیٰ نے چپکے سے کہا۔ "مجھے معلوم نہیں کہ کون

ہیں لیکن جیسے کہ بیمہ ایجنٹ پالیسی دینے کے لیے کسی معصوم کے پیچھے پڑ جاتا ہے۔

یہی حال ان کا بھی ہے۔ ہفتہ بھر میں شاید انھوں نے گھنٹہ بھر کے لیے بھی تنہا

رہنے کا موقع نہیں دیا ہے۔ خفیہ پولیس سے متعلق معلوم ہوتی ہیں۔!"

آمنہ بیگم ہنس کر بولیں "تمھاری باجی کی کوئی ملنے والی ہوں گی۔ شاید تمھاری

غیر موجودگی میں انھوں نے تمھارے لیے کوئی لڑکی پسند کر لی ہو۔ آخر تمھارا تنہا رہنا

انھیں کب تک گوارہ ہوگا!"

"اُف توبہ۔ آنٹی۔ آپ نے تو مجھے ایک نئے اندیشے میں مبتلا کر دیا" مصطفیٰ نے کہا۔

یہ کمانے کہ یہ تو میں نے سوچا ہی نہ تھا۔ اگر خدانخواستہ یہی معاملہ ہے تو پھر مجھے

واپس پنجاب بھاگ جانا پڑے گا!"

باتیں کرتے وہ بڑے ہال تک پہونچ گئے! تبھی ایک طرف سے بیگم ہاشم جھپٹیں

اور بڑے زور سے دہاڑتی چنگھاڑتی آواز میں آمنہ بیگم کو خوش آمدید کہی۔ انھوں نے

جھپٹ کر روحی کا ہاتھ پکڑ کر ربڑ کی گڑیا کی طرح کھینچا اور اپنے سینے سے چپکا لیا۔

پھر اس کی پیشانی چوم کر مصطفیٰ سے مخاطب ہو گئیں۔

"بیٹا تو روحی سے ملا۔ ارے بیٹا اپنے سعید صاحب کی بچی ہے۔ بہت ہونہار

قابل بچی ہے۔ پھر وہ روحی سے پوچھنے لگیں!۔

"بیٹا کاہے میں پڑھ رہی ہے تو۔!"

"جی میرا ایم اے کا پہلا سال ہے۔!" روحی چپکے سے بولی۔

"تو دیکھ لو۔!" انھوں نے مصطفےٰ سے کہا: "کہیں معلوم ہوتی ہے کہ یہ اتنی بڑی کلاس میں پڑھ رہی ہے۔ یہ تو بچی۔!"

"جی ہاں۔ یہ تو مجھے بھی میٹرک کی طالبہ معلوم ہوتی ہیں:" مصطفےٰ نے اب بے تکلفی سے مسکرا کر روحی کو دیکھا اور براہ راست اس سے مخاطب ہو گئے!: "کون سا مضمون لے رکھا ہے آپ نے؟"

"فلسفہ تو جی!۔ روحی نے کہا۔

"دلچسپ لگتا ہے؟"

"جی ہاں!" وہ زیر لب بولی۔

"اے آمنہ۔ صد رحمت ہے تم پر" دفعتہً پھر بیگم ہاشم کی پاٹ دار آواز گونجی: "یہ مہمانوں کی طرح عین وقت پر آئی ہو۔ میں نے افضل سے کہلوایا تھا کہ صبح سے چلی آئیو۔ اب ذرا میرے ساتھ چلو۔ عین وقت پر ہماری ساس نے شرط ڈال دی ہے کہ بچے کو پھول پہنانے سے پہلے میلاد ضرور ہو گا۔ میں نے پچھلا دالان صاف کروا کے وہاں چاندنیاں تو کرا دی ہیں مگر بہن مجھے اطمینان نہیں۔ ایک نظر تم ڈال کے بڑی بی کو بھی اطمینان دلا دو تو میری جان چھوٹے۔ قسم سے۔ کچھ کمی رہے گی تو بڑی بی میری جان سولی پر کر دیں گی۔ آؤ چلو۔!"

"آپا یہ تو اچھی بات ہے۔ میلاد شریف بابرکت۔!" آمنہ بیگم نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر بیگم ہاشم انھیں اپنے ساتھ لے گئیں!۔

روحی یہ دیکھ کر کچھ سراسیمہ سی ہو گئی کہ ان دونوں کے جانے کے بعد مصطفےٰ

باہر نہیں گئے۔ بلکہ وہیں صوفہ پر ٹک گئے! ۔ حالانکہ بہتیری عورتیں ہنستی باتیں کرتی وہاں سے ادھر ادھر آجا رہی تھیں۔ لیکن ان کی طرف کوئی بھی نہ آیا۔

"آپ سے مل کر مجھے خوشی ہوئی" مصطفیٰ نے کہا: "آپ اس سے پہلے شاید ہمارے ہاں کبھی نہیں آئیں۔ میں تو پہلی بار آپ کو دیکھ رہا ہوں۔ کوئی سال بھر پہلے کسی ضروری کاغذ کی تکمیل کے لیے سعید انکل سے ان کے گھر پر ملا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ تب بھی آپ کو دیکھا ہو۔ ! کیا آپ بہت کم سخن ہیں ؟"

"جی!" روحی اس بے تکلف انسان کی باتوں سے حیران اور پریشان ہو رہی تھی بمشکل بولی: "وہ۔ مجھے پتہ نہیں کہ آپ ہمارے ہاں کب آئے تھے۔ میں شاید کالج میں ہوں گی۔ یوں بھی اپنے کمرے میں بیٹھی زیادہ تر پڑھتی رہتی ہوں۔ میں ڈیڈی کے دوستوں سے نہیں ملتی!"

"اچھا؟"

وہ چپ رہی! ۔

"آپ آرٹس سے ایم، اے کر رہی ہیں۔ آپ کو فنون لطیفہ سے بھی یقیناً دلچسپی ہو گی!" مصطفیٰ نے پوچھا۔

"فنون لطیفہ ؟" ۔ اچانک روحی نے پلکیں اٹھائیں۔ مصطفیٰ کے چہرے پر تبسم کی کرنیں مچل رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں عجیب تھیں۔ سیاہ گہری سی متقناطیسی... آنکھیں۔ جو مخاطب کو مسحور کر سکتی تھیں۔ اپنے بھاری بھرکم سرمئی سوٹ میں وہ پرکشش معلوم ہو رہے تھے۔

لیکن اس کے باوجود روحی کو ان کا وجود ناگوار ان کے بے تکلفانہ باتیں گراں گزر رہی تھیں! ۔ وہ آشنا تھی ان آنکھوں سے جو خاموشی میں چیخ چیخ کر باتیں کرتی ہیں۔ اس نے اپنی خاموش آنکھوں سے شکیل سے بہت سی باتیں کی

تھیں۔ اور اب ان اجنبی چپ چاپ آنکھوں کی گفتگو۔ اس کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں

" فنونِ لطیفہ۔ مطلب یہ کہ مصوری، موسیقی، ادبیت یا شاعری۔ ان چیزوں

سے کبھی آپ کو کچھ دلچسپی ہے۔!" مصطفےٰ نے اسے گم صم دیکھ کر پوچھا۔

روحی اب سخت روکھی پھیکی اور کھردری بن چکی تھی۔ اس نے کچھ بے رخی سے

جواب دیا۔

"مجھے کہاں فرصت ہوتی ہو کہ ان چیزوں سے دلچسپی لے سکوں۔ مجھے اپنی تعلیم

پر توجہ دینی پڑتی ہے۔ میرا سبجیکٹ کچھ مشکل ہے۔!"

حیرت ہے!" مصطفےٰ نے کہا: "آپ کو ان چیزوں سے لگاؤ نہیں۔ حالانکہ آپ

مجسم فنونِ لطیفہ ہیں۔ ایک خوبصورت مجسمہ، ایک پرتاثیر شعر۔ اور:"

ارے لو مصطفےٰ! تم یہاں چھپے بیٹھے ہو!"۔ ایک صاحبزادی کہ لہ سنگھا بیگے

زرق برق لباس میں ملبوس اور عطر کے ذرابے اپنے اوپر انڈیلے وہاں آ دھمکیں۔ انکی آمد نے جیسے

مصطفےٰ کو بوکھلا دیا۔ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر وہ سہمے ہوئے انداز میں صوفے کے ایک گوشے

میں سمٹ گئے! اور نجانے کیا چاہتے ہوئے رحم طلب نظروں سے روحی کو دیکھا جس نے جان

بوجھ کر ان پر سے نگاہیں ہٹا کر نو وارد صاحبزادی پر گاڑ دیں چنانچہ انھوں نے فوراً پوچھ لیا

انکی تعریف!" اور اپنا لباس سمیٹ کر مصطفےٰ کے صوفہ پر براجمان ہو گئیں۔

ان کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ آپ دیکھ ہی رہی ہیں مصطفےٰ نے کہا۔

کیا مطلب؟۔ انھوں نے کہا۔

" معانی چاہتا ہوں۔ محترمہ ریاست جہاں صاحبہ!" مصطفےٰ نے گھگھیا کر کہا: "آپ

مجھ سے مطلب پوچھ رہی ہیں۔ مگر مدعا عنقا ہے میرے عالم تقریر کا۔ اچھا۔ میں

پھر ملوں گا۔ ادھر شاید کوئی آ رہا ہے۔!" وہ اٹھے اور پچھلے دروازے سے نکل کر

چلے گئے!۔ روحی نے محترمہ ریاست کا ہونق چہرہ دیکھ کر مشکل سے ہنسی ضبط کی۔

اس کے سمجھنے میں دیر نہ لگی انہی بھاری بھرکم صاحبزادی کو مصطفےٰ نے پیر تسمہ پا کہا تھا!۔

"آپ بڑی چچی ماں کی کوئی عزیز ہوتی ہیں کیا۔!" ریاست جہاں نے روحی سے پوچھا۔

"آپ کا مطلب کیا بیگم ہاشم سے ہے؟" روحی ان کے سرخ و سفید چہرے پھولے پھولے گالوں اور موٹے موٹے سرخی زدہ ہونٹوں، ان کی مثالی قدامت سے بہت زیادہ دلچسپی لے رہی تھی!۔

ہاں۔ وہی تو۔!" ریاست نے بھی اس سے کچھ تکلف نہیں برتا۔" وہ میری بڑی چچی ہوتی ہیں۔ ہاشم صاحب پپا کے بڑے بھائی ہیں۔ حقیقی نہیں۔ کچھ خالہ زاد یا جانے کون سے زاد۔ رشتے بے مجھے یاد نہیں رہتے!۔"

"جی نہیں۔ میں ان کی کوئی عزیز نہیں۔" روحی نے کہا" میرے ڈیڈی ہاشم صاحب کے دوست ہیں!۔ بہت پرانے اور گہرے دوست!۔"

"اچھا اچھا!" وہ بزرگ خاتون کی طرح زرکار ملبوس پھیلا کر خود بھی صوفے پر پھیل گئیں پھر روحی کو حیران آنکھوں نے یہ تماشہ دیکھا کہ انھوں نے اپنے سیاہ رنگ کے جہازی پرس سے چاندی کی خوبصورت ڈبیہ نکالی۔ اسے کھول کر ایک تہہ کیا ہوا پان نکالا اور لبوں میں داب کر ڈبیہ روحی کی طرف بڑھا دی۔ پھر مسکرائیں

"لو کھاؤ۔! تم کون سا قوام پسند کرتی ہو؟"

روحی ہنس پڑی۔" جی میں پان ہی نہیں کھاتی تو قوام کا کیا سوال ہے۔"

تمھیں ضرورت بھی نہیں" وہ بڑی اپنائیت سے بولیں۔" تمھارے ہونٹ یونہی لال ہیں۔ سرخی لگائی ہے کیا!۔

"نہیں تو!"

پڑھتی ہو!۔

جی ہاں۔

کون سے مدرسے میں۔!

یونیورسٹی میں۔!

"ارے ہاں۔ یہ لفظ بہت سنتی ہوں۔ یونیورسٹی، اب تم سے پوچھ رہی ہوں۔ اس لفظ کے کیا معنے ہوتے ہیں!۔ بتاؤ ذرا۔!"

وہ۔ مطلب یہ کہ سب سے بڑی درسگاہ۔!" روحی حیران تھی۔ یہ عمر میں بیس سال سے زیادہ ہی ہوں گی مگر کیا اتنی ہی لاعلم ہیں کہ اسے بے وقوف بنا رہی ہیں!۔ مشکوک لہجے میں وہ بولی۔

"آپ سچ مچ نہیں جانتیں؟ پھر آپ۔ آپ نے کہاں تک پڑھا ہے۔!"

"کہاں تک کیا!" آتی جاتی خواتین پر آنکھیں پھیلا کر نظریں دوڑاتی ہوئی بولیں۔ "ہمیں اماں نے پڑھوایا ہی نہیں۔ ویسے بھیا، آکا، اسلم بھائی سب پڑھے لکھے ہیں سات بھائی ہیں ہمارے۔ اماں نے کہا کہ چھوٹے دیدوں کا نور ایک ہی تو بچی ہے۔ اسے پڑھنے لکھنے کی مصیبت میں کیسے پھنسادوں۔ بہت پہلے استانی اماں آئی تھیں۔ بڑی کتاب پڑھاتی بھی تھیں۔ وہ بھی ہم سے نہ چلی۔ ایک مرتبہ کلائی کی ہڈی پر استانی اماں نے چٹکی ماردی۔ بس اماں نے تبھی سے ان کا آنا بھی بند کرادیا۔ بڑی کتاب بھی پوری ختم نہ کرسکے۔ ویسے تم جانو کہ۔ ارے ہاں۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

"روحی سعید حسن!"

"یہ کیسا نام ہے" بے چاری نے آنکھیں پھاڑدیں۔ "تم لڑکی ہو۔ روحی بیگم روحی جہاں کچھ ہونا چاہیئے تھا۔ یہ سعید حسن مردوں کا نام کیوں رکھ لیا ہے تم نے!"

روحی ان کی جہالت، کم علمی، اور گنوار باتوں پر دنگ ہوئی جارہی تھی۔ ان پر ترس بھی آرہا تھا۔ یہی تو جہالت کی دھاندلی ہے کہ مصطفےٰ جیسے اپٹوڈیٹ، ذی علم

اور فوجی عہدیدار کے پیچھے پڑی ہیں۔!

آپ سمجھیں نہیں۔ یہ میرے ابا کا نام ہے۔" روحی نے جواب دیا۔" آجکل یہ طریقہ ہے کہ سر نیم۔ مطلب یہ کہ۔ لڑکیاں اپنے باپ یا شوہر کا نام اپنے نام کے ساتھ لگا لیتی ہیں۔!

"بڑا غلط طریقہ ہے۔" انھوں نے برا سا منھ بنا کر ناراضی کا اظہار کیا۔" لڑکیاں اپنی ماں کا نام لگائیں تو قاعدے کی بات بھی ہے۔ لڑکے بے شک باپ کا نام اپنے نام میں جوڑ لیں۔ کھپتا بھی ہے۔ تمھاری شادی تو ابھی نہ ہوئی ہوگی۔"

"میں ابھی پڑھ رہی ہوں!" وہ ہنسنے لگی!۔

"طے ہوئی ہے کہیں؟"

"کیوں، طے ہو جاتی خواہ مخواہ۔!" روحی بولی پھر بدلہ لینے کو پوچھا۔"آپ کی تو ہو چکی ہوگی۔! یہ آپ کے بھڑکیلے کپڑے۔ اور یہ بھاری بھاری زیور پکار کر کہہ رہے ہیں کہ یقیناً آپ کسی بڑے آدمی کی بیوی ہیں۔!"

غیر معمولی طور پر وہ شرما گئیں۔" ہنو۔ نہ بڑا آدمی نہ کچھ۔ ابھی ہماری عمر بھی کیا ہے۔ یہ کپڑے۔ اور زیور تو اماں نے زبردستی پہنا دیے ہیں کہ ایسی محفلوں میں خوب رعب جمتا ہے!"

"آپ کی والدہ صاحب کہاں ہیں!"

"میلاد کے دالان میں بیٹھی ہوں گی۔ انھیں ایسی محفلوں سے بڑی عقیدت ہے تم ان سے ملو گی؟"

"ادھر جاؤں گی تو مل لوں گی!"

"ارے روحی سچ بتا نو کہ تم سے مل کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ تم بہت اچھی لگ رہی ہو۔ کبھی ہمارے گھر آؤ۔ ہمیں اپنے ہاں بلاؤ۔ ہماری تو کوئی اچھی سہیلی ہی نہیں ہے۔

ایک آنی تنی نورے کی لڑکی۔ مارے اس کے پاس سے ایسی بساہند چھوٹتی تھی کہ میں نے منھ بند کر دیا کہ نہ آیا کرے!

بساہند؟" روحی نے کہا۔

"اور پھر کیا۔ تعائی کی لڑکی کے پاس سے عطر حنا درجۂ خاص کی خوشبو کہاں سے آجاتی؟"

روحی منھ دبا کر دوہری ہو گئی۔ اپنی نوعیت کی منفرد پہیلی نصیب ہوئی تھی۔ وہ یک لخت اسے پسند کرنے لگی!۔

دفعتہً وہاں بیگم ہاشم نمودار ہوئیں۔ میلاد شروع ہونے والا تھا۔ ان دونوں کو بھی بڑے ہال میں لے جا کے بٹھا دیا۔

ایک محترمہ بڑی خوش الحانی سے تلاوت کر رہی تھیں۔ تب بھی ریاست جہاں روحی کے کان میں بھنبھناتی رہیں۔ پھر گھنٹہ بھر میلاد شریف ہوا کیا۔ وہ تب بھی خاموش نہ رہیں۔ دسترخوان پر بھی اپنا فرشی غرارہ سمیٹ کر اسی کے پاس بیٹھیں۔ نجانے ان کا ارادہ کیا تھا۔ وہ روحی کو تنہا چھوڑنا چاہتی نہ تھیں یا پھر اس قدر اس سے امپریس ہو چکی تھیں۔ جیسے کہا تھا مصطفےٰ صاحب نے۔ روحی نے ہنس کر سوچا۔ یہ پیر تسمہ پا ہی لگتی ہیں۔ بلکہ اس کی بھی نانی!

بعد میلاد و دعا شایئے کے بچے کی سالگرہ کی تقریب منائی گئی۔ اس نے تین عدد موم بتیاں گل کر کے کیک کاٹا۔ سب نے اسے مبارکباد دی۔ اس کی میز نت نئے تحفوں سے بھر گئی تھی۔ آمنہ بیگم بھی سرخ رنگ کی چمکیلی ٹرائیسکل اور آٹومیٹک کیمرہ لے گئی تھیں وہ تحفوں کی میز پر رکھ دیا۔ چھوٹا سا خوبصورت عاصم زربفت کی خوشنما شیروانی چوڑیدار پاجامے میں ملبوس گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے ایک ایک کی گود میں ٹھمکتا پھر رہا تھا!۔

مہمانوں کی اس بھیڑ میں کسی کو پردے زردے کا مطلقاً خیال نہ تھا۔ وہاں بڑی بزرگ خواتین بھی تھیں۔ جوان عورتیں معہ اپنے شوہروں کے بھی جگمگا رہی تھیں۔ مردوں کے برابر سر اسر قہقہے لگا رہی تھیں اور بے شمار نوجوان فیشن ایبل لڑکیاں بھی۔ مخلوط محفل میں مردوں عورتوں کی عظیم الشان کھچڑی سی تھی!۔ انسانی سمندر میں ایک قطرہ کی طرح گھلی ملی بے چاری روحی بھی تھی۔ آنکھیں گھما گھما کر یہاں وہاں گھور رہی تھی۔ کہ دفعتہً اسے احساس ہوا۔ اس کے بالکل پاس تقریباً پہلو میں لگے کھڑے مصطفےٰ بھی بے ساختگی سے ہنس رہے اور کسی کی شرارت پر تالیاں بجا رہے تھے!۔

روحی کے بدن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔

وہ ان کے پاس سے بھاگنے ہی والی تھی کہ اچانک ایک گرم مضبوط ہاتھ نے اس کا ٹھنڈا کپکپاتا ہوا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اس کے ہاتھ میں کچھ رکھ کر جلدی سے مٹھی بند کر دی۔ روحی دم بخود سی تھی۔ اس نے ادھر دیکھا۔ اب اس کے پاس کوئی نہ تھا۔ وہ ہانپتی ہوئی سانسوں کو قابو میں کر کے اپنے مرتعش وجود کو بمشکل گھسیٹتی نہ بستر تک کسی جگہ آئی اور ملگجے اندھیرے میں مڑے تڑے کاغذ کھول کر جو نظریں اس پر ڈالیں کھچے ہوئے الفاظ میں لکھا تھا۔

"آپ کو دیکھ کے پھر بھولنا ناممکن ہے۔ خدارا
میری ہو جایئے۔ مصطفےٰ ایم
ٹھنڈا پسینہ روحی کے ہر مسام سے پھوٹ پڑا۔

گھر کی چوکھٹ پر قدم رکھنے کے ساتھ ہی شکیل کا قلب اُلٹ کر رہ گیا۔ دروازے کے باہر تک تاریکی اور سناٹا تھا!۔ پردہ سرکا کر اس نے مدھم لہجے میں آواز دی۔

"امی۔!"

احتیاط سے آؤ۔!" ایک کمزور نسوانی آواز اندھیرے میں تیرتی ہوئی اس تک پہونچی: "آج عصر سے بجلی بند ہے۔ کوئی لڑکا بھی ادھر نہیں پھٹکا کہ موم بتی منگا لیتی۔ اب دیکھو روشنی کب آتی ہے۔

"لالٹین جلالی ہوتی آپ نے۔ امی۔ کیا آپ عصر سے اب تک اس دم گھونٹ دینے والی تاریکی ہی میں بیٹھی ہیں۔ شکیل احتیاط سے قدم رکھنے کی بجائے دوڑ کر آواز کی سمت پہونچ گیا: "میں بھول جاتا ہوں۔ اور آپ نے بھی یاد نہیں کیا کہ موم بتی آپ کے لیے رکھ جاتا۔ اچھا میں ابھی لایا۔! آپ اپنی جگہ سے نہ اٹھیئے گا!" وہ پھر الٹے قدموں باہر نکل گیا۔

مجھ بدنصیب کے لیے روشنی اور اندھیرا سب برابر ہے: انھوں نے زیر لب کہا آنکھوں کی روشنی تو میرا نبیل اپنے ساتھ لے گیا۔ اب میرے سامنے دس سورج بھی چمکیں تو کیا۔!"

شکیل تیز گیا اور دوڑا ہی ہوا واپس آیا تھا۔ اس کی سانسیں پھول رہی تھیں۔ اس نے ایک موم بتی جلا کر میز پر چپکائی ہی تھی کہ دفعتہً بجلی واپس آگئی اور یکبارگی سارے قمقموں کے روشن ہو جانے سے آنکھیں چندھیا گئیں۔

"ہا آ۔ آنکھیں مل گئیں!" اس کے منھ سے نکل گیا۔

بس تم آئے اور اجالا ہو گیا۔!" بڑی بی نے مسکرا کر کہا۔ پھر تخت سے اتریں۔" اتنی دیر تک کہاں رہ جاتے ہو بیٹا۔ کون سا ایسا نیا کام نکل آیا ہے۔ بھوکے پیاسے کیا کیا کرتے ہو۔ تمھارا خیال کر کے ادھر میری حلق سے بھی نوالہ نہیں اترتا۔ منھ ہاتھ دھو لو پھر کھانا لاؤں"

شکیل صحن میں کھڑا منھ ہاتھ دھو رہا تھا۔ اس نے بڑے دکھ سے ماں کو دیکھا اور پوچھا۔

"پھر آپ نے دوپہر کو کھایا کہ نہیں!"

"بس کھا لیا۔!" وہ چپکے چپکے قدم رکھتی باورچی خانے کی طرف ہو لیں۔

"نہیں امی" آپ صبح کی ناشتہ کی ہوئی بھوکی پڑی ہیں۔ آپ ضرور کچھ کھا پی لیا کیجئے امی۔ میری فکر مت کیا کیجئے۔ میں بھوکا نہیں رہتا۔ دوست احباب کے ساتھ میری چائے وائے چل ہی جاتی ہے۔ یہ مسلسل بھوکے رہنا آپ کے لیے سخت نقصان دہ ہے۔ اس طرح آپ کی آنکھوں کی رہی سہی روشنی پر بھی مضر اثر پڑے گا! جتنی بینائی رہ گئی ہے۔ اسے تو کم از کم قائم رکھیے۔ یہ تو آپ اپنے حق میں برا کر رہی ہیں!"

"کیا کروں۔ جب تم مجھ اندھی کی لاٹھی کا کوئی بندوبست نہیں کرتے۔ اب تو مجھے ٹٹول ٹٹول کر زندہ رہنا ہے!"

شکیل تولیہ کندھے پر ڈالے کچن میں آیا اور ان کا ہاتھ تھام کر زبردستی دالان میں لا کے بٹھا دیا: "آپ آرام سے بیٹھئے۔ کھانا گرم کر کے میں لاتا ہوں۔ میرے لیے شرم کی بات ہے کہ میں تو دن بھر باہر رہ کر اطمینان سے گھر واپس آؤں اور اوپر سے آپ سے خدمت لوں۔ اب میں آپ کے لیے اسی کمرے میں سب برتن اور پتیلیاں رکھ جایا کروں گا۔ آپ کو باورچی خانے تک بھی نہ جانا پڑے۔!"

بڑی بی نے آنچل سے آنکھیں پونچھ کر ایک سرد آہ بھری "تم کون سی تفریح کرتے پھرتے ہو بیٹا۔ صبح کے نکلے مارا مار گھر گھر بچوں کو پڑھاتے پھرتے ہو۔ پھر اپنی پڑھائی میں سر کھپاتے ہو۔ ادھر سے فرصت ملی تو پھر ٹیوشن۔ رات کے تھکے ہارے آتے ہو۔ ایسا میرا دل دکھتا ہے۔ یہ دن تو تم ایسے لڑکے کے بے فکری سے پڑھنے اور فراغت سے کھانے کے تھے۔ تم پر زندگی کا ایسا بوجھ ہے۔ میری خدمت بھی اپنے سر ڈال لو گے تو پھر یہ چار سکھ کی سانسیں بھی نصیب نہ ہوں گی!"

شکیل نے تخت پر دستر خوان بچھا کر کھانا چن دیا۔ اور ماں کے خوش کرنے کے لیے بولا "امی یہ بھونے گوشت کی خوشبو تو بے چین کیے دیتی ہے۔ لیجئے آپ بھی شروع کیجئے۔ ہاں۔ ادھر ہی ہے آپ کی رکابی" اس نے نیم نابینا خاتون کا ہاتھ پکڑ کر رکابی سے چھلا دیا۔ کچھ دیر بعد انھوں نے مسکرا کر کہا۔

"یہ کھانا جسے تم مزیدار کہہ رہے ہو۔ میں نے نہیں پکایا!"

"آپ نے نہیں پکایا تو پھر۔ امی" اس نے مجبور ماں کو خوش کرنے کے لیے گویا چٹکیاں بھرنے کے لہجے میں پوچھا۔ حالانکہ وہ اکثر دیکھ چکا تھا کہ ہمسائے پیش امام صاحب کی لڑکی اس کے گھر کا کام کاج کرنے اور امی کا ہاتھ بٹانے آجاتی تھی۔

"یہ۔ گوشت تو سفینہ خاص کر تمھارے لیے بھون کر رکھ گئی ہے۔ روٹی چاول بھی اسی نے پکا دیے تھے۔ روز بے چاری بچی آجاتی ہے میری دعائیں لینے۔" امی نے کہا اور پھر گریز کے بعد نفس مطلب پر آئیں "شکیل میں کہتی ہوں۔ آخر وہ کیا بری ہے نہ ہو گی گوری چٹی خوب صورت لڑکی کو ہمیں نچانا اس کے حسن کی نمائش کرنا تو ہے نہیں۔ ہمیں تو لڑکی کے گن ڈھنگ، طور طریقے سلیقہ مندی اور گرہستی سے مطلب ہے۔ سفینہ کتنی اچھی ہے۔ سانولی سلونی، سمجھدار سچ مانو بیاں کہ وہ گھر جنت بنا دے گی! تمھاری مرضی کا پتہ ہی

نہیں چلتا۔ ورنہ میں امام صاحب کی بیوی سے بات کرتی!۔ مگر ہاں۔ اِہ یہ کہہ کر وہ دفعتہً چونکیں اور خاموش ہوگئیں۔ شکیل کے دماغ کی دنیا میں روحی نئی نئی آکر بس گئی تھی۔ اس کے دل کا غنچہ روحی کی محبت سے مہک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں روحی کا حسن زندگی کی تابانی بن کر سما گیا تھا۔ ایسے نگینہ جیسی گندمی رنگ کی دبلی پتلی موہوم لڑکی کیا اچھی لگتی۔ جو اعلیٰ تعلیم کے معنے تو خیر جانتی ہی نہ تھی۔ مگر شاید معمولی اردو عربی سے بھی نابلد ہی تھی۔ اپنی بات چیت میں وہ دکھنی بولی استعمال کرتی اور وہ بھی خاصی غلط سلط۔ شکیل کے والدین کا تعلق یوپی سے تھا۔ اس کے دادا، والد وغیرہ سب امروہہ یا بھوپال کے رہنے والے تھے ایک چچا ابھی تک مدھیہ پردیش ہی میں مقیم تھے۔ ان لوگوں کی بولی بھی نہایت شائستہ مہذب اور عمدہ تھی!۔ اور یوں بھی شکیل کو دکھنی آتی نہیں تھی۔

شکیل!" وہ ماں کی سنجیدہ آواز سن کر غور سے انھیں تکنے لگا!۔

کھا چکے ہو!"

"جی ہاں۔!"

"یہاں برسات کا حبس ہے۔ چلو برآمدے میں بیٹھیں۔ یہ برتن اٹھا کر کھانے کی میز پر رکھ دو۔ صبح دھو دوں گی!"

دونوں پرلی طرف ہوادار برآمدے میں جا بیٹھے۔!

"آپ کچھ کہتے کہتے رک گئی تھیں!" شکیل نے کہا۔

"آج دوپہر تمہارا کوئی دوست تمھیں پوچھتا ہوا آیا تھا۔ میں نے کہا کہ میاں وہ تو ہے نہیں۔ کوئی کام ہو تو کہہ جاؤ۔ وہ تو اب رات ہی کو آئے گا تو جانتے ہو اس نے مجھ سے کیا کہا تھا؟۔

"کیا کہا تھا؟" شکیل کا دل دھڑکنے لگا۔

دیہ کہا تھا کہ اب شکیل بھائی کو اتنی اچھی خوبصورت بیوی مل گئی ہے۔ اب بھلا وہ ہم دوستوں کو کہاں یاد رکھیں گے؟ اور مجھے مبارکباد دے رہا تھا۔ شکیل یہ کیا قصہ ہے میاں۔؟" انھوں نے اپنی بے نور سی آنکھیں اس کی طرف اٹھائیں۔ کہہ رہا تھا کہ شکیل بھائی اپنی بیوی کے ساتھ باغوں میں بڑے بڑے ہوٹلوں میں دکھائی دیتے ہیں مگر ان سے ذرا کہہ دیجئے کہ ان پر دوستوں کا بھی حق ہے!

میں تو یہ سن کر گھبرا گئی تھی۔!

"تت۔ تو پھر آپ نے۔ اس سے کیا کہا تھا!"

"میں کیا کہتی مجھے یقین ہی کب آیا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ نہیں میاں تمھیں کچھ دھوکا ہوا ہوگا۔ ابھی شکیل کی شادی ہی کہاں ہوئی ہے!۔ اس پر وہ بڑا حیران ہوا اور مجھ سے پوچھنے لگا کہ پھر ان کے ساتھ خوب صورت سی لڑکی کون ہوتی ہے!"

شکیل خاموش رہا۔ چنانچہ انھوں نے پھر کہا۔

"اب میں تم سے پوچھتی ہوں کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ تم تو ان باتوں سے کوسوں دور تھے۔ تمھیں کبھی کسی لڑکی سے دلچسپی نہیں ہوئی تھی۔ تمھاری خالہ زاد بہن یا ہمسائے کی بچیاں مجھ سے ملنے آجاتی تھیں تو تمھیں الجھن ہوتی تھی۔ پھر اب یہ کون سی لڑکی ہے۔ جسے تم یہاں وہاں اس طرح لیے لیے پھرتے ہو کہ سب کی نظروں میں بھی آجاتے ہو؟۔ بتاؤ مجھے!"

شکیل اب بھی چپ چاپ بیٹھا سوچتا رہا۔ روحی کی بے جا ضد اور فرمائش سے مجبور ہو کر وہ ایک دفعہ کمپنی باغ اور دوسری بار ایک ہوٹل میں رک گیا تھا۔ اسے یاد آیا۔ کچھ کتابیں خریدنے کے لیے وہ دونوں شہر گئے تھے۔ راستے میں بارش آگئی تھی اور روحی اسے جبراً ہوٹل میں لے گئی تھی!۔ لیکن اسے اس کے ساتھ دیکھا

کس نے تھا؟۔

خیر نہ بتاؤ!۔" بڑی بی نے ایک سرد آہ بھر کر کہا: "تم نے اگر اپنی کوئی دلچسپی ڈھونڈ لی ہے تو اس میں حرج کیا ہے۔ آخر کب تک معذور بوڑھی ماں کی خدمت کیے جاؤ گے۔ کب تک اس اُجڑے سونے ماحول میں تمہارا دل لگے گا۔ بیٹا میں تو کہتی ہی تھی کہ گھر بسا لو۔ تمہارا بھی دل بہلے۔ میرا بھی کوئی سہارا ہو جائے۔ تم ہی نے اب تک حیل حجت میں وقت گنوایا ہے۔ میں ناراض تو نہیں ہوں۔ یہ البتہ مجھے دکھ ہوتا ہے کہ تم نے مجھ سے کہا نہیں۔ ورنہ میں۔!"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے امی۔ کیا آپ یہ سمجھتی ہیں کہ میں ایسی خودسری کر سکتا ہوں۔!"

"خودسری نہیں۔ میں یہ کہہ رہی تھی کہ مجھ سے کہہ کے کرتے بھی کیا۔ کون سا میں اس بے چاری بچی کو دیکھ سکتی!۔" ان کا لہجہ ڈوب گیا۔

"آپ خواہ مخواہ دل دکھا رہی ہیں امی۔ جبکہ آپ کے سارے قیاسات بے معنی ہیں۔" شکیل نے جواب دیا۔ اور پھر رک کر کہا: "میں نے آپ سے چھپایا ابھی کچھ نہیں۔ دراصل کوئی بات بتانے والی ہوتی تو بتا بھی دیتا۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ میرے ساتھ لڑکیاں بھی پڑھتی ہیں۔ جو لڑکی میرے ساتھ کسی نے دیکھی تھی وہ یہاں کے ایک ڈائرکٹر کی بیٹی ہے۔ نام روحی ہے۔ اسے کچھ خریدنا تھا مجھے بھی شہر آنا تھا۔ چنانچہ ہم دونوں ساتھ ساتھ شہر آئے تھے۔ راہ میں بارش نے آلیا۔ کافی پینے ایک ہوٹل میں رک گئے تھے۔ بس۔ یہ ہے سارا قصہ!۔ آپ یقین کیجئے۔ میں خواہ مخواہ کسی لڑکی کے ساتھ نہیں پھرتا۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ یہ تفریح آگے چل کر اچھے نتائج نہیں پیدا کرتی۔!"

"خفا ہو گئے ہو بیٹا۔!"

واہ امی۔ آپ کی باتیں۔ بھلا خفگی اور آپ سے ۔!" وہ پھیکی سی ہنسی ہنس پڑا۔

"نہیں بیٹا۔ سچ تو ہے۔ آخر اندھی ماں کے ساتھ رہنے میں کیا دل لگے گا کاہے کی دلچسپی۔ یہ تمھاری عمر خوشیوں اور تفریحوں کی عمر ہے۔ آخر تمھارے اور ہم عمر ساتھی ہر طرح خوش اور مگن ہیں۔ انھیں روٹی روزی کی تلاش میں چڑیوں کی طرح جگہ جگہ چونچیں مارنا نہیں پڑتا۔ وہ باپ کی کمائی پر ہاتھ دھو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہاں تمھیں فجر سے لے کر رات کے دس بجے تک سکھ کی سانس لینے کی مہلت نہیں ملتی۔ نہ کرو تو کھاؤ کیا؟" بڑی بی اب رونے لگی تھیں۔ "خدا سمجھے تمھارے ددیہال سے۔ یوں تو مجھے کم بختوں نے قلاش کر ہی دیا تھا تمھارے باپ کے گزرتے ہی نظریں بھی پھیر لیں۔ اب بھی ان سب کا کنبہ بھرا پرا ہے۔ مگر اس میں نہ میری جگہ نہ تمھاری۔ آج وہ سب تمھارے ہوتے تو اتنی عمر بھی تمھاری بیکار نہ گزرتی۔ اب تک پڑھ لکھ کر نوکر بھی ہو جاتے۔ میں تمھارا بیاہ کرتی۔ بیٹا اب بھی کچھ نہیں گیا۔ تم مجھے کسی خیرات خانے میں چھوڑ آؤ اور اچھی خوبصورت لڑکی سے بیاہ کر کے گھر بساؤ۔ ہنسی خوشی رہو۔ آخر میرے پیچھے کب تک مٹی برباد کرتے رہو گے"۔!

شکیل ماں کے پاس جا بیٹھا اپنے ہاتھ سے ان کے آنسو پونچھے۔ اور ان کا سر اپنے کندھے سے لگا کر پیار بھرے لہجے میں بولا: "امی میں آپ سے کتنا کہتا ہوں کہ اس طرح دل بھاری نہ کیا کیجئے۔ آپ میرے ددیہال کو جہنّم میں جھونکئے بھول جایئے ان سب کو جنھوں نے آپ پر ظلم کیا۔ کیا آپ ماضی کے دکھ درد پر ہمیشہ آنسو ہی بہاتی رہیں گی۔ جو کچھ بھی آپ کا چھن چکا ہے۔ اب میں آپ کو واپس کروں گا۔ آخر یہ صبح سے شام تک محنت جو میں کرتا ہوں امی تو کس کے

لیے ۔؟ صرف آپ کے لیے ۔ مجھے ڈاکٹر کی فیس جمع کرنی ہے ۔ پھر میں آپ کی آنکھوں کا آپریشن کراؤں گا ۔ جیسے ہی میرے پاس تین ہزار کی رقم اکٹھا ہو گئی ۔ سب سے پہلا کام آپ کا آپریشن ہو گا ۔ آپ کی بینائی واپس آئے گی تو میں سمجھوں گا کہ مجھے بھی آنکھیں ملی ہیں ۔ پھر آپ کر دیجئے گا میری شادی ۔ جس لڑکی سے بھی چاہیئے گا ۔ میں ہرگز انکار نہ کروں گا ۔ میری دلہن کی شکل ہی اگر آپ نے نہ دیکھی تو وہ لاکھ حسین ہو ۔ محض بیکار ہو گی ۔ اس کا چہرہ سب سے پہلے آپ دیکھیں گی ۔ امی بس اسی لیے میں آپ کو گھر میں اکیلا چھوڑ کر ٹیوشن پڑھاتا پھرتا ہوں ۔ ہمارے دکھ کے دن اب گذر چکے ۔ سکھ کے دن بہت قریب ہیں ۔ بس تھوڑا سا صبر اور کر لیجئے ۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا ۔ آپ نے دکھ کی کال کوٹھری کے پچیس سال بھگت لیے ۔ امی میرے کہنے سے ایک سال اور گزار لیجئے ۔ کیا آپ کو خدا کی رحمت پر بھروسہ نہیں ہے ۔ آپ جو ہر نماز کے بعد رو رو کر دعائیں مانگتی ہیں ۔ کیا ان کی مقبولیت میں آپ کو شک ہے ؟"

اتنے صدمے سہہ لیے ۔ " وہ گلوگرفتہ لہجے میں بولیں " لاکھوں کا سونا چاندی ہزاروں کپڑے ۔ بھنبیرا وہ سارا سامان سب ظالموں کے پیٹ میں اتر گیا ۔ پھر تمھارے باپ کی موت کا صدمہ ۔ اور وہ ۔ ننھے نبیل کی گمشدگی کا سب سے بڑا صدمہ ۔ اس نے میری آنکھوں کا نور چھینا ہے ۔ مرے ہوئے کو تو صبر کر لیا ۔ زندہ کا صبر ابھی تک نہ کر سکی ۔ ہمیشہ خیال آتا ہے ۔ وہ جیتا ہے ۔ زندہ بھی ہے کہ دنیا سے چلا گیا ۔ تمھیں نہیں معلوم ۔ تم بہت چھوٹے تھے ۔ اگر تم اپنے بھائی کو دیکھ لیتے تو تم بھی اسے بھول نہ سکتے ! ۔ وہ ایسا ہی تھا ! "

کیا آپ تنہائی میں میرے گمشدہ بھائی کو یاد کیا کرتی ہیں ۔ اس طرح آپ کی صحت کیونکر اچھی رہ سکے گی ! ۔ امی یہ آپ مجھ پر ظلم کر رہی ہیں " شکیل نے گلہ کیا

یعنے مجھ زندہ بیٹے کے وجود سے آپ مطمئن نہیں ہیں ۔ آپ کو میری محبت سے بھی سر دکار نہیں ۔ آپ مجھ سے زیادہ گمشدہ بیٹے سے محبت کرتی ہیں ۔ تو پھر ۔ میں یہ ساری محنت مشقت کس لیے کروں امی ۔ میں کل سے سب کچھ خیر باد کیے دیتا ہوں آپ کے پاس بیٹھا رہوں گا تاکہ پرانی یادوں کی نیش زنی آپ محسوس نہ کر سکیں !؟

بیٹا دل بھر آتا ہے تو سب کچھ تم سے کہہ دیتی ہوں ۔ اور میرا کون ہے ۔ وہ آہ بھر کر بولیں : دن بھر اکیلے رہتے رہتے طرح طرح کے خیال آتے ہیں کام کاج کچھ ہے نہیں ۔ اور آنکھیں بھی نہیں ہیں کہ کچھ اللہ کا کلام ہی پڑھ کر دل کو سکون دے سکوں !

تھوڑا بہت تو آپ کو دکھائی دیتا ہے نا امی ۔ ! شکیل کے دل پر دھکا سا لگا ! ۔

" دن کو روشنی میں تھوڑا بہت دیکھ لیتی ہوں ۔ مغرب سے بس پرچھائیاں ہی نظر آتی ہیں ۔ ! "

" بہت جلد آپ دیکھ سکیں گی ! ۔ بہت جلد میرے پاس پورے ڈھائی ہزار ہیں ۔ ایک ہزار اور ہو جائیں ۔ بس سب سے پہلا کام آپ کا آپریشن ہے ۔ پر سچ ہے ۔ آنکھیں بند کیے دن بھر اکیلے رہنا بڑا وحشت ناک خیال ہے ۔ کچھ دیر کے لیے آپ سفینہ کو اور کیوں نہیں روک لیتیں "

" دن بھر غریب یہیں رہتی ہے ۔ میرے تمھارے کپڑے دھوئے ۔ کھانا پکا دے ۔ گھر صاف کر دے ۔ میرے ساتھ باتیں کرے اور جی بہلائے ۔ مگر اسے اپنے گھر کے کام بھی تو کرنے ہوتے ہیں ۔ شام ہوتے چلی جاتی ہے ! "

" اچھا امی اب چلئے آرام کیجئے ۔ میں بھی سوتا ہوں ! شکیل نے کہا ۔
بیٹا میری ایک بات مانو گے ۔ وعدہ کرو ۔ ! " انھوں نے ملتجی نظریں

تشکیل پر جا دیں۔
کہیئے۔"

"وہ پیسے جو تم نے جوڑے ہیں نا۔ ان سے اپنے کپڑے سلوا لو۔ باہر پھرتے ہو۔ تمھارے پاس اچھے کپڑے ہونے چاہیئں۔ میرا کیا۔ اتنے برس گزر گئے رہی سہی بھی گزر رہی جائے گی؟"

نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ تشکیل نے یکقلم انکار کر دیا۔ "کپڑے میرے پاس موجود ہیں۔ آپ کی آنکھوں کا آپریشن بے حد ضروری ہے۔ بس یہ برسات ختم ہو لے تو پھر لے چلوں گا آپ کو۔ ڈاکٹر صاحب نے بہت حوصلہ بندھایا تھا۔ کہہ رہے تھے کہ گرمیوں کے شروع ہی میں آپریشن کر دیں گے!"

"ڈر لگتا ہے بیٹا۔ بصارت واپس نہ آئی تب۔!"

"ضرور آئے گی۔ آپ مایوس انداز میں نہ سوچا کیجئے۔ آیئے چلیں۔ پھر آپ صبح جلد اٹھ جاتی ہیں۔ اب شاید دس بج رہے ہیں۔ آپ کو جلدی سو جانا چاہیئے"

وہ انھیں سہارا دے کر ان کی چھوٹی سی خوابگاہ میں لایا اور جلدی سے بستر درست کیا۔ پھر انھیں آرام سے لٹاتا اور سینے تک رضائی اڑھاتا ہوا بولا۔

"اب آپ سو جائیے گا۔ اچھا۔ فکریں کر کے نیند نہ اڑائیے گا!"

"اچھا بیٹا۔ نیند آئے گی تو سو ہی جاؤں گی۔ تم جاؤ سو رہو۔ صبح سے اب تک پاؤں میں پہیے باندھے رہتے ہو۔ میرا کیا۔ میرے لیے دن رات سب یکساں ہیں۔" انھوں نے آہ بھر کر جواب دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

چپکے سے انھیں شب بخیر کہہ کر وہ باہر نکلا۔ بجلی ایک بار پھر آؤٹ ہو گئی تھی۔ برآمدہ تاریک پڑا تھا۔ یہ رات چودھویں کے چاند کی تھی مگر چاند گھنے بادلو

ردا میں چہرہ چھپائے ہوئے تھا۔ دیسے دالان کا ایک حصہ کسی عجیب سی روشنی سے نمایاں ہو رہا تھا۔ وہ اپنی آرام کرسی۔ برآمدے سے یہیں اٹھا لایا۔ نیند کا کوسوں پتہ نہ تھا۔ اس نے ایزی چیئر پر لیٹ کر اپنے خیالوں کو آوارہ چھوڑ دیا۔ اب وہ جانے کہاں کہاں بھٹکنے لگے تھے۔ خیالوں میں ربط و تسلسل نہ رہا تھا کبھی یہاں کبھی وہاں۔ ان شریر بچوں کی مانند جو بڑوں کی نظریں بچا کر گھر سے باہر نکل گئے ہوں۔

اس نے اپنے بچپن میں اچھے دن دیکھے تھے۔ بھرا پرا کنبہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے والد اور دادا اس کے چچا سب بڑے عہدوں پر تھے۔ گھر کے سب اسے چاہتے تھے۔ بہت زیادہ دُلار کرتے تھے۔ وہ خاندان بھر کا حسین ترین بچہ تھا امی ہر وقت اس کا منہ چومتی رہتی تھیں۔ اور تب وہ دیکھتا تھا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو تیرتے رہتے تھے جس کی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ وہ اپنے ننھے منے ہاتھوں سے ماں کے آنسو پونچھتا تھا۔ اور اس کی سمجھ میں بس یہی بات آتی تھی کہ امی کہتی تھیں اس سے بڑا بھائی جو ڈھائی سال کا تھا کہیں آتے جاتے راستے میں گم ہو گیا تھا اور تلاش بسیار کے بعد نہ ملا تھا۔ چونکہ اس کی گمشدگی کا سارا الزام اس کے دادا دادی نے امی ہی پر رکھ دیا تھا۔ اور انھیں ہمیشہ مورد الزام ٹھہرانے کے سوا بُرا بھلا کہا کرتے تھے۔ لہٰذا امی کی گریہ زاری برحق تھا۔ ان پر پہلے ہی کافی ستم ہو چکے تھے۔ ساس اور دیور نے مل کر ان کا سارا زیور فروخت کر ڈالا تھا۔ ان کے قیمتی ملبوسات نند کی شادی میں دے دیے گئے تھے۔ یہ ہمیشہ کی بے زبان اور کمزور تھیں۔ سوتیلی ماں اور بے پروا باپ کی بے یار و مددگار بیٹی۔ نہ ان کا پرسان حال میکے میں کوئی تھا نہ سسرال میں کوئی ہمدرد۔ جی بھر کر تباہ ہوئیں۔ عدیل صاحب ہمیشہ کے قناعت پسند

اور لاؤبالی تھے متعدد دعنوں نے انھیں بے حس بنا رکھا تھا وہ نہ ماں کی طرف بولتے تھے نہ بیوی کی تائید میں منھ کھولتے تھے۔ لہٰذا ماں باپ بہن بھائی نے انھیں خوب دبا لیا۔ ان کا مال ومتاع اور حق چھینا۔ جائیداد سے بھی بے دخل کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ابھی شکیل صرف چھ ہی برس کا تھا کہ عدیل صاحب کا سایہ اس کے سر سے اٹھ گیا۔ ناظمہ بیگم کے سر سے سائبان ہٹ گیا۔ اب وہ اور بے سہارا بچہ مظالم کی تیز دھوپ میں ننگے سر کھڑے تھے! کہیں گھنی چھاؤں کا سایہ نصیب نہ تھا! ۔ عدیل صاحب کی جوان ناگہانی موت کا الزام بھی ناظمہ بیگم کی بد قدمی اور نحوست پر گیا۔ ان پر مظالم کی تعداد بڑھتی گئی بیٹے کے مرنے کے بعد ساس نے زبان کھولی۔ نند نے طنز و تشنیع کے تیر چلانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ دیور نے رہے سہے معمولی زیور بھی زبردستی ہاتھ گلے سے اتروا لیے۔ اب ان کی حیثیت گھر کی خادمہ سے بڑھ کر نہ تھی۔ بیوہ تھیں۔ چنانچہ ساس اور سہاگن نند صبح اٹھ کر ان کا منھ نہ دیکھیں۔! پھر ستم بر ستم یہ ہوا کہ ان کی دیور رانی گھر میں آئی۔ مالدار باپ کی مغرور خود سر بیٹی تھی۔ بڑے ناز و نعم سے پلی تھی بڑی خوشامدوں کے بعد سسرال لائی گئی تھی۔ اس نے چند ہی روز میں الٹی میٹم دے دیا وہ منحوس جیٹھانی کے ساتھ ایک گھر میں نہیں رہ سکتی! کیونکہ ساری رات اس کی المناک سسکیاں سن سن کر اس کا دل کمزور ہوا جا رہا تھا۔ اگر اسے اپنے مرحوم شوہر اور گم گشتہ بیٹے پر رونا ہے تو وہ اپنا انتظام کر لے اور بے شک سارا دن ساری رات روئے آہیں بھرا کرے۔ اسے نئی نویلی کا آرام حرام کرنے کا حق کب ہے۔ ایک روز شکیل کے چچا ناظمہ بیگم پر برس پڑے۔ وہ رشتے میں چھوٹے تھے ان کا اس طرح جھگڑا کرنا ناظمہ بیگم کو اچھا نہ لگا!۔ انھوں نے بھی منھ کھولا۔ "میرا پچاس تولے سونا، دو سیر چاندی، دس ہزار کے کپڑے اور پچاس

ہزار کا سامان جہیز رکھ دو! تمہارے گھر سے ابھی چلی جاتی ہوں۔ میں کچھ چکی ہوں۔ شکیل کے باپ کے مرنے کے بعد میرا کوئی رشتہ ناطہ تمہارے گھر سے اور تم لوگوں سے نہیں رہا ہے۔ تم لوگ بہانوں بہانوں مجھے نکالنا چاہتے ہو۔ صاف کیوں نہیں کہہ دیتے ہیں خود بھی کوئی تسمہ لگا رکھنا نہیں چاہتی۔ میری چیزیں واپس کر دو میں ابھی اور اسی وقت چلی جاؤں گی!" بے زبان بھاوج کے منھ سے یہ گراں مطالبہ سُن کر کفیل نے استہزائیہ انداز میں کہا: "بھابی اس بھول میں نہ رہیئے گا کہ آپ کا کوئی تسمہ لگا نہیں ہے۔ آپ کے پاس میرے مرحوم بھائی کی اولاد ہے۔ جب تک وہ باقی ہے۔ تسمہ لگا ہی رہے گا۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی!" ناظمہ بیگم نے خوفزدہ آواز میں کہا۔

سیدھی سی بات ہے۔!" کفیل نے جواب دیا: "اگر آپ اپنے جہیز کا مطالبہ کر سکتی ہیں کہ وہ آپ اپنے گھر سے لائی ہیں تو ہم شکیل کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔ یہ آپ نے ہمارے گھر سے پایا ہے۔ لہٰذا میں آپ کا سارا سامان سونا چاندی سب کچھ دیے دیتا ہوں۔ آپ اس کی وصولیابی اور ہمارے حق میں شکیل سے دست برداری کا کاغذ لکھ دیجیے۔! پھر یہ تسمہ لگا نہ رہے گا بھابی۔! اچھی طرح سوچ لیجیے!"

"نہیں!" ناظمہ بیگم کے دل کے سارے چھالے پھوٹ گئے۔ آنکھوں سے خون بہنے لگا۔!

"شکیل کو مجھ سے مت چھینو کفیل۔ مت چھینو میرے بچے کو مجھ سے۔ ایک کو تقدیر نے جدا کر دیا۔ یہ بھی جدا ہو جائے گا تو میں کیسے جیوں گی!" وہ یوں زار زار رو رہی تھیں کہ دشمن کو ان پر ترس آ سکتا تھا!

"یہ کوئی بیوپار کر رہے ہو کفیل۔!" ساس نے ناگوار لہجے میں کہا: "اور بیوی

تمھارا ابھی بڑا کلیجہ ہے۔ اتنے بڑے داغ چھاتی پر لگے ہیں۔ نجانے کن کرموں کی سزا ہے۔ تمھاری تو آنکھ سے آنسو بھی نہ سوکھنے مگر تم کو ابھی سونے چاندی لکڑی پتھر کی ہوس باقی ہے۔ ارے ایک بچہ گود میں ہے۔ اس کا منھ دیکھ کر رہے سہے دن تیر کرو۔ زر زیور پہن کر کسے دکھانا ہے۔ نوج۔ بجوگ میں یہ نوچ تو جینی ؟"

ڈیڑھ لاکھ میں شکیل آپ کو بہت سستا پڑا ہے بھابی" کفیل نے کہا "پھر آپ اپنا کمرہ اور دالان کب تک خالی کر رہی ہیں ؟"

انھوں نے بڑی حسرت سے کفیل کو دیکھا تھا۔ مگر وہاں رحم و مروت کا گزر نہ تھا ساس سسر نے بھی نہیں روکا۔ وہ انھیں منحوس ڈائن سمجھتے تھے۔ ناظمہ بیگم اپنے کمرے میں آئیں تو بہت روئیں! اسی کمرے میں وہ دلھن بن کر اتری تھیں۔ اس چار دیواری پر ان کے اچھے دنوں کی کہانیاں بھی نقش تھیں۔ در و دیوار پر حسرت سے نظر کرتی وہ سامان باندھنے لگیں۔ چھ سال کا شکیل حیرت سے ماں کو دیکھ رہا تھا۔ اور پوچھے جا رہا تھا۔ امی آپ کہاں جا رہی ہیں۔ امی کیا میں آپ کے ساتھ نہ چلوں امی کیا آپ ابا کے پاس جا رہی ہیں۔ ابا نے مجھے نہیں بلایا۔ امی آپ اب اس گھر میں نہیں آئیں گے۔ امی کیا چچا جان نے آپ کو نکال دیا ہے۔ پھر ہم کہاں رہیں گے۔ امی بولیے۔ امی جواب دیجئے۔!"

مگر امی کے آنسو جاری تھے زبان بند تھی!۔

انھوں نے اپنے اور شکیل کے چند کپڑے سوٹ کیس میں رکھے۔ اور سارا سامان جو سسرال کا عطیہ تھا۔ وہیں چھوڑ دیا۔ اور شکیل کا ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکل گئیں!۔

بادل پھٹ چکے تھے۔ شفاف آسمان پر بدر کامل پوری آب و تاب سے جگمگا رہا تھا۔ خشک ہواؤں کے ارغنوں بج رہے تھے۔ چھوٹا سا صحن پگھلی ہوئی چاندنی میں سو رہا تھا۔ رات کا گمبھیر سناٹا یہاں وہاں منجمد تھا!۔

شکیل نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی۔ ایک بجنے والا تھا۔ نیند اب بھی اس کی آنکھوں سے دور تھی۔ دماغ میں جھینگر چلا رہے تھے۔ اس نے سر آرام کرسی کے ہتھے پر رکھ کر آنکھیں بند کرلیں اور پھر خیالوں کا گرد باد اسے اپنے نرغے میں لیے ماضی کی طرف پرواز کر گیا!۔

پھر کسی نے ان کی خبر نہ لی۔! نہ پھر کبھی ناظمہ بیگم نے ان کے مظالم کا شکوہ کیا۔ اس بے سرو سامانی میں ان کی ایک غیر مسلم دوست ان کے بہت کام آئی۔ اس نے اپنے گھر کا ایک صاف شفاف روشن کمرہ بالکلیہ طور پر ناظمہ بیگم کے لیے وقف کر دیا شکیل کو خوب یاد تھا۔ آنٹی سوزی اور انکل ورشم بہت ہنس مکھ فراخدل اور شفیق تھے۔ ان کے بچوں جیا اور دانگیش کے ساتھ وہ کھیلا کرتا تھا۔ انکل ورشم نے اسے انگلش اسکول میں شریک کرا دیا تھا۔ تب اسے معلوم نہ تھا کہ اس کے مصارف کہاں سے پورے ہوتے ہیں۔

ناظمہ بیگم محلے کے بچوں کو مذہبی تعلیم دینے لگی تھیں۔ اس طرح انھیں ڈھائی تین سو روپے مل جاتے تھے۔ دو سو روپے وہ آنٹی سوزی کو دے دیتی تھیں۔ اور وہ خاموشی سے لے بھی لیتی تھیں!۔ ایک بار انکل ورشم نے انھیں منع کیا تھا۔ مگر آنٹی نے جواب دیا۔

جب ناظمہ اپنی خوشی سے دے رہی ہے تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ دو سو روپے ہمارے بھی کام آتے ہیں!۔ یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگی تھیں۔

دونوں میاں بیوی نے ناظمہ بیگم کے ساتھ ایسا سلوک کیا تھا جیسے وہ ان کے ماں باپ ہوں۔ انکل ورشم بچوں کے ساتھ شکیل کو بھی گھمانے لے جاتے تھے۔ اس کی تربیت کرتے تھے۔ اس کا ہوم ورک کرا دیتے تھے۔ سیر کے لیے ساتھ لے جاتے تھے!۔

سوزی آنٹی ہمیشہ اپنا کھانا لے کر ناظمہ بیگم کے کمرے میں پہونچ جاتیں۔

اور ان کا پکا ہوا کھانا زبردستی چھین کر خود کھا لیتی۔ ساتھ ساتھ کہتی بھی جاتی تھیں

"ناجی تم یہ مسور کی کھڑی دال بہت مزے کی پکاتی ہو۔ مجھے بھی سکھ دو۔ اور یہ تمہاری دوہری پھولی پھولی روٹیاں۔ ان کا مزہ تو دال کے ساتھ ہی ہے۔ اب یہ آملیٹ اور پراٹھے بالائی تم کھاؤ۔ ڈاکٹر نے مجھے چکنائی سے پرہیز بتایا ہے۔ درشم کی وجہ سے مجبور ہوں۔ پکانا پڑتا ہے۔ اپنے بے گھی کی روٹیاں الگ کہاں پکاتی پھروں۔ لو! یہ تم کھا پی کے ختم کرو۔ شکیل اپنے انکل کے ساتھ کھا رہا ہے!"

"تمہیں خدانخواستہ مرض کیا ہے جو پرہیز کرتی ہو۔ ماشاءاللہ اچھی خاصی تو ہو"

ناظمہ بیگم کہتیں۔ منہ سکھا کر آواز مریض بنا کر سوزی آنٹی کہتی تھیں۔

"بلڈ پریشر، سر کا چکر تو روز کا ہے۔ سینے میں ہلکا ہلکا درد بھی رہتا ہے۔ یہ چکنائی مجھے بہت نقصان کرتی ہے۔!"

اس طرح مہینوں وہ ناظمہ بیگم کو کھلاتی رہیں۔ ابھی اچھے دن دور تھے کہ انکل درشم کے والد کے ہاں سے ٹیلی گرام آیا۔ ان کی حالت نازک تھی وہ جائیداد کا انتظام اور بٹوارہ کرنا چاہتے تھے۔ درشم کو فوری جانا پڑا۔ ساتھ میں آنٹی سوزی کا جانا بھی ناگزیر تھا۔ وہ سب ایک دوسرے سے بچھڑتے ہوئے رو رہے تھے۔ حتیٰ کہ انکل درشم بھی رو دیے تھے۔ جو کہ بہت ہنس مکھ تھے۔ کبھی نہ روتے تھے۔ اور تب۔ بے حد ندامت اور شرمندگی کے ساتھ جیسے کہ کوئی بڑی ناواجب حرکت ہو۔ آنٹی سوزی نے ناظمہ بیگم کے ہاتھوں میں تین ہزار سے زیادہ رقم رکھ دی۔! اور پشیمان لہجے میں بولی تھیں۔

"یہ وہی پیسے ہیں ناجی تو نے ہر ماہ دو دو سو کر کے جو مجھے دیے تھے۔ تیری حالت ایسی کہاں تھی کہ میں تجھ سے اپنے رہنے کی اجرت لیتی۔ پھر بھی لیا۔ کہ تیرے نام سے الگ رکھوں گی۔ برے بھلے میں کام آئے گی۔ تیرے سامنے بچہ ہے۔ اس

کی بہت سی ضرورتیں ہیں۔ یہ رکھ لو۔ زندگی باقی ہے تو پھر ملیں گے۔ ورنہ یاد تو کر لینا۔ !" پھر وہ ناظمہ بیگم کے گلے لگ کر خوب روئی تھیں !۔

وہ انکل درشیم کے لپٹ گیا تھا۔ تب انھوں نے اسے گود میں اٹھا کر پیار کیا تھا اور بولے تھے۔

"میں پھر آؤں گا بیٹا۔ تب تک تم خوب جی لگا کر پڑھنا۔ کھیلنا کودنا نہیں اپنی امی کو ستانا نہیں ان کا کہا ماننا۔ میری دعا ہے کہ بھگوان ایک دن تمھیں بڑا آدمی بنا دے۔!"

وہ جیہ اور واگیش سے مل کر رونے لگا وہ بچے بھی بے تاب تھے۔ کسی کو کسی کی جدائی گوارہ نہ تھی !۔

ناظمہ بیگم نے درشیم صاحب سے کہا "بھیا جی۔ مجھے گھر پہونچ کر تفصیل سے لکھ دیجیے گا۔ آپ کے پتا جی کی کیا کیفیت ہے۔ اور آپ کب واپس آئیں گے !۔"

"ہاں بہن۔ ضرور لکھ دوں گا !" انھوں نے کہا۔

ان کی روانگی کے بعد ناظمہ بیگم کی دنیا میں پھر ہیبت ناک خلا ہو گیا۔ انھیں یہ پر محبت مخلص اور شفیق میاں بیوی بہت یاد آتے تھے !۔ شکیل اپنے ساتھیوں کو بھی ترک گیا تھا۔ اسے ان دنوں بخار آ گیا تھا۔ تب ناظمہ بیگم اسے اسی ڈاکٹر کے پاس لے گئیں جو درشیم کا فیملی ڈاکٹر تھا۔ انھیں بھی پہچانتا تھا !۔ اس نے شکیل کو دیکھ بھال کر اطمینان دلا دیا۔ تب بر سبیل تذکرہ ناظمہ بیگم نے اس سے کہا کہ درشیم اور سوزی مدراس چلے گئے تھے !۔ اور اب نجانے وہاں کی گڑبڑ میں سوزی کو پرہیزی کھانا ملے کہ نہ مل سکے۔ وہ اپنی بیماری بڑھا لے۔ انھوں نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ سوزی کو کون سی خطرناک بیماری تھی جو انھوں نے ہمیشہ کے لیے گھی بالائی کا پرہیز بتایا تھا۔ تب ڈاکٹر نے جواب دیا۔ سوزی کبھی بیمار نہ تھیں نہ انھوں نے کسی قسم کا پرہیز بتایا تھا۔

وہ مکمل صحت مند اور تندرست تھیں!۔

تو سوزی نے اس طرح اچھی چیزیں انہیں کھلائی تھیں اور ان کا پھیکا سیٹھا کھانا خود کھایا تھا۔ ڈاکٹر کی حیرت کی پرواکیے بغیر وہ یکبارگی رونے لگیں!۔

پھر دو ڈھائی ہفتوں کے بعد درشم اور سوزی کے خط ایک ساتھ ملے۔ دونوں نے تقریباً ایک ہی مضمون لکھا تھا۔ درشم صاحب کے والد بٹوارے کے بعد چل بسے تھے۔ اب وہیں رہ کر درشم کو ان کا فرنیچر کا کارخانہ سنبھالنا تھا۔ بیوہ ماں کی دیکھ بھال کرنی تھی۔ بچوں کو وہیں اسکول میں شریک کرا دیا تھا۔ چنانچہ سوزی کو بھی وہیں رہنا تھا۔ انھوں نے شکیل کے لیے لفافے میں تنٹو روپے رکھ کر بھیجے تھے!۔" سوزی نے لکھا تھا کہ وہ دونوں انہی کے پاس آجائیں۔ سوزی اور بچے ان دونوں کو بہت یاد کرتے ہیں!۔ درشم نے لکھا تھا کہ اگر کبھی کچھ ضرورت ہو تو انھیں لکھ دیں! وہ ان کے بھائی ہیں!۔ بھائی کا کام ہے ہمیشہ بہن کا ساتھ دے!۔

جب ناظمہ بیگم کی والدہ کا انتقال ہوا تھا وہ تب بھی اس طرح بے اوسان ہو کر نہیں روئی تھیں۔ جیسا کہ درشم اور سوزی کے خط پڑھ کر رو دیں۔!

بہت دنوں تک سوزی خط لکھتی رہی۔ انکل درشم بھی ہر دو تین ماہ بعد شکیل کو کچھ نہ کچھ رقم بھجوا دیتے تھے۔ ناظمہ بیگم انھیں بڑی تفصیل سے اپنے حالات لکھ بھیجتی تھیں۔ پھر سال بھر بعد انھیں ان دونوں مخلص ہستیوں کی رفاقت سے بھی محروم ہونا پڑا۔ درشم کے بڑے بھائی امریکہ جا رہے تھے۔ انھوں نے باپ کی نیکٹری ایک کارخانے کو بیچ دی اور ماں کے کینسر کے علاج کے لیے بھائی بہنوں سمیت امریکہ چلے گئے!۔ مدتوں بعد سوزی کا ایک مختصر سا خط آیا تھا۔ پھر سناٹا ہو گیا!۔

شکیل جوں جوں بڑھتا گیا۔ اس کی ضرورتیں بھی بڑھتی گئیں۔ لہٰذا انھوں نے سوئی کا کام بھی شروع کر دیا تھا!۔ ان کی آنکھوں اور دماغ پر متواتر و مسلسل بار پڑتا جا رہا تھا۔ پہلے پہل انھوں نے پرواہ نہ کی!۔ لیکن رفتہ رفتہ آنکھوں پر جالا چھانے لگا!۔ سر میں درد رہنے لگا!۔ تب وہ گھبرائیں۔ دکھائی کم دیتا تھا۔ چلنا پھرنا مشکل تھا۔ تب ڈاکٹر کے ہاں گئیں۔ مرض بتایا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا مسلسل گریہ و زاری نے تو آنکھوں پر نہایت ناگوار اثر ڈالا ہی تھا پڑھانے لکھانے اور سوئی کا باریک کام کرنے کی وجہ سے بھی بینائی متاثر ہو گئی تھی!۔ اس نے یونہی سا کچھ علاج کیا تھا لیکن مستقل علاج آپریشن تھا۔ جس کے لیے فیس درکار تھی۔ چنانچہ بصارت سے محروم ہو کر عضوِ معطل کی طرح بیکار ہو گئیں!۔ پہلے تو تھوڑے بہت دھرے اٹھائے سرمائے سے کام چلتا رہا۔ مگر کب تک۔ اپنی اور گھر کی ضرورتوں کے لیے شکیل کو ٹیوشن تلاش کرنے پڑے اب مدتوں سے ان ماں بیٹے کے لیل و نہار یکساں انداز میں گزرے چلے جا رہے تھے!!!۔

انوار کا دن روحی کے لیے ایک عذاب سے کم نہ ہوتا تھا۔ اور اب سمجھ میں نہ آتا کہ جو دن اس کے سر پر آن کھڑا ہوا ہے وہ اسے گزارے کیونکر؟ دن بھر آوارہ روح کی طرح گھر بھر میں پھرا کرتی!۔ وہ عجیب لڑکی تھی۔ حد سے زیادہ ترنجان مرنج، جذباتی، خیال پسند۔ خواب پرست۔! اسے خود بھی پتہ نہ تھا کہ وہ دستِ حق سے کون سے محسوسات لے کے آئی تھی! شکیل نے

اس کی ذہنی و روحانی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر کے رکھ دیا تھا۔ اسے اس کی تعلیم، مزاج کی سادگی، اعلیٰ پندار، اور خاص کر اس کا غلمان کا سا حسن پسند تھا اور بس وہ یہی سب کچھ سوچتی رہتی تھی۔ چلتے پھرتے، سوتے جاگتے، تنہائی میں، محفل میں شکیل کا خوبصورت خیال اس کے ساتھ رہتا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ سوچتی کہ کہیں وہ پاگل تو نہیں ہو جائے گی!۔

شکیل صرف اس کا کلاس فیلو تھا۔ اور شاید اس کے اندھا دھند جذبات سے بے خبر بھی تھا۔ اس کا تکلم، اس کا تبسم اور مخلصانہ سلوک سب کچھ رسمی ہی تھا۔ اس نے کبھی خوشدلی سے روحی کے سلوک کی پذیرائی نہ کی تھی۔ بلکہ یوں لگتا تھا جیسے وہ جبراً قہراً کلاس کی حد تک اس کا ساتھ گوارہ کرتا ہو۔ اور جیسے ہی کلاس ختم ہوتی تھی وہ سب سے پہلے اٹھ کر باہر نکل جاتا تھا۔ جبکہ رحمان، انصاری اور محسن وغیرہ بیٹھے گپ شپ کرتے رہتے تھے!۔

روحی کو شکیل کا مغائرانہ سلوک تکلیف پہونچانے لگا!۔ وہ خود بخود خاموش اور گم صم رہنے لگی! انھیں دنوں معین میاں نے ایک شوشہ چھوڑ دیا۔ انھوں نے اپنا وقت کا کھانا سیدھا کر لیا تھا!۔ لیکن سعید صاحب اور آمنہ بیگم نے بری طرح اس کی خبر لی تھی!۔ سعید صاحب جو اسے کبھی سرزنش نہیں کرتے تھے۔ اس دن خوب بگڑے تھے۔ اور کہہ دیا تھا صاف صاف۔

" تم سمجھتی ہو کہ میں کچھ جانتا بوجھتا نہیں ہوں۔ انھیں یونیورسٹی بھجوا دیا ہے اور آنکھیں بند کر کے بیٹھ گیا ہوں۔ دیکھتا نہیں ہوں کہ تم نے یونیورسٹی کی نیز طرار واہیات لوفر لڑکیوں کی طرح ادھر ادھر کے لونڈوں سے دوستی بھگائی ہو۔ تمھیں کیا پتہ کہاں کہاں کے اور کون سی ذات و نسل کے لڑکے وہاں جھک مارنے آجاتے ہیں! ان سے متاثر ہونا ان میں دلچسپی لینا محض حماقت ہے۔ وہ بدکردار بدقماش لڑکے لڑکیوں

کی جذباتیت ان کی معصومیت اور بے خبری سے نامناسب فائدے اٹھانے لگتے ہیں!۔ روحی!۔ یاد رکھو کہ تم محض پڑھنے جا رہی ہو تمہاری تعلیمی استعداد اور شوق کے مدِنظر میں نے تمہارا وہاں جانا گوارا کیا ہے۔ اگر میں کچھ ایسی ویسی بے ہودہ ناقابلِ برداشت بات سنوں گا تو فوراً تمہاری تعلیم روک دوں گا۔ جو تعلیم تمہیں اچھے سبق سکھانے کے بجائے دوسری راہوں پر ڈال دے۔ اس سے بے علمی کی بے خبری لاکھ درجے اچھی ہے۔ سمجھیں؟"

"ہے کون وہ بدمعاش!" آمنہ بیگم نے بھی اس کے سینے پر برچھی سی مار دی۔ "جو تمہیں یہاں وہاں لیے لیے پھرتا ہے۔ ابھی تم لوگوں میں اچھی طرح تعارف تو ہوا نہیں اور سیر سپاٹے شروع ہو گئے! خدا کی پناہ۔ روحی۔ تم اتنی شرمیلی کم سخن اور خانہ نشین لڑکی تھیں تمہیں ایک غیر لڑکے کے ساتھ پارک اور کیفے میں جاتے کھاتے پیتے ذرا بھی برا نہ لگا؟"

وہ خاموش رہی۔

"مزید برآں۔" سعید صاحب نے پھر ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ "یہ کتنی نامناسب اور معیوب بات ہے کہ میرے دوست احباب اور ملنے جلنے والے تمہیں کسی کے ساتھ دیکھیں اور مجھ سے اس کا تذکرہ کرنا ضروری سمجھیں! فی الحال تو خیر معین صاحب ہی نے دیکھا ہے۔ مگر میں کہہ نہیں سکتا کہ تم کسی اور کی نظر سے بھی پوشیدہ رہی ہو!"

پھر ان کا لہجہ نرم اور ناصحانہ ہو گیا:

"بیٹی! میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ اب پھر اس تفریح کا اعادہ نہ ہو۔ سمجھو بیٹی کہ ہماری پوزیشن بڑی ہے۔ تم خدا کے فضل سے ڈائریکٹر سعید حسن کی صاحبزادی کہلاتی ہو۔ سوسائٹی میں ہمارا ایک مقام ہے۔ نام ہے۔ سب سے بڑی چیز یہ کہ بہت عزت ہے ہماری۔ اور یہی وہ چیز ہے کہ اگر ایک بار ملوث ہو جائے تو پھر سے

بے لوث کرنا بڑا مشکل ثابت ہوتا ہے۔! لہٰذا میں تم سے بمنت کہتا ہوں۔ رو حی۔ پھر ایسی حرکت نہ کرنا۔ میں دوبارہ کسی سے نہ سن سکوں گا کہ تم درسگاہ سے باہر کسی کے ساتھ دیکھی گئی ہو۔ لڑکیوں کی پوزیشن بہت نازک ہوتی ہے بیٹی!۔ اور لوگ یوں بھی افترا پردازی اور افواہوں کو پھیلانے اور سننے کے خواہش مند رہتے ہیں!"

روحی کے لبوں سے نہ نکلا کہ وہ آئندہ محتاط رہے گی۔ وہ بت کی طرح خاموش بیٹھی دامن کی خیالی شکنیں درست کرتی رہی!۔

جب اس کے ماں باپ نصیحت کر چکے تو وہ اٹھی اور اپنے کمرے میں آکر بیٹھ گئی!۔

آمنہ بیگم نے خوفزدہ لہجے میں کہا "کہیں پانی سر سے اونچا تو نہیں ہو گیا۔ آپ نے دیکھا کہ وہ تو جیسے گونگی ہی بنی بیٹھی رہی تھی۔ منھ سے بولنا سر سے کھیلنا دور کی بات ہے!"

"بیگم سنو!" سعید صاحب نے بھی کچھ دہشت سے کہا "ابھی اس دن کمشنر صاحب کے ہاں تقریب میں مصطفےٰ سے میں ملا تھا۔ مجھے تو وہ ہر طرح بہت عمدہ، موزوں اور معیاری لڑکا معلوم ہوا۔ اب بھی وہ ماشاء اللہ میجر بن گیا ہے۔ میں اسے بہت پسند کرنے لگا ہوں۔ کسی صورت سے تم کوشش کرو کہ کمشنر صاحب کی بیگم اپنے بھانجے کا رشتہ ہمارے ہاں بھیج دیں۔ کر سکتی ہو یوں؟"

"مجھے بھی بہت پسند آیا تھا" آمنہ بیگم نے فوراً تائید کی "ابکی میں نے بڑے دنوں بعد اسے دیکھا۔ مگر کیا مجال جو بڑا عہدہ پا کر ذرا بھی بدلا ہو۔ ویسا ہی ہنس مکھ، خوش مزاج اور سادہ دل ہے۔ خدا کرے کہ وہ خود ہی روحی کے لیے کہے۔ میں کیا کہہ کر رشتہ منگواؤں کبھی آپا نے بھی تذکرہ نہیں کیا۔!

"آپا۔؟؟" سعید صاحب نے کہا۔

"کمشنر صاحب کی بیوی کو کہتی ہوں!"

"اچھا۔ یہ بتاؤ کہ مصطفےٰ کے والدین سے بھی تم کبھی ملی ہو؟۔ وہ کس مزاج کے لوگ

ہیں۔ کہاں رہتے ہیں!؟"

"میں تو کسی سے کبھی نہیں ملی۔!" آمنہ بیگم بولیں: "جب کبھی کمشنر صاحب کے ہاں جانا ہوا۔ مصطفیٰ کو ان ہی کے پاس دیکھا۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ بے چارہ بہت چھوٹا سا تھا جب اس کے ماں باپ کسی حادثے میں ایک ساتھ ختم ہو گئے تھے۔ کم عمری ہی سے کمشنر صاحب کی بیوی نے پالا پوسا ہے۔ اور وہی اس کے ماں باپ بھی ہیں!"

"غریب۔ بے چارہ۔!"

"اس نے بھی کئی بار کہا تھا کہ میں نے اپنے ماں باپ کو دیکھا ہی نہیں!" وہ بولیں۔

"تو پھر اب اس کے مستقبل کا دارومدار بھی کمشنر صاحب اور ان کی بیوی پر ہوگا!۔"

"اور کیا۔؟"

"بھئی جب تمھارا شروع سے خیال تھا کہ وہ روحی کے لیے مناسب ہو سکتا ہے تو باتوں باتوں میں ان سے دریافت کرتیں کہ کہیں اس کا رشتہ انھوں نے طے تو نہیں کر رکھا ہے۔ تبھی تو کچھ کہتی سنتی نہیں ہیں!"

"میں نے پوچھا تھا۔" آمنہ بیگم بولیں: "کچھ ٹالنے کے انداز میں جواب دے دیا کہ ہاں سوچ تو رہی ہوں۔ وہ ایک جگہ ٹکتا کہاں ہے۔ آج یہاں کل کہاں ہے۔ ملازمت ہی ایسی نصیب ہوئی ہے۔ کسی جگہ اسے قرار آئے تو بات بھی چلاؤں۔!"

"ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھیں۔ ٹالنے کی کون سی بات ہے!" سعید صاحب بولے: "بہرحال میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک بار صرف مصطفیٰ سے ملنے کے بہانے تم ان کے ہاں پھر جاؤ اور خود مصطفیٰ ہی سے اس کا عندیہ معلوم کرو۔!

نہیں تو آج ہی شام کو جا سکتی ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ پھر اطلاع دیے بغیر چل دے۔ مہینوں میں تو ایک بار آتا ہے!"

"پھر اپنے ارادے کو کمزور نہ ہونے دو۔! آج ہی شام کو جاؤ۔!" سعید صاحب نے کہا" میں ابھی تک روحی کے مستقبل کی طرف سے فکرمند نہیں تھا لیکن اب مجھے وارننگ مل چکی ہے۔ آج کل کی نسل ناقابل اعتبار ہے کیسی سعادت مند اور فرمانبردار اولاد پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ لوگ اپنے بالغ ہونے کو ہر طرح کی آزادی اور من مانی کرنے کا سرٹیفکیٹ سمجھتے ہیں۔ میں تو ڈرتا ہوں کہ کہیں کسی دن یہ بھی آ کے نہ کہہ دے کہ ڈیڈی میں نے سول میرج کر لی ہے۔ ہنی مون کی غرض سے جا رہی ہوں۔ اطلاع دینے آئی تھی۔ خدا حافظ!"

"ارے توبہ ہے بیٹی روحی سے آپ ایسی توقع رکھتے ہیں۔ یہ تو آپ نے میرا دل بھی دھڑکا دیا۔!" آمنہ بیگم ڈر گئیں۔

زمانہ ہی بڑا ناقابل بھروسہ آ گیا ہے" سعید صاحب یہ کہہ کر اٹھ گئے۔!

"اور وہ اس دن جو آپ نے ناصر کے لیے کہا تھا۔!" آمنہ بیگم کو بہرحال بھتیجے سے محبت تھی۔

"ناصر صاحب کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے میرے پاس دس لاکھ کی پوٹلی نہیں ہے" سعید صاحب نے کہا" بہرحال تم آج کمشنر صاحب کے ہاں جاؤ تو۔ ادھر کچھ معاملہ نہ بن سکا تو پھر ناصر کے بارے میں سوچیں گے!" یہ کہہ کر وہ چلے گئے!۔ آمنہ بیگم بڑی گہری سوچ میں غرق ہو گئیں!۔

روحی نے اپنے کمرے سے پردے کی آڑ میں چھپے چھپے ان کی ساری گفتگو سنی تھی! اور پھر وہ بھی سوچ کے گہرے سمندر میں اتر گئی!۔

مصطفےٰ نے پہلی ہی ملاقات میں کاغذ کا پرزہ اسے تھما دیا۔ اور اس سے ملنے

اسے اپنانے کا متمنی تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر آج آمنہ بیگم وہاں چلی گئیں تو وہ قطعی اپنا پرپوزل ان کے سامنے رکھ دے گا! سعید صاحب اسے فوری قبول بھی کر لیں گے! تو پھر کیا وہ اپنی طوفانی محبت سے دستبردار ہو کر ایک انجان آدمی کے ساتھ جانے کہاں چلی جائے گی؟!۔ وہ بارڈر کا آدمی ہے۔ اکھڑ، درشت، بم اور بندوق کی زبان میں بات کرنے والا۔ ادبیت کی لطافت شاعری کی نزاکت اسے چھو کر بھی نہ گزری ہو گی اور وہ ادب و شعر کی دلدادہ ہے۔ شعریت، اس کی نس نس میں رچی بسی ہے۔ خون میں دوڑ رہی ہے۔ کیا وہ اپنی پسند سے کبھی ہاتھ دھو سکتی ہے!۔ نہیں!۔ ابھی پہلے پہل ہی تو وہ ادب و شعر کے عملی پیکر حسن سے دوچار ہوئی ہے۔ اس کا سا آدمی اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ ذہین تو وہ تھا ہی۔ حسن و سادگی، متانت و خاکساری، حلم و مروت، خلوص و محبت کا مجسمہ بھی تھا! بڑا پیارا آدمی۔ برا بھی کہو تو مسکراتا ہی رہتا ہے!۔ اسے اپنے حسن پر ناز نہیں ہے اپنی خوبیوں پر وہ نازاں و مفتخر نہیں ہے۔ کھویا کھویا سا فکرمند پریشان سا حسن۔ جو لاجواب بھی ہے اور مسحور کن بھی۔ روحی اس کی کنیز بننے کو تیار تھی۔ وہ جو ابھی تک بڑی لاابالی، بے نیاز، خود پرست و خود سر تھی۔ بڑے عہدیدار کی اکلوتی بیٹی ہونے پر مغرور بھی تھی۔ ایک دم اپنی حیثیت سے بہت نیچے اتر آئی تھی۔ اسے پتہ چلا تھا۔ دنیا میں اس سے بہتر اس سے قابل اس سے کہیں اچھے انسان بھی بستے ہیں!۔

اور وہ اپنے خیالوں میں تن من سے شکیل کی ہو چکی تھی۔ اس کے خیالوں میں سوائے شکیل کے اور کسی کا گزر نہ تھا!۔ وہ یوں اس کی ہستی میں جذب ہو چکا تھا کہ زندگی کے کسی لمحے میں اس کی یاد اس کے دل سے محو نہ ہوتی تھی!۔

شکیل اس تمام عرصے میں اس سے بے تکلف نہ ہوا تھا۔ بڑا محتاط اور خاموش رہتا تھا۔ ہر وقت کسی سوچ میں گم۔ خالی وقت میں کسی سنسان کنارے میں بیٹھا

پڑھتا رہتا۔ اور وقت کے ختم ہونے پر کہیں دکھائی نہ دیتا۔ جبکہ روحی کی متلاشی آنکھیں اسے ہر طرف ڈھونڈا کرتی تھیں۔

اس کی محبت عجیب تھی۔ اس میں ہوس کا شائبہ نہ تھا۔ وہ تو اسے اس طرح پوجتی تھی۔ جیسے خاموش بت پجارن ہو۔ دیوتا سے چاہے کچھ ملے کہ نہ ملے مگر وہ اسی پتھر پر نذرانے چڑھائے جاتی ہے۔ سر جھکائے جاتی ہے۔ مرادیں مانگے جاتی ہے! وہ سمجھتی تھی کہ اس کی محبت بہت سارے جذبوں میں گھلی ملی تھی۔ اس میں محبت کے علاوہ پرستش، والہانہ پن، سپردگی، تعلق خاطر پسندیدگی، اور حتیٰ کہ جانثاری کی شان تک سموئی ہوئی تھی! ۔ اور وہ بہر صورت شکیل کی زندگی میں جذب ہونا چاہتی تھی! ۔

دفعتہً کسی نے اسکے کندھے پر ایک جرزانہ ہاتھ رکھ دیا وہ اچھل پڑی۔۔ اور چونک کر دیکھا! مینا، نجمہ، ستارہ اور ہادیہ تھیں! ۔

"یہ کوئی طریقہ ہے مارے کے دل ہل کے رہ گیا۔!" روحی نے ... دل پر ہاتھ رکھ کر برا مانتے ہوئے کہا: "آواز نہیں نکلی منہ سے۔ گنوار کہیں کی!"

"ہاں۔ اب تو گالیاں دو گی۔ ارے کلیجہ تو میرا فق ہو گیا تھا یوں بیٹھے دیکھ کر۔ کہ ... اسی پوز میں عزرائیل علیہ السلام کو تو پیاری نہیں ہو گئیں؟" مینا الٹی بگڑ کے بولی۔ "مگر کیوں تم یا سادھے تھیں۔ اتنی آہٹ ہوئی ہمارے پیروں کی۔ عرصے بھی ایک بار کھنکھار لیئے مگر تم تو نہ سانس نہ ڈکار۔!"

وہ سب ہنستی ہوئی بڑی بے تمیزی سے صوفوں پر بیٹھیں کہ اسپرنگ بج اٹھے۔

"تنہائی ہوتی کی ایک الگ لذت نیارہو گی۔!" ہادیہ بولی: "سب کے چہرے فق ہوتے ہیں۔ اس کا کلیجہ فق ہوا:"

مینا ایار، ہمبر کی الّو ہے۔ اسے رہنے دو۔!" ستارہ نے کہا: "مگر تم سچ مچ

یہ بتا دُوں گی کہ ۔۔۔!"

"بڑی آئی ہے" بینا نے دانت پیسے "اور تم کون سی نانی دادی ہو بقراط سقراط کی۔ بوی دعا دیجیے کہ ساتھ لگی رہتی ہوں تبھی اس قابل ہو کہ شرفاؤں میں اٹھ بیٹھ سکو۔ سسرال میں نام پاؤ۔ بینا تمھاری سرپرست نہ ہوتی تو سب کی سب گھاس چرتی نظر آتیں"

"ہائے بینا۔ شرفاؤں نہیں۔ فقط شرفاء۔!" ستارہ پھر بولی۔ اس کی اور بینا کی ازل سے چلتی رہتی تھی۔

"وہ تو سب ٹھیک ہے۔ بینا جو فرمادے سب بجا درست۔!" صبیحہ بولی۔ "لیکن تم نے یہ نہیں سُنا کہ اس نے ہمیں سسرال میں نام پانے کی دعا دی ہو۔ ہائے اللہ۔ میں حیران ہوں۔ جب سے اس کم بخت کی منگنی ہوئی ہے۔ میکہ سسرال، دیور جیٹھ سے ہٹتی ہی نہیں۔ کتنا ارمان ہے۔ چھی چھی چھی!"

"ارے سسرال میں ٹھکانے لگے تو ہمیں بھی چین ملے۔ اب تو قسم سے سنتے سنتے کان پک گئے۔!" ستارہ بولی "اللہ کا احسان ہے کہ ۔۔۔!"

"اب دیکھو۔" بینا تڑپ کر اچھلی "یہ میرے چھیڑنے کی بات ہے کہ نہیں۔ ابھی اللہ اللہ کر کے بھولنے کی کوشش کی تھی کہ تم نے پھر نام لے کر مجھے ان کی یاد دلا دی گئی آج رات کی نیند بھی۔!"

"کیا نام لیا میں نے۔!" ستارہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

"احسان کہا تھا تم نے۔!" بینا نے غمگین ہو کر کہا "معلوم ہے کہ خدا بخشے یہ تمھارے بہنوئی کا نام ہے۔ ادب قاعدہ تو کم بختوں نے گھول کے پی ہی لیا ہے اتنی تمیز نہیں کہ خاص خاص نام احترام سے لیا کریں۔!"

"اے ہئے۔ بڑی تم۔ بڑے تمھارے احسان۔ اب وضو کریں گے نام لینے کے

لے۔" ستارہ نے ہاتھ نچایا۔" نیولے کی ایسی شکل ہے۔ منگنی کے دن کیا میں نے جھانک کے دیکھا نہیں تھا۔"

"بے چارے احسان بھائی زندہ ہیں اللہ انھیں رکھے۔" بادیہ بولی۔" ابھی سے ان کو خدا بخشے کہہ رہی ہے۔ یہی بڑی محبت ہے صاحب!"

"ان کی باتیں سنو!" نینا نے جواب دیا۔" ارے ساری مخلوق چرند پرند درند کو خداوند عالم بخش دے گا تو انہی بے چارے سے کون سا گناہ سرزد ہوا ہے کہ بخشے نہ جائیں گے۔ اللہ میاں کو کوئی بیر ہے ان سے؟"

"بڑے آئے ان کے دشمن!" ستارہ نے اسے زبان چڑھا دی۔

"درند پرند چرند میں احسان بھائی کون سے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں؟" جمیلہ نے ہنس کر پوچھا۔" یاد رہے کہ اس نے ان کا شمار انسانوں میں نہیں کیا۔ بخشش کے حقداروں میں اس مردی کو فقط درندے چرندے پرندے ہی یاد آئے!"

"تو غلطی کیا ہوئی۔ دیکھ لیا ہوگا کبھی گھاس چرتے یا ردی کاغذ چباتے ہوئے!" ستارہ نے کہا۔

"ارے ہاں۔ تو نے انھیں نیولے بھی تو کہا تھا۔ لو سنبھالو اب۔" یہ کہہ کر وہ ستارہ پر لپک گئی۔ ستارہ گدگدیوں سے بے حد ڈرتی تھی۔ جہاں کسی نے دور سے انگلی دکھائی اور یہ بھاگی۔ اب تو نینا نے اس کا کچومر نکال پھینکا۔ ستارہ چیخ رہی تھی۔ پناہ مانگ رہی تھی۔ بے تحاشہ ہنس رہی تھی۔ آخر اس نے دہائی دی۔

"تجھے احسان بھائی چرندے کی قسم۔ نینا اب بس کر!" اور ہاتھ جوڑ دیے۔

ان سب کا ہنسی اور چیخوں کے مارے برا حال تھا۔ خدا خدا کر کے یہ طوفان تھما۔ تب پھر جمیلہ نے پوچھا۔

"یہ تم لڑکیوں کی سب ایکا کر کے کیا یوں دنگل لڑنے آئی ہو۔ وہ ادھر بادل سے

ہنس رہی تھی۔ اندر اندر رشک کر رہی تھی۔ کیسی بے فکر، چونچال، تر و تازہ لڑکیاں ہیں اور ایک وہ خود ہے۔ فکروں پریشانیوں کے بوجھ تلے کراہ رہی ہے۔

"آخر کیا بات ہے۔ کس لیے میرے سر پر نازل ہو گئی ہو بے موقعہ۔ وجہ نہیں بتائی۔ پہلوانی شروع کر دی!"

"پہلے تم بتاؤ! تمہارا چہرہ کیوں اترا ہوا ہے" صبیحہ نے روحی سے پوچھا "پہلے اتنی بے فکر ہوا کرتی تھیں۔ پچھائی شکل لگ رہی ہے کیا!"

"نہیں تو۔ کچھ ایسی بات نہیں" روحی افسردگی سے مسکرائی۔

"دل کو دل سے راہ کا معاملہ معلوم ہوتا ہے!" بادیہ نے کہا "اب تو تمہارے منظورِ نظر صاحب بھی روز بروز دبلاتا بڑھتے ہیں۔ واہ واہ۔ عشق کا آزار!"

"کون؟ کسے کہہ رہی ہو؟" روحی کا رنگ پریدہ ہو گیا۔

"وہ شکیل جمیل صاحب!" صبیحہ بولی "ہم لوگ بزم ادب کی طرف سے افسانہ سنانے کی درخواست لے کے پہونچے تھے۔ جناب نے حضور صاف انکار کر دیا۔ فرمانے لگے نہیں لکھ سکتا نہیں سنا سکتا! آج کل کچھ پریشان ہوں۔ ہم سمجھ گئے کہ تمہاری سرکار میں دال نہیں گلی شاید!"

"ارے کیا بک رہی ہو صبیحہ" روحی نے کپکپاتے ہوئے لہجے میں کہا "کیسی دال اور گلنا کیسا۔ وہ فقط میرے کلاس فیلو ہیں اور کیا!"

"ارے اب کچھ چھپا نہیں ہے بیوی۔ سب لوگ جان گئے ہیں" بادیہ نے روحی کو اور پریشان کر دیا "بلکہ راشد، عظیم اور جانے کون کون تو کہتے بھی سنے گئے کہ حسن کے اپالو نے کبھی شکست نہ کھائی تھی۔ اب سعید صاحب کی صاحبزادی نے بالآخر گنجے پہ چھری چلا ہی دی!"

"سب بکواس ہے!" فینا نے روحی کا زرد پریشان چہرہ دیکھ کر کہا "یہ راشد

جب کسی سے جل جاتا ہے تو یونہی بکواس کرتا پھرتا ہے۔ میں سب جانتی ہوں۔ کسی سے کچھ بات چیت کرنے کا مطلب یہ کہاں نکلتا ہے کہ بس اس پر عشق کا بھوت سوار ہی ہو گیا ہے۔!"

اچھا تو پھر کیا بات ہے۔ روحی تم اداس کیوں ہو؟" ستارہ نے پوچھا۔

"عبید کا خط آیا تھا اسے میعادی بخار ہو گیا ہے۔ بس اس کی یاد آ گئی تھی!"
روحی نے فی البدیہہ جھوٹ لڑھکا دیا۔

"ہا۔ بے چارہ۔ جلد اچھا ہو جائے اللہ کرے۔!" ہادیہ بولی۔

اتنی بہت سی باتیں ہو لیں مگر جس مقصد کے تحت آئی تھیں وہی نہ کہا۔!"
ستارہ نے کہا۔

"کہیں چلنا ہے کیا!" روحی نے خشک لبوں پر زبان پھیر کر پوچھا۔

آج خالہ اماں گیارہویں کر رہی ہیں!" جیبہ بولی۔" تاکید کر دی تھی کہ اپنی سب سہیلیوں کو لے کر آنا۔ سو ہم نے پروگرام بنایا تھا کہ سب مل کے پہلے میٹنی شو دیکھنے۔ پیلس میں۔ بیجو باورا چل رہا ہے۔ وہاں سے سیدھے خالہ اماں کے ہاں پہنچ جاتے۔ آج چھٹی بھی ہے۔ کل سے پھر روز کی مارا مار شروع ہو جائے گی۔ کون سی ہمیشہ فرصت ملتی ہے؟"

بیلنس اچھا ہے۔!" نینا نے سنجیدگی سے کہا۔" پہلے پکچر دیکھنے کے بعد گیارہویں کی محفل اٹینڈ کرنے کا فائدہ یہ بھی ہے کہ اللہ میاں کھڑے کھاٹ فلم دیکھنے کا گناہ معاف کر دیں گے!۔ اچھا تو روحی پلیز گٹ اپ! لباس وباس بدلنے میں صرف آدھا گھنٹہ دے سکیں گے ہم!"

"منو کو بھنڈر بھجوا رکھا ہے۔ اس نے ہم سب کے ٹکٹ ایشو کر لیے ہوں گے!۔"
جیبہ نے کہا۔" اللہ۔ جلدی کرو۔ روحی۔ ان کم بختوں کی پہلوانی میں پہلے ہی بہت

سا وقت برباد ہو چکا ہے۔"

"آج تو مجھے معاف رکھو۔ پلیز۔ میں پہلے ہی فکر مند ہوں۔ پکچر تو روز کے ہیں پھر کبھی سہی۔ اور اپنی خالہ سے بھی معافی مانگ لینا۔ میرا کہیں آنے جانے کا جی نہیں چاہ رہا۔!" روحی نے کہا۔ جلیجہ نے بُرا تو بہت مانا۔ مگر روحی راضی نہ ہوئی۔ بالآخر یہ کہہ کر کہ اسے بہلا پھسلا کر لے آئے گی۔ نینا بھی ان کے ساتھ نہ گئی۔ ان سب کے رخصت ہونے کے بعد نینا نے سنجیدگی سے اس کی افسردگی کی وجہ پوچھی۔ نیلما بہت دیر کی دوست تھی۔ رازدار غمگسار تھی۔ مخلص تھی۔ محبت ہمیشہ ایک راز دار چاہتی ہے۔ چنانچہ روحی نے نینا کے سامنے دل کا لاوا نکال پھینکا۔ اور آخیر میں آنسو بہانے لگی!۔

"میں کسی کے ساتھ خوش نہ رہ سکوں گی نینا۔ نہ مصطفےٰ کے ساتھ نہ ناصر کے ساتھ۔ یہ دو بھوت ہیں مجھے ڈرا رہے ہیں۔ اگر ان میں سے کسی ایک کا پیغام بھی منظور کر لیا گیا تو میں سچ مچ خودکشی کر لوں گی!"

"اتنی بیبس ہو تم اپنی محبت میں روحی۔؟" نینا کو اس پر ترس آ رہا تھا۔

"ہاں نینا۔ تم نہیں جانتیں۔ میری کیا حالت ہے۔" روحی بولی۔ "میں اپنے دل کا حال کسی سے کہہ بھی نہیں سکتی مگر تم پہچانو۔

میری آرزو میرا مدعا کوئی اور اس کے سوا نہیں
وہ ملے تو کوئی مرض نہیں وہ نہیں تو کوئی دوا نہیں

"مگر۔ تمہارا یہ حال شکیل صاحب پر بھی ظاہر ہے کہ نہیں؟" نینا حیران تھی۔ "تم نے ان سے سب کچھ کہہ دیا ہے کیا؟"۔

"میں اپنی زبان سے کیا کہوں۔!"

"ارے پاگل تو پھر انھیں پتہ کیسے چلے گا؟"۔

"میں کیا کروں نینا۔ وہ تو اس رخ پر آتے ہی نہیں۔ اور مجھے یونیورسٹی میں کچھ کہنے سننے کا موقعہ ہی نہیں ملتا۔ دو تین مرتبہ باہر ملی تھی۔ وہ ڈیڈی کے دوست نے دیکھ لیا اور جا کے ڈیڈی سے لگا دی یہ بات۔ آج اسی بات پر وہ ناراض ہو رہے تھے"

"پھر؟۔ یہ بیل منڈھے کیسے چڑھے گی؟"

ان سے میں کیسے کہہ سکتی ہوں کہ خدا کے لیے میرا ہاتھ تھام لیجیے۔ نہیں! نینا میں مر سکتی ہوں مگر یہ بات نہیں کہہ سکتی۔ اس کے علاوہ ان کی سنجیدگی، متانت محتاط رہنے کا انداز میرے حوصلے اور پست کرتا ہے

ہاں۔ وہ پریشان تو رہتے ہی ہیں۔ بے چارے!۔

کیا مطلب؟"

تمھیں نہیں معلوم کیا؟۔

کون سی بات ہے!۔

"اے لو تمھیں خبر ہی نہیں۔ ان کی والدہ بے چاری بینائی سے محروم ہیں نا۔ کیا یہ بات کچھ کم دکھ کی ہے۔ پھر شکیل صاحب کے گھر میں کوئی بہن بھائی عزیز رشتے دار بھی نہیں ہے۔ یہی گھر جا کے ماں کی خدمت دیکھ ریکھ کرتے ہیں۔! ایسے حالات میں انسان کیسے بے فکر اور خوش رہ سکتا ہے"

"تمھیں کیسے پتہ چلا؟" لڑکی کے دل کو جیسے کسی نے شکنجے میں کس دیا۔

"مجھے بھی معلوم نہ ہوتا مگر ایک دفعہ میں اپنا ٹیمو لینے یا کسی اور کام سے وائس چانسلر کے اجلاس پر گئی تھی وہ مجھ سے باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں یہ اپنے شکیل صاحب بھی میگزین کا پروف انھیں دکھانے پہونچے۔ تبھی باتوں باتوں میں وائس چانسلر صاحب نے ان سے پوچھا تھا کہ اب آپ کی والدہ صاحبہ کی بصارت

کیسی ہے۔ آئی ڈراپس استعمال کر رہے تھے کچھ فرق ہوا۔ تب شکیل صاحب نے مایوس لہجے میں جواب دیا تھا کہ جی نہیں۔ آئی ڈراپس سے کچھ فائدہ محسوس نہیں ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے بس آپریشن ہی کو آخری علاج بتایا ہے۔ تو یوں مجھے ان کی والدہ کے نابینا ہونے کا علم ہوا تھا۔"

"مگر نینا تم نے مجھ سے آج تک یہ بات نہیں کہی۔!"

بہن مجھے کیا معلوم تھا کہ تم اس سے لاعلم ہو" نینا بولی "وہ اپنے ہم جماعت ہیں۔ زیادہ تر تمہی سے دوستی ہے۔ میں سمجھتی تھی کہ تمھیں یہ بات معلوم ہوگی!۔

نینا! ان کی امی سے ملنے کا میرا بڑا دل چاہتا ہے۔ آج اچھا موقعہ ہے۔ ممی کمشنر صاحب کے ہاں جا رہی ہیں۔ اتوار بھی ہے۔ چلو نا۔ ان کے گھر چلیں۔ ایک مرتبہ انھوں نے یونہی برسبیل تذکرہ بتایا تھا کہ مکہ مسجد کے قرب و جوار میں کہیں ہے آج مل آئیں ان سے۔ کل سے ہم پھر بزی ہو جائیں گے" اس نے خوشامدانہ انداز میں نینا کا ہاتھ پکڑ لیا۔

اللہ توبہ۔! نینا نے گال تھام لیے "آج نہیں۔ اگر وہ بھی گھر پر ہوئے تب سچ مانو کہ ان کی بے موقع سنجیدگی سے میں بہت ڈرتی ہوں۔ ہونٹ پر ہونٹ چپکائے یوں سنجیدہ نظروں سے دیکھیں گے جیسے کہیں کے عمر رسیدہ مانے ہوئے بزرگ ہوں۔!

اچھا ہاں۔!" وہ چونک کر روحی کو گھورنے لگی "یہ خالہ امی کمشنر صاحب کے ہاں کیوں جا رہی ہیں۔ مصطفٰے صاحب سے تمہارا رشتہ کرنے کے لیے؟ ہائے روحی سچ مچ ان سے تمہاری بات پکی ہوئی۔ تب؟"

مذاق ہے بات کیسے پکی ہو جائے گی۔! میں نہیں مانتی۔!

"ارے عزت اور آن کی خاطر یہ بڑے لوگ جان پر کھیل جاتے ہیں۔ روحی اس بھرے میں نہ رہنا"

وہ اگر اپنی عزت کی خاطر جان پر کھیل سکتے ہیں تو مجھے اپنی محبت کی خاطر جان پر کھیل جانے سے کس بیہودہ کا ڈر ...!" روحی بے حد سنجیدہ ہو رہی تھی۔

واہ بھئی۔ تمہاری محبت کا بھی جواب نہیں۔ شکیل کو تمہاری محبت کا علم ہی نہیں ہے اور تم یکطرفہ جان کی بازی لگائے بیٹھی ہو۔ بے چارے کو کم سے کم اطلاع تو دے دی جاتی!" بینا بولی۔

"کہہ چکیں میری آنکھیں جو کچھ انھیں کہنا تھا!" روحی بولی۔

بعض وقت ... اس لاسلکی پیغام میں گڑبڑ بھی ہو جاتی ہے۔" بینا ہنس کر بولی۔ "تمہاری پیغام رسانی انھوں نے ریسیو نہ کی ہو تو ...؟"

ایک تم ہی رہ گئی ہو میرا مذاق اڑانے کے لیے۔ واہ۔ کیا تقدیر ہے۔ جسے اپنا سمجھو وہی بیگانہ بنا جا رہا ہے!"

یا خدا۔ نہیں معلوم تھا کہ اتنی حساس ہو رہی ہو۔" بینا نے کہا: "میں تو چاہ رہی تھی کہ کچھ تو ادھر ادھر کی باتوں سے تمہارے دل پر رکھا ہوا بوجھ ہلکا ہو۔ ہاں تو۔ انھوں نے پیغام کا خاطر خواہ جواب دیا؟"

"معلوم نہیں بینا۔ میں کچھ نہیں جانتی!"

بینا کو روحی جیسی سیدھی سادی لڑکی کی اس انتہا پسندی جسارت انگیزی اور عزم پر حیرت ہو رہی تھی۔ "وہ کیونکر اپنے والدین کا مقابلہ کرے گی؟"

بینا بہت کچھ دم دلاسا دے کر رخصت ہوئی۔ شاید آمنہ بیگم بھی جا چکی تھیں۔ سعید صاحب تو پہلے ہی چلے گئے تھے۔ گھر بھر میں سناٹا پڑا تھا۔ کچن سے البتہ ملازموں کے ہنسنے بولنے اور برتنوں کی کھڑبڑاہٹ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

روحی کمرے سے نکلی! کچھ دیر بیٹھی ٹی وی کے غیر دلچسپ پروگرام دیکھتی رہی۔ پھر سعید صاحب کی خاص کرسی پر ٹک کر اخبار کا سنڈے ایڈیشن اٹھا لیا۔

دفعتہً اس نے دالان کے عین سرے پر کرسی کے بھاری قدموں کی آہٹیں سنیں اور مڑ کر دیکھا۔ مصطفےٰ اپنی پوری ملٹری وردی میں کھڑے تھے۔ بھاری بھر کم قد آور مرعوب کن روحی گڑبڑا گئی۔ اور اٹھ کھڑی ہوئی!۔

مصطفےٰ نے ایڑیاں بجا کر اسے سلامی دی۔! اور پھر یکبارگی ہنس دئے۔

روحی محجوب بھی تھی۔ گھبرا بھی رہی تھی۔ چپکے سے بولی: "بیٹھئے!"

"محترمہ روحی۔ کتنا فرق ہے۔ باہر کی اور اندر کی فوج میں۔ ابھی میں آدھی بٹالین کی پریڈ دیکھ کر اور سلامی لے کر آ رہا ہوں۔ لیکن یہاں مجھے آپ کو سلامی دینی پڑی۔ آپ خود مجھے پوری بٹالین معلوم ہو رہی ہیں۔ وہ آپ کے ہاں ظریف شاعر اکبر گذرے ہیں نا۔ انھوں نے کوئی مزاحیہ شعر اسی نوعیت کا کہا بھی ہے۔ آپ کو کچھ یاد ہے؟"

روحی نے رکھائی سے کہا: "آپ شاید ڈیڈی یا امی سے ملنے آئے ہیں مگر اس وقت دونوں ہی گھر پر نہیں ہیں۔ مجھے افسوس ہے۔ اور اب میں بھی یونیورسٹی کا کام کرنے جا رہی ہوں!۔ آپ اکیلے بیٹھ کے کیا کیجئے گا!۔

"لہٰذا میں چلتا پھرتا نظر آؤں۔ یہی مطلب ہے آپ کا؟"

"میں خود سے کیا کہوں۔!

"اچھا آپ چند لمحوں کے لیے تشریف تو رکھیے۔!" مصطفےٰ نے کہا۔ اور خود بھی آرام سے اسی کرسی پر بیٹھ گئے جس پر سے روحی اٹھی تھی۔ وہ ان کی استدعا پر بیٹھی نہیں۔ دور کھڑی رہی۔

"سنئیے۔ روحی۔! میں جان بوجھ کر چھٹی کے روز آیا ہوں تاکہ اکیلے میں آپ سے چند باتیں کر سکوں۔ پلیز آپ تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ تو جائیے!۔ میری خاطر۔!"

"میں آپ کے لیے چائے بنوا لاؤں۔!"

"مہربانی۔ شکریہ!" انھوں نے سر خم کر کے مسکرا کر کہا: "آپ اتنی زحمت نہ کیجئے۔ چائے

میں خود منگوائے لیتا ہوں۔ یہ کہہ کر پرانے زمانے کے بادشاہوں کی طرح تالی بجا کر نعرہ لگایا: کوئی ہے۔!" فوراً ہی صحن میں شمس الدین نمودار ہوا۔ مصطفیٰ نے دو انگلیوں کا اشارہ کر کے کہا: کافی۔ دو: پھر اس وقت تک ان دونوں نے کوئی بات نہ کی جب تک کہ کافی پی کر خالی پیالیاں میز پر نہ رکھ دیں۔ پھر مصطفیٰ نے بڑی شائستگی سے کہا: "آپ کو اندازہ نہیں ہو ارد حی کہ میں اس وقت کیوں آیا ہوں!"

"نہیں۔!" بڑی بے اعتنائی سے ردحی نے جواب دیا۔

آپ نے میرے پرزہ خط کا کوئی جواب نہیں دیا۔ کم سے کم اخلاقی حیثیت سے آپ کو اسے رد نہ کرنا چاہیے تھا!"

کیا اخلاقی حیثیت سے آپ کا وہ پرزہ میرے ہاتھ میں تھما دینا مناسب تھا؟"

ردحی کو غصہ آنے لگا!۔

"پھر میں کیا کرتا۔ میری جان کی گاہک محترمہ ریاست جہاں بیگم میری ہمزاد بنی ہوئی تھیں۔ خدا جانے کیوں انہیں یہ خوش فہمی ہو گئی ہے کہ میں عقل کا اتنا اندھا ہو جاؤں گا کہ ان کی سی اُمّ الجاہلین کو اپنا شریک زندگی بنا کر ساری زندگی جہنم بنا لوں گا۔! آپ سے اس وقت زبانی گفتگو کا کوئی موقع ہی نہ مل سکا تھا۔ بہت مجبور ہو کر کاغذی سہارا لیا تھا۔ اور اب تک اس سہارے کے مستقل و مستحکم ہونے کا انتظار کرتا رہا ہوں۔ جو صرف انتظار ہی رہ گیا۔ لہٰذا آج ہمت کر کے آپ کے دولت خانے تک آ گیا ہوں کہ آپ سے جواب لے سکوں!"

"جواب!" ہونٹ کاٹتے ہوئے ردحی نے کہا: میرا جواب یہی ہے کہ آپ کی اس فضول حرکت نے آپ کی رہی سہی عزت اور وقعت میرے دل سے نکال دی ہے۔ میں ابھی زیر تعلیم ہوں۔ اور اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتی!"

"کیا تم سنجیدہ ہو ردحی۔؟" وہ فوراً بے تکلفی پہ اتر آئے۔ ذرا توقف چوکہ

یہ دن میں نے کتنے کرب و عذاب سے کاٹے ہیں۔ تمہارا تصور ایک لمحہ کے لیے بھی مجھ سے جدا نہیں ہوا۔ میں نے باجی سے بھی کہا ہے کہ روحی مجھے بہت پسند ہے۔ اور وہ غالباً آج کل میں تمہارے ہاں آئیں گی۔ روحی! خدا کے لیے سوچو کہ تم اتنی بے دردی سے مجھے کیوں ٹھکرا رہی ہو۔ اگر میری وہ ناعاقبت اندیشانہ حرکت تمہیں اتنی ناگوار ہوئی ہے تو میں معافی مانگتا ہوں۔ اب جو کچھ مجھے کہنا ہوگا۔ وہ میں زبانی کہوں گا۔

"نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ زبانی یا تحریری کچھ کہنے کی زحمت آپ گوارہ نہ کیجیے گا! ہر حال میں میرا جواب انکار میں ہوگا!"

لیکن آخر تم ۔۔۔!"

مصطفےٰ کچھ کہنے چلے تھے۔ مگر روحی اب آپے سے باہر تھی وہ اٹھی اور انکی بات سنے بغیر اپنے کمرے میں جاکر دروازہ بند کرلیا۔ مصطفےٰ کب تک بیٹھے رہے اور کب گئے اس نے نہ دیکھا اسکا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ کیا اس کی تقدیر کوئی گل کھلانے والی تھی۔ آج ہی آمنہ بیگم ان کے ہاں بات کرنے گئی تھیں۔ اور آج ہی یہ حضرت اس سے آخری بات کرنے آئے تھے۔!

تھوڑی دیر بعد اس کا دماغ ٹھکانے آیا تو اس نے اپنے آپ سے عہد کیا۔ اگر اسے تشکیل نہ مل سکا۔ تب وہ کسی کی بھی نہ ہوگی۔ ساری زندگی یونہی بسر کر دے گی!!۔

اس روز انفرادی سے ایک ہنگامی بزمِ ادب کے بعد چھٹی ہوگئی۔ اور یونیورسٹی تقریباً خالی ہوگئی۔ روحی کا حال تو یہ تھا کہ اسے تعلیم سے برائے نام دلچسپی بھی نہ رہ گئی تھی۔ وہ صرف تشکیل کو دیکھ کر اپنی تشنگی کو سیراب کرنے جاتی تھی! اور اب اس کے ذاتی معاملات میں کر اسے اس سے زیادہ ہمدردی ہو گئی تھی! لیکن وہ اس سے کچھ پوچھتے یا کہتے

ڈر رہا تھی۔ شکیل کی گمبھیر سنجیدگی اسے اب گستاخی کی اجازت نہ دیتی تھی۔ ا۔ ایک عجیب سی ذہنی خلفشار تھی جو اسے بے چین کر رہی تھی۔ بینا نے اسے خاموش دیکھ کر کہا "گھر چلنا نہیں ہے۔ اچھا ہے ایک چھٹی مل گئی۔ امتحان سر پر آ گیا ہے۔ اسٹڈی کرنے کے لیے وقت ۔ !"

"تم جاؤ" ردحی نے کہا "میں یہ مضمون میگزین کے لیے دے کر اور سیمنار سے کچھ کتابیں لے کے جاؤں گی۔ مجھے ابھی دیر ہے !۔

بینا چلی گئی۔ تب وہ سنسان لاؤنج طے کر کے میگزین روم تک آ گئی۔ اس کے ہاتھ پیر برف ہو رہے تھے !۔ یقیناً کمرے میں شکیل موجود تھا۔ اور ہاف ڈور کے نیچے اس کے قدم دکھ بھی رہا تھا !۔ لیکن چپ رہا۔ ! بالآخر ردحی نے اِدھر اُدھر دیکھ کر چپکے سے دروازے پر انگوٹھا بجایا ۔ !

"آیئے !" شکیل کی سنجیدہ گونجیلی آواز سن کر ردحی نے دروازہ کھولا اور اندر پہونچی ۔ !

"اوہ ۔ آپ ہیں ۔ ردحی ۔ !" وہ جیسے زبردستی مسکرایا تھا "کہیئے ۔ کیسے زحمت کی"

"شکیل صاحب آپ تو مجھ سے اس طرح گفتگو کرتے ہیں۔ جیسے میں کوئی اجنبی ہوں یا میری پوزیشن بہت بلند ہے۔ جس کا ادب و احترام آپ پر لازم ہے" وہ بولی اور اس کی اجازت کے بغیر کرسی سرکا کر بیٹھ گئی !۔

وہ محتاط انداز میں مسکرایا "آپ کے خیال میں ایسا نہیں ہونا چاہیئے !"

"بالکل نہیں !"

"کیوں ۔ ؟"

"کیونکہ ہم اتنے دنوں سے ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔ یہ مدت کیا اجنبیت اور غیریت کو ختم کرنے اور یگانگت کو پیدا کرنے کے لیے کافی نہیں ہے" ردحی مدہم

کے ڈھیر کی طرح پگھلی جا رہی ہے۔ شکیل پر نظریں پڑی تھیں۔ اور اس کے حسن نے اس کے ان جذبات کو بھی برانگیختہ کرنا شروع کر دیا تھا جو بجانے کیا تھے جنہیں روحی خود بھی سمجھ نہ سکی تھی!۔

"آپ مجھ سے بے حد تکلف برتتے ہیں" وہ پھر ابل پڑی: "ابھی تک آپ کو میرے سلوک کا اندازہ نہیں ہوا۔ میں۔۔!"

"میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں روحی۔۔!" اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر پیپر ویٹ کو کاغذ پر بجاتے ہوئے کہا: "آپ مجھ سے بڑی اپنائیت برتتی ہیں۔ آپ کی دوستی پر مجھے واقعی فخر ہے۔ ایسے عمدہ مخلص اور محبت کرنے والے کسی کو ملتے ہی کہاں ہیں!"

"زبان سے کہنے سے کیا ہوتا ہے!" روحی بولی۔

شکیل اس کی طرف دیکھ کے مسکرایا: "اور میرا عمل اس قول کی تردید کرتا ہے؟"

"بالکل!"

"میں تو نہیں سمجھتا!"

"آپ نے اپنائیت کا جواب دیا ہی کب ہے؟"

"میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھ رہا روحی!"

"میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھ سے بالکل تکلف نہ برتیں۔ ساتھ پڑھتے لکھتے ہوئے چھ سات ماہ گزر گئے۔ میں نے اپنی تمام باتیں آپ سے کہہ دیں مگر آپ نے ان پریشانیوں یا فکروں کے بارے میں مجھ سے ابھی تک کچھ بھی نہیں کہا!"

"ہاں۔۔!" وہ پھر بے پناہ سنجیدہ ہو گیا! "میں اسے مناسب نہیں سمجھتا! یہ ضرور جانتا ہوں کہ کہنے سننے سے فکر و غم کا بوجھ بٹ جاتا ہے۔ لیکن روحی یہ تو ظلم ہے نا کہ میں اپنے دماغ کا بار ہلکا کرنے کی غرض سے اس بار کو آپ کے دماغ پر لاد دوں میں اسے خود غرضی سمجھتا ہوں!"

"تو پھر دوستی کس چیز کا نام ہے؟" روحی نے اسے گھورا۔ وہ اب بھی سر جھکائے میز پر ایک انگلی سے طبلہ بجا رہا تھا۔ اور سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ مگر روحی کی ایک ایک نظر اس کے خط و خال کی بلائیں لے رہی تھی۔ ایسے خوبرو بہت کم ہوتے ہیں! پھر اسے دیکھتے ہی اسے کچھ شبہ سا ہوا کہ اسی خط و خال سے مشابہ اس نے کسی اور کو بھی دیکھا تھا۔ مگر کہاں۔ یہ اسے یاد نہ آسکا!۔

دفعتہً شکیل نے سر اٹھایا اور اس کی متبسم نظریں روحی کی نظروں سے مل گئیں۔ ایک لمحہ کا وہ سحر۔ جو صدیوں کے تاثر پر محیط تھا۔ بہت سے ان کہے جذبوں کو معنے عطا کر گیا!۔ روحی کی پلکیں کانپیں۔ اس نے نظریں نیچی کرلیں۔ شکیل نے بھی خود کو سنبھال لیا۔

"میں جانتا ہوں کہ آپ کے دل میں میری بہت قدر ہے۔ اور سچ مانیے کہ یہ بھی مجھے احساس ہے کہ ایک بندے کو خدا و ند بنانے والی آپ پہلی ہستی ہیں۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کے اس احسان و قدر افزائی کا بدلہ میں آپ کو کس طرح دے سکتا ہوں!"

روحی کے لب کانپنے لگے "شکیل صاحب! آدمی اگر کچھ دینے پر آجائے تو بہت کچھ دے سکتا ہے!"

"ایک تہی دست و بے بضاعت آدمی بھی؟؟!"

"ہاں!"

"اس کے پاس کیا ہوتا ہے روحی جو وہ کسی کو دے سکے!"

"کچھ نہ کچھ تو ہوتا ہی ہے!"

"احساس تشکر کے سوا اور کیا؟" شکیل نے جواب دیا۔ وہ روحی کے محسوسات کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگوں سے بہت کچھ واضح ہو رہا تھا۔ وہ تو خود سر تا پا ایک معنی خیز جذبہ بنی ہوئی تھی۔ لیکن شکیل انجان ہی بنا رہا۔ وہ خوب

بتا تھا کہ اپنی زبان سے کچھ کہنا اسے غلط فہمی میں مبتلا کرنا تھا۔ جبکہ وہ اس کی زبان پر زندگی ہار سکتی تھی۔ لیکن اسکے حالات، ہر جذبے کو کچل دینے اور فنا کر دینے کا تقاضہ کر رہے تھے۔

پھر شکیل نے دوسری باتیں چھیڑ دیں۔ "یونیورسٹی خالی ہو چکی ہو۔ آپ گئی نہیں کچھ کام تھا؟"۔

"نہیں! کچھ نہیں!"۔

"تو پھر مجھے اجازت دیجئے گا؟"

"گھر جا رہے ہیں آپ؟"۔

"نہیں مجھے کچھ دوسرے کام ہیں۔ گھر تو میں رات تک پہونچتا ہوں!" وہ اٹھ کھڑا ہوا اور مسکرا کر روحی کو دیکھا۔ "چلیے۔ کیفے ٹیریا سے کچھ چائے وائے پیتے ہوئے چلیں آپ کو آپ کی کار تک پہونچا بھی آؤں!"

"شکیل صاحب!۔ آپ کب تک مجھے اس احترام و تعظیم سے مخاطب کرتے رہیں گے؟" روحی بولی۔

"یہ تو مجھے کرنا ہی ہے" شکیل نے کہا۔ "آپ ایک قابل قدر لڑکی ہیں۔ اتنا اچھا پڑھتی ہیں۔ آپ کا ادبی ذوق شاعرانہ مزاج بہت بلند ہے۔ آپ ایک رحمدل اور نیک طینت مخلص لڑکی ہیں۔ اور بھی بہت سی صفات آپ میں ایسی ہیں کہ آپ کا احترام ہر چھوٹے بڑے پر سب پر لازم آتا ہے!"

"لیکن کیا یہ غیریت نہیں ہے!" روحی کے لہجے میں احتجاج تھا۔ فریاد تھی۔ اس سے میں انکار نہیں کر سکتا!" اس نے ہنس کر اعتراف کیا۔

"اور آپ سے نہیں اپنا سمجھ کر منتی ہوں!"

"اچھی بات ہے روحی۔ اگر آپ یہی چاہتی ہیں۔ تو پھر آپ کی خوشی مجھے منظور ہے۔

آئندہ اسی طرح آپ کو مخاطب کروں گا۔ جیسی آپ کی خواہش ہے !۔

شکریہ! شکیل صاحب !" روحی نے کہا اور ایک ادھوری سی سانس لی " آپ نے میری خواہش کو پذیرائی کی۔ ویسے میں شاید کبھی نہ کہہ سکوں گی کہ میں آپ سے کیا چاہتی ہوں ! اچھا سلام ۔!" اس نے عجیب طرح سے شکیل کو دیکھا۔ خفیف سا مسکرائی ۔ اور میگزین روم سے نکل کر چلی گئی !۔

شکیل سن سا کھڑا رہ گیا !۔

روحی نے آج طے کر لیا تھا کہ وہ شکیل کی امی سے ضرور ملے گی !۔ جب سے نینا کے ذریعہ اسے ان کی معذوری کا حال معلوم ہوا تھا وہ اپنے دل میں ایک چبھن ایک عجیب سی کسک محسوس کر رہی تھی !۔ اس نے یونیورسٹی کی حدود سے نکل کر ایک آٹو رکشا کرایہ کیا اور نینا کے بتائے ہوئے پتے پر ہولی۔ اس کی کار ہمیشہ تین بجے آتی تھی۔ آج چونکہ غیر متوقع چھٹی ہو گئی تھی لہٰذا روحی کو خوب موقع ملا تھا ! گھر پر وہ کہہ سکتی تھی کہ چونکہ کار نہیں آئی تھی لہٰذا وہ اس کا تھوڑی دیر انتظار کر کے آٹو پر آئی ہے !۔

پندرہ بیس منٹ بعد آٹو بتائے ہوئے پتے پر جا کر رک گیا !۔ چھوٹا سا مکان تھا گھٹیے رنگ کا بوسیدہ بدرنگ کواڑ۔ نیم باز۔ ایک فرسودہ سا پھولدار پردہ پڑا ہوا ہوا سے ہلکورے لے رہا تھا کرایہ ادا کر کے روحی نے دروازے پر دستک دی۔ دو لمحول بعد ایک دبلی پتلی سانولی سی قبول صورت لڑکی نے پردے سے سر نکال کر پوچھا۔

آپ کون ہیں ؟" اور ٹھٹھک کر رہ گئی ۔ اسے توقع نہ تھی کہ ایک حسین اپ ٹو ڈیٹ لڑکی بھی اس گھر پر آ سکتی ہے !۔

دیکھئے ! شکیل صاحب کا مکان کیا یہی ہے ؟" روحی نے پوچھا اور سوچنے لگی کہ یہ لڑکی کون ہو سکتی ہے !۔

جی ہاں !" لڑکی نے کہا " مگر اس وقت وہ گھر پر نہیں ہیں !۔

"میں ان کی امی سے ملنا چاہتی ہوں!"

"بیٹی۔ کون آیا ہے" نزدیک سے ایک معمر نسوانی آواز سنائی دی: "تم کس سے باتیں کر رہی ہو!۔"

"آیئے۔ اندر آجایئے!" لڑکی نے کہا اور روحی کے گھر میں داخل ہونے کے بعد دروازہ بھیڑ کے پردہ برابر کر دیا۔ پھر وہ اسے ساتھ لے کر فاطمہ بیگم کے پاس پہونچی! انھیں دیکھ کر روحی کے دل پر گھونسہ سا پڑا۔ بڑی بی کیا تھیں۔ کسی عظیم عمارت کا عظیم کھنڈر تھیں۔ نجانے اپنے عالم شباب میں کیسی رہی ہوں گی۔ اب بھی حسین لگ رہی تھیں۔ شہابی رنگت تھی۔ خوشنما اونچی ناک، پان کھائے ہوئے سرخ باریک لب۔ موٹی موٹی غلافی آنکھیں۔ جو حیران حیران سی آہٹوں کی سمت دیکھ رہی تھیں۔

جب ماں ایسی ہے تو بیٹے کو بہر حال اسم با مسمیٰ ہونا ہی چاہئے۔ روحی نے سوچا اس نے بڑی اپنائیت سے انھیں سلام کیا اور پاس بیٹھ گئی۔

"بیٹی تم کون ہو" وہ بولیں "میری آنکھیں نہیں ہیں۔ میں تمھیں دیکھ نہیں سکتی۔ مگر میں نے تمھیں آواز سے بھی نہیں پہچانا۔ معاف کرنا بی بی کچھ اپنے بارے میں بتاؤ۔!"

چنانچہ روحی نے اپنے بارے میں تفصیل سے بتا دیا۔ وہ چپ چاپ سنا کیں اور سفینہ حیرت سے دم بخود روحی کو تکا کی! وہ ایک غریب باپ کی بیٹی تھی۔ اسے دو وقت کی روٹی بھی مشکل سے نصیب ہوتی تھی۔ سونے چاندی عمدہ ملبوسات کے اس نے خواب بھی نہیں دیکھے تھے۔ اسے تعجب تھا کسی لڑکی کے پاس اتنے خوبصورت کپڑے بھی ہو سکتے ہیں۔ گلابی قمیص جس پر موہوم سی روپہلی لکیریں بس جنبش ہی کرنے سے دکھائی دیتی تھیں۔ گلابی ہی چوڑیدار پاجامہ اور گلابی ہی جاب ساڑ دوپٹہ

جس پر بڑے بڑے پھول بکھرے ہوئے تھے!۔ اس کے گلے میں موٹی سی طلائی زنجیر پڑی تھی۔ کانوں میں جگر مگر کرتی بالیاں اور ایک کلائی میں چار سونے کی چوڑیاں دوسری کلائی میں نازک سی گھڑی۔ اس کے لباس سے ایک حسین مہک یوں پھوٹ رہی تھی کہ اس کے کمرے میں آتے ہی فضا بھی معطر ہو گئی تھی!۔

روحی بھی بڑی متاسفانہ نظروں سے یہاں وہاں کا جائزہ لے رہی تھی! سامان کچھ ترتیب کا ضرور تھا مگر سلیقے سے سیٹ نہیں کیا گیا تھا۔ بڑے کمرے میں ایک طرف میز رکھی تھی جس پر متعدد کتابیں بے ترتیب بکھری پڑی تھیں۔ میز کے نیچے جوتے اور سلیپریں ٹیڑھی میڑھی رکھی تھیں۔ میز کے پاس دیوار پر ایک اسٹینڈ لگا تھا۔ جس کی کھونٹیوں سے مردانہ ملبوسات کچھ میلے کچھ صاف لٹک رہے تھے!۔ دوسری طرف ایک مسہری بچھی تھی۔ اس پر کم قیمت سا بیڈ شیٹ بچھا ہوا تھا! مسہری کے بائیں طرف لمبا سا دریچہ تھا۔ جو غالباً باہر کی طرف کھلتا تھا۔ اس کے آدھے حصے پر پھیلا ہوا پردہ ہواؤں کی اٹکھیلیوں سے ہل رہا تھا!۔ اس کمرے کے سامنے دوسرا دروازہ دکھائی دے رہا تھا!۔ اندر باہر بچھے ہوئے پلنگ، اور معمولی سے سامان کی جھلک یہیں سے نظر آرہی تھی!۔ جیسے جیسے وہ ادھر ادھر نظریں گھمارہی تھی۔ اس کا دل دکھ سے بھرا آرہا تھا۔

دفعتاً اس کی محویت کو ناظمہ بیگم کی آواز نے توڑ دیا: "بیٹی! اللہ تمھیں ہمیشہ خوش رکھے۔ تم مجھے دیکھنے آئی ہو۔ مگر میری بچی۔ میں تمھیں نہیں دیکھ سکتی۔ بس ہلکی سی جھلک تمھاری نظر آرہی ہے۔ بہت پیاری پیاری لگ رہی ہو۔ جیسی تم خوبصورت ہو۔ اللہ تمھارا نصیب بھی ویسا ہی کرے!"

"مجھے بھی آپ سے ملنے کا بڑا جی چاہتا تھا۔ امی آپ کسی دن شکیل صاحب کے ساتھ ہمارے ہاں آئیے نا۔ میری امی سے مل کر آپ بہت خوش ہوں گی۔ شکیل صاحب

کو ہمارا گھر معلوم ہے۔ آپ ان سے کہیں گی تو وہ آپ کو ہمارے ہاں ضرور لے آئیں گے!
روحی یکایک انھیں بے پناہ چاہنے لگی تھی!۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ آگے
بڑھے اور ان کے سینے سے لگ جائے۔ ناظمہ بیگم ہنسنے لگیں: تم اتنی پیاری ہو۔
ایسی ہی تمھاری امی بھی ہوں گی۔ مگر میری معذوری دیکھ رہی ہو (روحی بیٹی)
میرے لیے کہیں جانا بڑا مشکل ہے۔ البتہ تم اپنی امی کو یہاں ضرور لاؤ۔
اگر وہ آنا پسند کریں۔!"

اتنا کہہ کر انھوں نے آواز دی: "سفینہ! بیٹی تم ہو یہاں؟؟"
جی خالہ اماں۔" سفینہ نے چونک کر جواب دیا: کہیے۔!"
"بیٹی میں اپنی بچی کو کھانا کھلائے بغیر جانے نہ دوں گی۔ مجھے تو پتہ نہیں۔ تم نے
کیا پکایا ہے:"

سفینہ ایک نگاہ روحی پر ڈال کر زیر لب بولی: خالہ اماں۔ آلو مٹر کی تہری ہے۔
اور دہی اور ٹماٹر کی چٹنی۔ رات کی کچھ فیرنی بھی رکھی ہے!"
نہیں نہیں۔!" روحی نے جلدی سے کہا: میں اب چلوں گی امی۔ آپ کھانے کا
تکلف نہ کیجیے۔ اس طرح تو مجھے پھر آنے میں شرم لگے گی۔ میں پھر آؤں گی تب۔"
نہیں بیٹی۔ یہ نہیں ہو سکتا!" ناظمہ بیگم نے کہا: "ایک بجا ہے اس موسم میں دوپہر
کی تمازت محسوس ہو رہی ہے!۔
"جی ہاں۔ آپ کا خیال صحیح ہے۔ ایک بجنے والا ہے!" روحی نے اپنی کلائی پر
نظر ڈال کر جواب دیا۔ سفینہ اٹھنے لگی: "خالہ اماں۔ بچھاؤں دستر خوان۔ آپ بھی ساتھ
کھائیں گی نا؟"
میرا تو صبح ہی کا ناشتہ سینے پر دھرا ہے۔ انھوں نے کہا: کھانی ہوں ایک جگہ بیٹھی
رہتی ہوں۔ کھانا ہضم کیسے ہو۔ تم لوگ کھاؤ۔ میں تب تک ظہر کی نماز پڑھ لوں۔ ہاں چائے

مجھے دینا اگر بناؤ۔!"

کھانا بہت سادہ مگر لذیذ تھا۔ کھانے کے دوران سفینہ اس سے باتیں کرتی رہی۔ روحی کو وہ بہت بدھی سادی لگی۔ اس نے اپنے گھر کے کچھ حالات بھی کہہ دیے تھے۔ روحی کا خلوص اس کے دل میں گھر کر گیا تھا!

پھر بعد نماز ناظمہ بیگم (بی) چائے پی کر بیٹھ گئیں۔ سفینہ کو اس کا بھائی بلا لے گیا۔ تب ان دونوں میں تفصیلی گفتگو ہوئی۔ روحی نے اگر اپنے حالات کھول کر کہے۔ اس کے ماں باپ اسے کتنا چاہتے ہیں۔ اس کا بھائی باہر پڑھتا ہے۔ ابو کے چچا ہیں۔ اتنی خالائیں ہیں۔ یہ اور وہ۔ سب کچھ کہہ دیا پھر اس نے بڑی دلسوزی سے پوچھا۔

"آپ کا کوئی عزیز قریب ایسا نہیں ہے۔ جو آپ کے ساتھ رہ سکے۔ مجھے یہ دیکھ کر بیحد صدمہ ہوا ہے کہ آپ تنہا رہتی ہیں۔ اب سفینہ تو ہمیشہ آپ کے پاس نہیں رہ سکتیں یہ شکیل صاحب اکیلے ہی ہیں۔ ان کے اور بھائی بہن نہیں ہیں؟"

آہ بھر کر انھوں نے کہا۔ ہاں بیٹی۔ اب تو اسے اکیلا ہی سمجھو۔ ایک بھائی تھا وہ جانے کہاں چلا گیا۔ بہن اللہ نے دی نہیں! اس کی اور میری تقدیر میں بس تنہائی ہی لکھی ہے۔ اسے بھی میری معذوری اور اکیلا پن برا محسوس ہوتا ہے۔ مگر کیا کرے۔ اسے اپنے کاموں سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ نجانے کہاں کہاں کے ٹیوشن کر رکھے ہیں۔ اپنی پڑھائی سے فرصت نصیب ہوتی ہے۔ دوسروں کو بھی پڑھاتا پھرتا ہے۔ ہمیشہ کہتا ہے کہ اگر یہ ٹیوشن ہی روزی کا ذریعہ نہ ہوتے تو میں آپ کے پاس بیٹھا رہتا۔ اب بڑی مجبوری ہے بیٹی۔ رتی بھر سکون چین میرے بچے کو نصیب نہیں! نجانے کب اللہ میاں ہم پر رحم کرے گا!"

"وہ ٹیوشن کرتے ہیں!" روحی نے گلوگیر آواز میں پوچھا۔ شکیل کی محرومی دنیا بھر کی شکل اس کی نگاہوں میں پھرنے لگی۔! یہ وجہ تھی اس کی ہمہ گیر خاموشی اور افسردگی

کی۔ اس کے دل پر برف سی جمنے لگی!"

میری فکر اسے پریشان کیے رہتی ہے" ناظمہ بیگم کو ایک مخلص ہستی ملی تھی۔ جوان کا دکھ سن رہی تھی۔ غم کا بوجھ بٹا رہی تھی۔ جیسے وہ ان کی بہت پرانی آشنا ہو چنانچہ انھوں نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا" میں اس سے ہزار کہتی ہوں کہ بیٹا میری فکر چھوڑ۔ میرا کیا ہے۔ بہت سی گزر چکی ہے۔ رہی سہی یہ بھی گزر ہی جائے گی۔ مگر اس سے میرا اندھاپن برداشت نہیں ہوتا۔ اسی کوشش میں لگا رہتا ہے کہ کسی طرح میری آنکھوں کا آپریشن ہو جائے اور میری زندگی کا یہ اندھیرا کسی طرح دور ہو سکے! اسی فکر میں اپنا چین آرام حرام کیے رات گئے تک جانے کہاں کہاں پڑھاتا پھرا کرتا ہے۔ سچ مانو بیٹی۔ کہ میرا دل اتنا دکھتا ہے۔ مگر میں اپنے بچے کے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔! رات کو تھک کے آتا ہے تو پھر مجھ سے سر کھپانے بیٹھ جاتا ہے! میں تو کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ کچھ کھا کے سو رہوں۔ اسے کسی طرح سکھ تو ملے!"

"آپ الٹی بات سوچتی ہیں امی۔ آپ نے اگر خدا نخواستہ اگر یہ قدم اٹھالیا تو پھر وہ پاگل ہو جائیں گے۔ آپ کبھی یوں نہ کیجئے گا!"

ہمت تو ہو انی!" ناظمہ بیگم نے کہا" کہتی بہت کچھ ہوں۔ کرنے کی طاقت نہیں۔ کروں بھی کیسے۔ اپنی جان اپنے ہاتھوں لوں۔ مطلب یہ کہ یہاں بھی دوزخ وہاں بھی دوزخ"

"امی کچھ پتہ ہے آپ کو۔ آپریشن کتنے میں ہوگا؟" روحی نے پوچھا۔ سیدھی سادی خاتون نے کہا" اس کا حساب مجھے نہیں معلوم بیٹی۔ آج کل ان ڈاکٹروں نے اپنی فیس کتنی بڑھا رکھی ہیں۔ کچھ تذکرہ کر رہا تھا شکیل کہ تین ساڑھے تین ہزار سے کم خرچ نہ ہوگا! بس اسی کے جوڑنے میں سر گاڑی پیر پہیہ کیے دن رات ایک کیے دے رہا ہے۔ یہ اس کی محبت ہے۔ اب بھلا میں دنیا دیکھ کر کیا کروں گی۔

بہت دیکھ لی ۔!"

روحی کے ہاتھ اپنے کانوں پر گئے ۔ پھر نظر اپنی طلائی زنجیر پر پڑی ۔ جس میں ننھا سا یاقوت جڑا جگنو آویزاں تھا ! ۔ اس کے لبوں پر آسودہ مسکراہٹ بکھر گئی ۔

دو بجنے والے تھے اس نے ناظمہ بیگم سے اجازت چاہی !۔

"بیٹی شام کی چائے پی کے جائیں !"

امی میں گھر پر کچھ کہہ نہیں آئی " اس نے کہا ! " اب تو میں نے آپ کا گھر دیکھ لیا ہے نا ۔ برابر آیا کروں گی !۔ اب مجھے جانے دیجئے !"

"اچھا بیٹی ۔ پھر آنا ضرور تم سے مجھے بہت محبت ہو گئی ہے ۔ دل کھنچ رہا ہے ۔ تمہاری طرف ! " وہ اسے رخصت کرنے اٹھیں ۔ اور ٹٹول کر آگے بڑھنے لگیں ۔

" ارے آپ کہاں دروازے تک تکلیف کریں گی ۔ آپ یہیں رہئے میں دروازہ بھیڑ کے چلی جاؤں گی ۔ یہ آپ کی سفینہ کب آئیں گی ؟ "

اب وہ صبح ہی کو آئے گی !۔

مطلب یہ کہ شام تک آپ اکیلی بیٹھی رہیں گی !۔

ہاں بیٹی ۔ مجبوری ہے کیا کروں !۔

امی کاش میں ہمیشہ رہ سکتی آپ کے پاس " اس کے دل کی آواز زبان پر آ ہی گئی !۔

" خدا تمہارا نصیبہ بلند کرے روحی بیٹی تم نے اتنا کہہ دیا ۔ یہی بہت ہے ۔!"

اچھا امی ۔ تو پھر ۔ سلام ۔ خدا حافظ ۔!"

ایک کام میرا کرتی جاؤ ۔ میری چاند ۔! " وہ جیسے گھگھیائی تھیں " یہ میری چھڑی پاندان اور تسبیح اندر کے کمرے میں پلنگ پر رکھ دو ۔ اور مجھے بھی پہنچا دو ۔ پھر تم جاؤ بیٹی ! "

اس نے تینوں چیزیں سمیٹیں اور اندر کے کمرے میں آ گئی!۔ یہاں کی حالت اور سقیم تھی۔ پلنگ کی چادر پر سلوٹیں پڑی تھیں۔ ایک طرف نجانے کب کی چائے کی پیالیاں رکھی تھیں۔ وہ چادر درست کر کے سیدھی ہوئی تو بڑی میز کے اوپر شیشے کی تصویر پر نظر پڑی اور وہ یکبارگی مبہوت ہو کر اسے دیکھتی رہ گئی۔ کیسا شاندار اور منفرد حسن تھا کہ دیکھے دیکھے دل نہ بھرے!۔ کچھ لمحوں تک وہ مذبذب سی کھڑی رہی پھر جھٹ کرسی پر پاؤں رکھ کر میز پر چڑھی اور لپک کر تصویر اتار لی۔ اسے اپنی کتابوں تلے رکھ کر ہانپتی ہوئی سانسوں کو قابو میں کر کے باہر نکلی!۔ اور ناظمہ بیگم کا ہاتھ تھام کر کچھ کہے سنے بغیر انھیں اندر چھوڑ آئی۔! پھر وہ بے چاری کچھ کہتی ہی رہ گئیں مگر چور کا دل کتنا۔! کتابیں سنبھالیں انھیں بڑی جلدی میں الوداع کہا اور باہر بھاگ گئی!!۔

کمشنر صاحب کی بیوی نے آمنہ بیگم کو چھوٹی بہن بنایا تھا۔ جیسے گہرے مراسم کمشنر صاحب اور سعید صاحب میں تھے۔ اس سے کہیں زیادہ خواتین میں تھے دونوں خاندان ایک دوسرے کے رنج و راحت میں برابر کے شریک رہتے تھے! اور ان سب میں کسی کے قول و فعل کے رد و قبول کا کوئی سوال ہی نہ تھا! چنانچہ روحی کے سلسلے میں بڑی امیدیں لے کر آمنہ بیگم، بیگم ہاشم سے ملی تھیں۔ اور دیر سے بیٹھی فضول باتیں ان میں ہو رہی تھیں کہیں زمانے کی بے راہ روی کا رونا، کہیں نوجوان نسل کی گمراہی اور لامذہبیت پر لعن طعن، کہیں اپنوں کے بیگانہ بن جانے کا دکھڑا۔ بیگم ہاشم کی شروع سے عجیب عادت تھی کسی کا خیال کیے بغیر پھلا کے باتیں

کرتی تھیں۔ اکثر آمنہ بیگم نے دل میں کہا تھا کہ ان کی چنگھاڑتی ہوئی آواز ہاشم صاحب کیونکر برداشت کرتے ہیں۔!

اب بھی وہ قہقہہ آمیز لہجے میں چلا رہی تھیں "اپنے ہاشم بھائی کو پوچھ رہی ہو؟ ارے یہ کہو کہ کبھی وہ تم کو بھلے آدمیوں کی طرح گھر پر بھی دکھائی دیے ہیں۔ آج نگوڑ ماری چھٹی ہے مگر دوست احباب پکڑ لے گئے ہیں ہرن کے شکار پر۔ میں گھنی ہوں۔ اپنی حیوانی خوشی کے لیے کسی بے زبان کی جان لینا کہاں کی انسانیت ہے۔ منہ کے ایسے چٹخارے بھی مجھے پسند نہیں۔ چار بوٹیاں نوچنے کے لیے پہاڑ سے جانور کو دھائیں سے مار گرائیں "

مصطفےٰ ابھی گئے ہیں ساتھ میں۔ نظر نہیں آرہے۔!" آمنہ بیگم ہر موضوع سے گھوم پھر کر مصطفےٰ پر آجاتی تھیں۔ کسی طرح تو اصلی مقصد کے آغاز کا سرا مل سکے۔

نہیں مصطفےٰ نہیں گیا۔!" انھوں نے کہا پھر قہقہہ لگا دیا۔" وہ تو کہتا ہے کہ بندوق کی گرج سے پناہ مانگ کر امن دسکون کی جگہ سکھ کی سانس لینے آتا ہوں۔ اب یہاں مجھ سے کوئی بندوق رائفل کی بات نہ کرے۔! ابھی کچھ دیر پہلے تک سا تو یہیں تھا شاید کہیں چلا گیا ہو!۔ دو منٹ بنا رکھے ہیں نا یہاں بھی!"

دفعتہً وہاں بھاری بھر کم ریا سمن جہاں بیگم چائے کی ٹرے لوازمات سے لبریز لیے نمودار ہوئیں۔ چونکہ دونوں ہاتھ مصروف تھے لہٰذا دور تک سر جھکائے اور دانت نکال کر آمنہ بیگم کو سلام کیا۔ وہ تو حیران ہی رہ گئیں۔ یہ ابھی تک یہیں جمی ہیں!۔

ٹرے انھوں نے تخت ہی پر رکھ دی۔ اس کی پرواہ نہ کی کہ تخت پر کلی کی سی سفید چاندنی بچھی تھی!۔ بیگم ہاشم کے چہرے پر ناگواری کی شکنیں نمودار ہو گئیں۔ انھوں نے گھڑکی دینے کے لہجے میں کہا۔

"اٹھاؤ یہاں سے کشتی۔ میز پر رکھو۔ اگر اس کے پیندے میں کچھ لگا ہو تو چادر ے

میں بھی لگ جائے نا۔ کتنی بار تم سے کہا ہے ریاست! اب تو کچھ تمیز سیکھ لو معلوم ہوتا ہے کہ تم اپنے گھر میں ہمیں خوب ٹھکواؤ گی!"

انھوں نے کشتی اٹھا کر میز پر رکھی اور میز یوں گھسیٹ کر ان کے سامنے کی کہ کیتلی سے رنگ اور دودھ دانی سے خاصہ دودھ چھلک کے میز پر گرا۔ پیالیاں الگ باجہ سا بجا کر رہ گئیں!۔ انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اپنے آنچل سے سب کچھ صاف کر دیا اور قبل اس کے کہ بیگم ہاشم پھر چیختیں۔ یہ جا وہ جا۔

انھوں نے سر تھام لیا: "دیکھا آمنہ۔ یہ خواہ مخواہ کا عذاب ہے۔ پروردگار کا سچ کہتی ہوں۔ ماشاء اللہ بیس سے اوپر ہے۔ مگر نہ تمیز نہ سلیقہ۔ میں تو جانوں کہ دماغ کا کوئی پرزہ کم ہے۔ توبہ!"

ہاں بری لگتی ہیں ایسی حرکتیں۔! آمنہ بیگم نے کہا: "آپ کی بھاوج نے انھیں کیسا بے نتھا بیل بنا رکھا ہے۔ اب اللہ رکھے بیاہ ہو گا تو سب کتنا نام رکھیں گے۔" وہ آگے جھک کر چائے بنانے لگیں!۔ بیگم ہاشم رازداری سے آواز کا حجم کم کر کے بولیں: "ایک مزے کی بات تم نے نہیں سنی شاید۔! غضب خدا کا۔ آمنہ یہ اور بڑی بھابی اپنے مصطفےٰ پر دانت لگائے ہوئے ہیں!۔ بھابی تو مجھ سے کہہ بھی چکی ہیں کہ میری بچی بہت بھولی بھالی زمانے کی اونچ نیچ سے بے خبر ہے۔ کسی غیر میں اس کا گزر مشکل سے ہو گا۔ تمہی کیوں نہ مجو سے بیاہ دو۔! گھر کی گھر میں رہے گی۔ تمیز سلیقہ سکھا دو۔"

"سچ مچ؟" آنکھیں پھیلا کر آمنہ بیگم نے کہا۔

ہاں۔!" انھوں نے بھی آنکھیں پھاڑیں: "سچ مچ نہیں تو اور کیا۔ ؟ ارے کوئی مقابلہ ہے اس جاہل گنوار کا میرے مجو کے ساتھ۔ وہ پڑھا لکھا اپٹوڈیٹ خاندان اتنا بڑا افسر ہے۔ اس کے لیے میں کوئی اس کے برابر کی بچی ڈھونڈوں گی۔!"

آمنہ بیگم کا دل دھڑکا۔ "کہیں دیکھی بھی ہے آپ نے کوئی لڑکی؟"

"ابھی نہیں!"

"اے آپا۔ پھر کب دیکھئے گا! یہی تو موقعہ ہے۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ پانچ سال بعد مصطفےٰ نے وطن کی صورت دیکھی ہے۔ اب آپ جھٹ پٹ ان کے سہرا لپیٹ ہی دیجئے پھر چلے جائیں گے تو جانے کب واپس ہوں گے۔"

"ہاں بیوی سوچتی تو ہوں!" انہوں نے بڑی گہری سانس لی اور چپ ہو رہیں جان پر کھیل کر آمنہ بیگم نے کہا۔ "آج کل شادیوں کا مسئلہ بڑا سنجیدہ بنا جا رہا ہے۔ پہلے تو یہ تھا کہ رشتے گھر ہی میں ہو جاتے تھے۔ نہ چھان پھٹک کی ضرورت نہ غارت گئے لین دین کا کمینہ پن لڑکے نیلام ہونے لگے ہیں۔ ان کو ہاتھ پسار کر مانگتے شرم نہیں آتی اب دیکھئے کہ ہماری بھاوج ہی نے منھ پھیلا کر ایک لاکھ طلب کر لئے۔!"

"روحی کے لئے۔؟" کچھ اچھل کر بیگم ہاشم نے حیرت کا اظہار کیا۔

"روحی کی تو ابھی ان سے کوئی بات ہی نہیں ہو سکی آپا۔" آمنہ بیگم بولیں، "سعید صاحب کہتے ہیں کہ میری بچی بکاؤ نہیں ہے۔ اچھے رشتے کی تلاش میں ہیں۔ کوئی شریف جانا بوجھا لڑکا ہو جسے لڑکی سے لگاؤ ہو لڑکی کی دولت سے نہیں۔ اب آپ دیکھئے کہ ایک ہی تو بچی ہے۔ ہمارا سب کچھ تو اسی کا ہے کیا ہم اسے یونہی ننگی بوچی نپٹا دیں گے مگر حد سے زیادہ کون دے سکتا ہے۔ لڑکے والوں کی طلب تو جھتی ہی نہیں آج کچھ مطالبہ ہے تو کل کچھ اور سمجھتے ہیں کہ لڑکی کی خاطر برابر ان کا منھ جھلتے رہیں گے اسی لئے غیروں میں بات چلاتے ڈر سا لگتا ہے۔ مطلب یہ کہ گاڑی بھر جہیز بھی دیجئے اور پھر بھی لڑکی سکھ چین سے نہ رہے۔"

"یہی تو ہو رہا ہے آج کل!" انھوں نے تائید کی۔ "اور پھر یہ بدنصیب لڑکیاں جو لالچی کنگلوں کے گھر کی بہوئیں بن گئی ہیں کاہے کے لئے زندہ پھونکی جا رہی ہیں۔

تو بہ سوچ کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں!"

"آپ کی نظروں میں کوئی ایسا لڑکا نہیں ہے جو روحی کے قابل ہو سکے!" آمنہ بیگم نے کہا۔ "سچ مانیے آپا کہ اسکی ہمیں زیادہ فکر ہے۔ ماشاء اللہ بیس کی ہے اس کے ساتھ کی بہن صالحہ کی بچی ہے۔ اس کی پچھلے سال شادی ہو گئی۔ اب اس کی گود میں دو مہینے کا پھول سا بچہ ہے ــ! سسرال میں خوش رہتی ہے۔ اللہ کرے روحی کا نصیب بھی جلدی جاگے ــ!"

روحی تو پڑھ رہی ہے ابھی ــ!"

"ہاں" آمنہ بیگم نے جواب دیا۔ "مجبوراً پڑھ رہی ہے اس کے ابا تو کہتے ہیں کہ اچھا رشتہ ملے گا ہم بیاہ دیں گے۔ تعلیم ایسی ضروری نہیں ہے۔ بی اے ہو گئی تھی گھر پر رہ کر کیا کرتی۔ ہم نے بھی کہا کہ اچھا ہے اس کا جی لگے گا۔ ایم اے میں داخلہ دلوا دیا ــ!"

"برا کیا!"

"برا کیا۔!" آمنہ بیگم نے حیرت سے دہرایا۔

"ہاں اور کیا۔" بیگم ہاشم بولیں "اب زیادہ نہ پڑھواؤ گھر بھال کے کچھ خانہ داری سکھاؤ۔ یہی کام آنے والی چیز ہے۔ زیادہ تعلیمیافتہ لڑکیوں کو زیادہ پڑھے لکھے لڑکے نہیں ملتے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ برابر کے رشتے کی کھوج میں بیچاریاں بوڑھی چلی جاتی ہیں۔ عمر بڑھتی رہتی ہے سر سفید ہو جاتا ہے۔ منھ پر خانہ بننے لگتا ہے آخر میں یہی انجام ہوتا ہے کہ خود کمائیں، بڈھے ماں باپ کو کھلائیں اور حسرت و آرزوؤں کا پٹارہ لئے قبر میں سو جائیں۔۔"

سچ ہے آپا بالکل سچ ہے۔ آپ نے تو جیسے تصویر کھینچ کے رکھ دی!"

آمنہ بیگم نے کہا۔ "تو پھر بتائیے کوئی اچھا سا رشتہ اگر آپکی نگاہ میں ہو بعید صاحب

نے آج مجھے امی نے آپ کے پاس بھیجا ہے اور کہلوایا بھی ہے کہ روحی کی ایک ماں آپ بھی ہیں اچھے پیام کی نشاندہی کیجئے ہم اسے جلدی سے بیاہ دیں۔"

آمنہ بیگم کو سو فیصدی یقین تھا کہ وہ کہہ دیں گی۔ گھراتی کا ہے کے لئے ہوا اپنا مجوّ تو ہے ہی! سوچنا سمجھنا کیا۔ بیاہ دو اس سے۔

مگر ان کے یقین کے برخلاف بیگم ہاشم نے کہا۔ "یہ سچ ہے روحی تمھاری جیسی لڑکی ہے میری بھی ویسی ہے۔ اس کا کاج کر کے مجھے بہت خوشی ہوتی۔ سعید میاں نے کہلوانے کی بات بھی نہ تھی۔ پر کیا بتاؤں آمنہ میری نظر میں ایسا کوئی لڑکا نہیں ہے جو سعید کا داماد بننے کے قابل ہو۔ وہ انجینیر صاحب کا بیٹا سلمان بہت اچھا تھا۔ تب اس پر کسی کی نگاہ نہ گئی۔ اور اب تو وہ بھی بیاہ گیا۔ اچھا خیر ابھی تو لڑکی پڑھ رہی ہے۔ تم نے کہہ دیا ہے۔ ذہن میں رکھوں گی اللہ چاہے گا مل جائے گا۔"

پھر انھوں نے اپنی ملازمہ کو آواز دی۔ وہ آئی تو بولیں۔ "یہ برتن اٹھالے جاؤ۔ اور ہاں سنو۔ خانساماں نے کھانا تیار کر دیا کہ نہیں۔" آمنہ بیگم سے مخاطب ہوئیں "بیوی اب تم رات کا کھانا کھا کے جانا۔ کوفتہ پلاؤ پکوایا ہے کمشنر صاحب نے سعید بہت شوق سے کھاتا ہے۔ ٹفن اس کے لئے بھی لیتی جانا۔ شاید لوکی کی کھیر بھی رکھی ہے۔"

آمنہ بیگم کا دل پاتال میں اترتا جا رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے مایوسی کا زبردست شاک دل کے دورے پر اثر ڈال دے گا۔ ان کے ہر بن مو سے پسینہ جاری تھا! وہ تو پوری امید لے کر آئی تھیں اور یہ سوچ رہی تھیں کہ واپس جا کر سعید صاحب کو ہونہار لائق عہدیدار داماد کے ملنے کی خوش خبری سنائیں گی۔ یہاں تو خوش رنگ امیدوں اور سنہری تمناؤں کی ساری بساط الٹ

گئی تھی۔ انھیں یوں لگ رہا تھا کہ جیسے انھیں روحی کے بیوہ ہونے کی خبر ملی ہو!

سعید صاحب پر بھی اس کورے انجان پن کا بڑا مایوسانہ ردعمل ہوا۔ وہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ اب بیوی کوئی جانفزا خبر لاتی ہوں گی۔ سر تھام کر بولے۔

"تو اب میں سمجھے لیتا ہوں کہ ان سے کوئی امید رکھنا فضول ہے وہ اپنی بھتیجی ہی سے مصطفےٰ کو بیاہیں گی۔ یہ ہم نے پہلے ہی نہ سوچ لیا کہ ان کی بھتیجی گھر میں ہے بھلا اس کے ہوتے وہ کسی غیر لڑکی کے بارے میں کیوں سوچیں گی۔"

"دنیا بھر کی برائیاں کرتی ہیں بھتیجی ہی کون سی سلیقہ مند ہے" جل کر آمنہ بیگم نے جواب دیا "ساری زندگی مصطفےٰ کی ضیق میں گزرے گی۔"

"یہ ہمارے تمھارے سوچنے کی بات نہیں ہے۔"

"میں تو سمجھتی تھی کہ وہ چھوٹتے ہی مصطفےٰ کے لئے کہہ دیں گی!" آمنہ بیگم پر بہت اثر تھا۔ "وہ لوگ آپ کے مدتوں کے دوست ہیں۔ کیا اتنا بھی خیال نہیں کہ دوست کی لڑکی اپنے بھانجے سے بیاہ دیں۔ یہ منھ دیکھنے کی دوستی کس کام کی۔ اب میں ان کے ہاں کسی دکھ سکھ میں نہیں جاؤں گی۔"

"یہ ہماری ناسمجھی تھی کہ ہم نے امید لگائی! اپنے پھر اپنے ہوتے ہیں ہم غیر ہیں۔" سعید صاحب نے کہا۔ "خیر! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں خدا کوئی نہ کوئی سبیل نکال ہی دے گا۔ ایک مرتبہ تم اپنے برادر معظم کے ہاں بھی ہو آؤ۔ دیکھیں انکا کیا خیال ہے۔ ادھر میاں کی بات چیت اگر کہیں نہ چلی ہو تو ٹھیک ہے!"

"ہونہہ! کیا ایک ایک سے بھیک مانگنے جاؤں۔" وہ بگڑ گئیں۔ "آپ ہی کسی دوست کے کان میں بات کیوں نہ ڈالیے۔"

"ڈالی ہے بہتیروں کے کانوں میں مگر ابھی تک کسی کے کان پر جوں نہیں رینگی ہے"

سعید صاحب نے جواب دیا۔

"بیگم! مجھے اندیشہ ہے" انھوں نے آواز کو سرگوشی میں تبدیل کر کے کہا۔ "روحی کئی شکیل کا نام لے چکی ہے۔ اس کی تعریف بھی بہت کرتی رہتی ہے۔ خدانخواستہ ایسا نہ ہو کہ کہیں بالا بالا وہی سب کچھ ہو جائے جس کی آپ نے پیشین گوئی کی تھی۔"

"تمہارے کہنے سے مجھے خیال آیا" سعید صاحب سنبھل کر بیٹھ گئے "کیوں نہ ہم ان میاں شکیل ہی کو اپنے ہاں بلا کر دیکھیں۔ آخر ہیں کیسے صورت شکل، عادات و اطوار بات چیت، تعلیمی قابلیت بزرگوں سے پیش آنے کا انداز یہ سب دیکھ لیتے ہیں ایک مرتبہ۔ کیا حرج ہے؟ اگر کچھ معقول ثابت ہوئے تو پھر اللہ کا نام لے کر ان کے بڑوں سے گفت و شنید کریں گے کیا رائے ہے؟"

آمنہ بیگم کی نظروں میں مصطفےٰ کا شاندار سراپا، ان کی متبسم شکل ان کا گھر بار پھر رہا تھا۔ بددلی سے انھوں نے کہا۔

"بلا بھیجئے۔ مگر کیا کہہ کر بلائیے گا! آپ کی پوزیشن اتنی بڑی ہے اور وہ ابھی لڑکا ہے۔ طالب علم! کیا کہیں گے اس سے کہ کیوں بلایا ہے۔؟"

"بہانہ کیا" سعید صاحب نے کہا "بس یہی کہہ دیں گے کہ ہم روحی کے رفیقوں کو دیکھنا چاہتے تھے کوئی نذر نیاز کر ڈالو۔ روحی کے پروفیسروں اور ساتھیوں کو مدعو کر لیں۔ اکیلے شکیل ہی کو مدعو کرنا تو واقعی نامناسب ہے۔!"

"آپ کی مرضی۔ اب کی اتوار کو کر دوں گی گیارھویں شریف!" یہ کہہ کر وہ اٹھ گئیں سعید صاحب کے پاس کوئی ملاقاتی آ گیا۔ وہ بھی باہر چل دیئے!

انھیں خبر نہ تھی کہ ان کی عدم موجودگی میں مصطفےٰ آئے تھے اور روحی کے نامناسب سلوک سے بہت دل برداشتہ رنجیدہ واپس گئے تھے۔ روحی نے

جان بوجھ کر ماں کو اطلاع نہ دی۔

مصطفےٰ بہت زندہ دل، خوش مزاج، ہنس مکھ اور مخلص آدمی تھے۔ اداسی اور افسردگی ان سے دور بھاگتی تھی۔ جب بھی برسوں بعد گھر آتے۔ گھر میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی۔ ہنسنا ہنسانا، لطیفے سنانا، جنگ کے تجربات بیان کرنا اور دھوم مچانا بس یہی ان کے مشاغل رہتے تھے۔ بچے بڑے سب انھیں بہت چاہتے تھے۔ بیگم ہاشم ان پر جان چھڑکتی تھیں کیوں، وہ انکے بے یار و مددگار بھانجے تھے۔! نہ ان کے ماں باپ زندہ تھے نہ کوئی بھائی بہن موجود تھا۔ خود مصطفےٰ کو بھی یہی معلوم تھا کہ جب وہ بچے تھے تب ہی کسی حادثے میں ان کے والدین جاں بحق ہو گئے تھے۔ انھوں نے آنکھ کھولی تھی ماں کے روپ میں بیگم ہاشم کو دیکھا تھا اور ہاشم صاحب کو باپ کی جگہ پایا ان کی محبت اتنی بے پایاں تھی کہ کبھی مصطفےٰ کو اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ کیا ماں باپ اس سے بڑھ کر محبت کر سکتے تھے۔ کیا چیز ہوتی ہے والدین کی محبت یہ انہیں انہی دونوں سے معلوم ہوا تھا جب بھی وہ طویل مدت کے بعد آتے بیگم ہاشم سینے سے لگا کر منھ چومتیں اور ہاشم صاحب بھی ہر طرح کی خاطر کیا کرتے۔ ہاشم صاحب کا صرف ایک بچہ تھا ننھا عاصم۔ وہ ان کے گلے کا ہار ہو جاتا اور مصطفےٰ آتے آتے اس کے لئے جانے کیا کچھ لے کر آتے۔

ہر بار مصطفےٰ کی آمد و رفت کسی خاص واقعہ کے بغیر ہوا کرتی تھی۔ لیکن اب کی مصطفےٰ کی زندگی ایک ہلچل سے آشنا ہو گئی انھوں نے اپنے گھر میں روحی کو دیکھا اور اسے پسند کرنے لگے تھے۔ ان کی تمام زندگی خشک، روکھی پھیکی گزرتی جا رہی تھی۔ عمر کے لگ بھگ اٹھائیس تیس ہو چکے تھے لیکن کبھی بیگم ہاشم نے ان کے مستقبل کے بارے میں نہ کچھ سوچا تھا نہ ان سے گفتگو کی تھی۔ مصطفےٰ

اگر جرأت ہوتی۔ کیا ان کی شادی بیاہ کا کوئی خیال انھیں نہیں آتا؟ اپنے منہ سے کچھ کہتے مصطفےٰ کو حجاب ہوتا تھا! سچ تو یہ تھا کہ انہوں نے کبھی اس نظر سے کسی لڑکی کو نہیں دیکھا تھا۔ ایک صاحبزادی بیجاپور کے گنبد کی نقش نظر بھی آئی تھیں تو ایسی کہ لڑکی کی صنف ہی سے انھیں نفرت دلا دی تھی! ہمیشہ کسی نہ کسی بہانے سے سر پہ سوار اپنی جاہلانہ باتوں سے بیزار کرنے والی، اپنے ڈیل ڈول سے ڈرانے والی محترمہ ریاست جہاں بخیال خود ان کی منسوبہ و محبوبہ بن بیٹھی تھیں۔

مصطفےٰ کو تفریح کا شغل ہاتھ آیا تھا۔ انھیں خواہ مخواہ چھیڑ کے انکی بے سر و پا گفتگو سنتے اور ہنستے تھے۔ مگر اب۔ ایک اداسی کا غلاف تھا جو ان کے دل پر منڈھ گیا تھا۔ اب ان کا جی نہیں چاہتا تھا کہ کسی کے ساتھ بات کریں ہنسیں بولیں یہ کسی لڑکی کی بداخلاقی اور بے رخی کا تجربہ بڑا حیران کن اور روح فرسا تھا لیکن کیوں تھا؟ انہوں نے اپنا جائزہ لیا۔ کیا کمی تھی ان میں۔ صورت، سیرت اور عادات سب پسندیدہ تھیں ان کا یہ زعم باطل نکلا تھا کہ صنف مخالف آنکھ بند کرکے ان پر لٹو ہو سکتی تھی۔

روحی سے ایک دل شکن انکار سننے کے بعد ان کا دل نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس سلسلے میں بیگم ہاشم سے کچھ کہیں سنیں۔

روحی کے بارے میں بیگم ہاشم نے بہت کچھ بتایا تھا۔ سیدھی سادی تھی پر محبت تھی۔ بسلیقہ تھی لیکن یہ سب کچھ غلط ثابت ہوا تھا۔

انکا دل اب بھی روحی کی محبت سے سرشار و معمور تھا۔ کیا ہوا اگر وہ ان کی خشک زندگی میں بہار کا خوشگوار جھونکا بن کر آجائے گی۔

مگر یہ ناممکن لگ رہا تھا اور اداسی و کبیدگی کے دھندلے ابر نے مصطفےٰ کو ڈھانپ لیا تھا۔ سب سے پہلے ان کی افسردگی بیگم ہاشم ہی نے محسوس کی لیکن وجہ نہ

پوچھی جس کے مصطفےٰ آرزومند تھے! ان کے دل میں ایک تکلیف دہ ٹیس اٹھی۔ اگر حقیقی ماں ہوتی تب بھی اس کا سلوک ایسا ہی ہوتا۔ پتہ نہیں۔ ماں کی ممتا انھوں نے دیکھی کہاں تھی

البتہ کمشنر صاحب نے ضرور پوچھ لیا۔ "کیوں بیٹا کوئی پروگرام اب نہیں ہے کیا دیکھ رہا ہوں گم صم سے بیٹھے سوچا کرتے ہو۔ کیا بات ہے؟"

"جی کوئی بات نہیں۔" وہ ہنسنے لگے! جوں جوں روانگی کی تاریخ نزدیک آتی ہے دل پر ایک افسردگی سی چھانے لگتی ہے۔ آپ سب سے جدائی۔ وہاں کا اکیلا پن آپ سب وہاں بہت یاد آتے ہیں انکل۔"

"بیٹا شروع میں ہی کمیشن لینے سے روکا تھا تم ماشاء اللہ ایم۔ ایس۔ سی تھے یہیں کوئی عمدہ ملازمت مل سکتی تھی تم نے کہا تھا کہ تم شاگردوں کو اپنا دماغ نہیں کھلا سکتے۔ مجھے بھی تمہارے جانے کے بعد تمہارا خیال ساری ساری رات سونے نہیں دیتا اکیلے ہو کیا کھاتے پیتے ہو۔ دکھ سکھ ہماری پریشانی کہہ کر نہیں آتی خدا نہ کرے کہ کبھی طبیعت ناساز ہو تو کون اپنا پاس ہوگا؟ بیٹا یہ تمہارے چار ہزار ماہوار تمہاری تنہائی کے مقابلے میں کوڑے کرکٹ سے زیادہ نہیں ہیں۔!"

"پھر اب میں کیا کروں انکل۔ مصطفےٰ نے کہا۔ میں اپنی سروس سے خود بھی بہت بیزار ہوں۔ اب میں آپ کے پاس رہنا چاہتا ہوں۔ کوئی ترکیب بتایئے انکل!"

"ریزائن کر کے نہیں آسکتے؟" کمشنر صاحب نے پوچھا۔ مصطفےٰ نے اس سوال پر حیرت سے ہنس کر انھیں دیکھا پھر جھینپے سے کہا۔

"نہیں انکل! وہاں ریزائن کا سوال نہیں۔"

"پھر کیا کرو گے۔؟"

"چلا جاؤں گا انکل" مصطفےٰ نے کہا۔ "جب دل گھبراتا ہے تو ایسے بے بنیاد سوال کرنے لگتا ہوں۔ ورنہ مجھے معلوم ہے۔ فوجیوں کا مقدر کیا ہوتا ہے وہ جو کسی نے کہا ہے کہ آدمی بلبلا ہے پانی کا۔ اس کی صحیح تعبیر فوجیوں ہی کی زندگی میں نظر آتی ہے۔ کسی محاذ پر لگا دیے جاتے ہیں پھر ان کی قسمت۔ یا تو زندہ واپس آ گئے یا پھر تابوت پر کندہ نام پتے کے ساتھ نقش

"بیٹا توبہ کرو کیسی دل ہلانے والی باتیں کرتے ہو۔" بیگم ہاشم نے دخل دیا۔ "اللہ تمہاری عمر بڑی کرے۔ میں تو چاہتی ہوں کہ تم کبھی یہاں مستقل آؤ تو پھر تمہاری شادی بیاہ کا سلسلہ شروع کروں۔" وہ عجیب سے ہکلائے ہوئے لہجے میں بولیں۔

"نہیں باجی۔ شادی بیاہ کا نام نہ لیجئے" وہ ایک دبی آہ بھر کر بولے "ہم لوگوں کی شادی وادی کیا۔ ابھی ہیں ابھی نہیں۔ خواہ مخواہ ایک بیوہ کو پیچھے ——"

اچانک بیگم ہاشم انھیں سینے سے لگا کر رو پڑیں "نہیں میرے بچے ایسا نہ کہہ۔ تجھے نہیں معلوم میں میرے لئے کیا کیا چاہتی ہوں دل بھاری نہ کر۔ بیٹے ایک دن آئے گا جب میں ترے سر سہرا باندھوں گی! دل کے ارمان نکالوں گی ابھی تو میں مجبور ہوں اور بہت مجبور!"

"اچھا اچھا۔" مصطفےٰ نے بوکھلا کر ان کے آنسو پونچھنے شروع کر دیے ان کی سمجھ میں اپنی باجی کی گریہ وزاری کی وجہ نہ آئی۔ وہ اسے وفور محبت و فرط جذبات کا نتیجہ سمجھے اور ان کا سر اپنے سینے سے لگا کر الٹی دلدہی تسلی کرنے لگے! دیر تک یہ طوفان تھما۔

تنہائی میں بہت چپکے سے کمشنر صاحب نے بیوی سے کہا "یہ سلسلہ آخر کب

تک چلے گا۔ تم نے اس سے بہت کچھ چھپا رکھا ہے لیکن ایک دن تو اسے حالات سے آگاہ کرنا پڑے گا۔ وہ کہے گا کہ آپ نے اب تک یہ سارا گورکھ دھندہ مجھ سے پوشیدہ کیوں رکھا تھا تب کیا جواب ہو گی اسے۔ میں کہتا ہوں سکینہ! حقیقت سے اسے آگاہ کر دو پھر وہ جو کچھ مناسب سمجھے وہ اپنے لئے کرے۔"

"چپ رہیئے" بیگم نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ "اور پھر کبھی یہ بات زبان پہ نہ لائیے گا۔ میں اس کی پرسش کا کوئی جواب نہیں دے سکتی۔ جب وہ دو سال بعد یہاں آئے گا۔ تب میں اس سے کہہ دوں گی کہ وہ جہاں چاہے شادی کرے۔

"دو سال کی شرط کیا ہے؟" حیران ہو کر کمشنر صاحب نے پوچھا۔

"تب تک روحی اور ریاست دونوں اپنے گھروں کی ہو جائیں گی۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ میں تمہیں بڑا وسیع الظرف روشن خیال سمجھتا تھا کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ خدانخواستہ وہ کسی ہیچ خاندان کا ہے یا پھر مسلمان نہیں ہے؟"

"آپ نہیں سمجھے۔ میں عبد صاحب اور ریاست کی ماں کی جوابدہی سے بچنا چاہتی ہوں بس۔ یہ میں نے کب کہا کہ مجو مسلمان نہیں ہے؟"

تو پھر روحی سے اس کا پیوند کیوں نہیں لگ سکتا؟" کمشنر صاحب کی آواز میں غصہ تھا۔

"آپ سب کچھ سمجھتے بوجھتے ایسی بات پوچھتے ہیں؟" بیگم نے کہا۔ "آخر ہمیں اپنے کفو میں پیوند تلاش کرنے کا حکم ملا ہے کہ نہیں؟"

دیکھا دو بھی" کمشنر صاحب بولے "آج کل بین جاتی شادیاں ہو رہی ہیں مسلمان مسلمان سب برابر ہیں۔ تم روحی سے اس کا بیاہ کر دو۔"

"یہ آپ کی مرضی ہے۔"

"ہاں بالکل ہیں اب اس کی محرومی اور اداسی برداشت نہیں کر سکتا تم نے اپنے بچپن سے یہ کر اب تک پالا پوسا ہے تبھی اس کے جذبات و محسوسات سے آگاہ نہیں ہو۔ کتنے تعجب کی بات ہے سکینہ! ابھی تو لوگ کہتے ہیں کہ اپنی اور غیر کی اولاد میں فرق ہوتا ہے! تم اسکے یہاں رہتے تک اس کا پیغام لے کر جاؤ۔ مجھے پورا یقین ہے کہ سعید ہرگز انکار نہ کرے گا۔ بس فوراً شادی کا انتظام کرو۔"

"پھر آگے چل کر کوئی بات تو ایسی نہیں ہو جائے گی کہ ہم پر آنچ آئے۔"

"کس کی مجال ہے کہ ہماری طرف انگلی بھی اٹھا سکے۔" کمشنر صاحب غرائے۔

"آپ نے ایک اہم بات کی طرف غور نہیں کیا۔" بیگم ہاشم کی آواز بیماروں کی سی ہو گئی! چنانچہ وہ متفکرانہ نظروں سے بیوی کو دیکھنے لگے ـــ انہوں نے قریب کھسک کر رازداری سے کہا۔

"جب نکاح کی نوبت آئے گی تب مصطفےٰ کے والد کا کیا نام لکھوایئے گا۔؟"

"والد کا نام!" کمشنر صاحب کی آواز بھی لڑکھڑا گئی ــ "ہاں یہ بات تو میں نے سوچی ہی نہ تھی۔"

"کک۔ کیا۔ ایسے اتفاقی موقع پر کوئی شخص اپنا نام نہیں لکھا سکتا؟" بیوی نے پر امید ہو کر پوچھا۔

اتنی دور تک اصلاحی مسئلہ مسائل مجھے معلوم نہیں ہیں سکینہ! کمشنر صاحب نے جواب دیا۔ "بہرحال تم ابھی سعید کے گھر پیام لے کر جاؤ اگر انہوں نے پیام منظور کر لیا تو پھر بڑی دشواری ہو گی جس راز کو ہم نے پچیس سال سے چھپایا ہے وہ بڑے عجیب طریقے سے ساری خلقت کو معلوم ہو جائے گا۔ تب ہم واقعی مصطفےٰ سے نظریں نہ چار کر سکیں گے تم برائے چندے توقف کرو میں کسی مفتی سے یہ مسئلہ پوچھتا ہوں کہ کسی نامعلوم الاسم شخص کی اولاد کے نکاح کے وقت اس کا

سرپرست اپنا نام بحیثیت اس کے والد کے درج کرا سکتا ہے کہ نہیں ؟ اور یہ نکاح صحیح ہوگا کہ نہیں ! سمجھیں ؟

"ہاں ، وہ بے حد رنجیدہ تھیں ۔

گھر کے کسی فرد کی پریشانی سے ریاست جہاں کو کوئی سروکار نہ تھا انہوں نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا رکھی تھی بے چاری پیدائشی جاہل تھیں ، جہالت بھی ایسی جس کے سرے حماقت اور جذباتیت سے مل جاتے تھے ۔ وہ مصطفٰی کی چشم التفات کی منتظر اپنے چچا کے گھر رہ پڑی تھی ۔ حالانکہ گھر میں کوئی اس کا نوٹس نہ لیتا تھا ۔ پڑی ہے تو پڑی رہے نوکر تک سنتے تھے ۔ کمشنر صاحب کو اس کی صورت سے وحشت ہوتی تھی ۔ بیگم ہاشم بھی منہ نہ لگاتیں مگر بھتیجی کا رشتہ تھا صاف کیسے کہہ سکتی تھیں کہ وہ اپنے گھر چلی جائے ! پتہ نہیں اس کی ماں نے کیا کہہ سن کر یہاں چھوڑ رکھا تھا مصطفٰی دولت مند ہیں ، خوبصورت ہیں ۔ اکیلے ہیں کسی طرح ان کے دل میں جگہ کر لو کہ پھر وہ تمہارا کلمہ پڑھنے لگیں ۔ چنانچہ ریاست بے چاری جگہ پیدا کرنے کی کوشش میں رہی سہی جگہ بھی گنوا رہی تھی ۔ پہلے پہل تو مصطفٰی نے مذاق میں منہ لگایا تھا پھر جیسے ہی اس کا مقصد معلوم ہوا کہ وہ انگلی پکڑنے کے بعد کلائی پکڑنے والوں میں سے ہے وہ اس سے برگشتہ اور دور دور رہنے لگے ۔

ریاست نے اپنی مساعی جاری رکھیں بڑی تندہی سے انکی "خدمت" پر کمربستہ رہتی تھی ! حقیر سے حقیر کام کرنے میں اسے عار نہ تھا ۔ ایک سہ پہر مصطفٰی پارک سے واپس اپنے کمرے میں پہنچے تو دیکھا وہ فرش پر جوتوں کے اسٹینڈ کے پاس بیٹھی اپنے آنچل سے جوتوں کی گرد صاف کر کے قرینے سے لگا رہی ہے ۔ اس وقت اس کے گاؤدی چہرے پر ویسے ہی تاثرات تھے جیسے وہ اپنے پہلوٹھی کے بچے کو نہلا رہی ہو ۔ مصطفٰی کو دیکھ کر بھی وہ نہیں اٹھی بلکہ اور دانت نکال دیئے جیسے مصطفٰی !

اس سے الرجک ہو رہے تھے وہ ان کے سر پر مسلط ہوتی جا رہی تھی اور یہ رنگ دیکھ دیکھ کر بیگم ہاشم بھی حیران تھیں۔

لائبریری سے دو تین لڑکے نیچے چلے گئے اور لائبریرین دور جا بیٹھا تب دفعتہً شکیل اس کی طرف دیکھ کر ہنس پڑا۔

"کوئی لطیفہ یاد آ رہا ہے کیا؟" روحی گلابی ہو گئی۔ کہیں اسے پتہ تو نہیں چل گیا وہ اس کی تصویر چرا لائی تھی۔

ہے۔ عمدہ لطیفہ ہے۔"

"سنائیے۔۔"

"شفیق الرحمٰن صاحب مجھے یاد آ گئے۔۔۔ کتنے خوبصورت انداز میں انہوں نے اپنے ایک کردار اشفاق کی زبانی کہلوایا ہے کسی کی تصویر چرانے سے بہتر ہے کہ کوئی مجھی کو چرا لے۔"

"کیا ایسا کوئی حادثہ آپ کے ساتھ بھی ہوا ہے؟" روحی مسکرا کر بولی۔

"جی ہاں۔ لیکن جب میں خود ہی چوری ہو گیا ہوں۔ تو پھر چور صاحب میری تصویریں لے کر کیا کریں گے؟" شکیل نے کہا۔۔۔ "سوائے اس کے کہ ان کے کاٹھ کباڑ کے ذخیرے میں ایک فضول سی چیز کا اضافہ ہو جائے۔"

"اب یہ تو مجھے کیا پتہ۔۔ انسان کو جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے وہی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔" روحی بولی۔

اس نے اپنی دانست میں ہوشیاری خوب کی تھی۔ مگر!"

"مگر ۔۔ !"

"لیکن شاطر سے شاطر چور بھی اپنی کسی نہ کسی حماقت ہی سے گرفتار ہو جاتا ہے"

"تو کیا؟" روحی نے کہا۔۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا بڑی بی نے اس کی آمد سے

شکیل کو مطلع کر دیا تھا۔ حالانکہ وہ اس سے چھپانا چاہتی تھی۔ "!

شکیل نے جیب سے ایک خوشنما رومال نکالا اور سامنے میز پر رکھ دیا۔

"چور کی نشانی!" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

اپنے رومال کو دیکھ کر وہ جھینپ گئی

امی نے بھی بڑے خوبصورت انداز میں مجھے غلط سلط جواب دیے تھے "خیلا میں

نہیں جانتی کہ تمہاری تصویر کیا ہوئی تم خود ہی کہیں رکھ کر بھول گئے ہو گے یہاں

تو کوئی نہ آیا نہ گیا۔ اب بھلا بتائیے کہ دیوار پر مدتوں سے لگی تصویر اپنے آپ

اڑ کر کہاں جا سکتی ہے۔ میں ابھی حیران ہی تھا کہ تپائی پر رکھے آپ کے ننھے سے رومال پر نظر

پڑی اور سارا معمہ حل ہو گیا" شکیل آج بہت شوخ ہو رہا تھا "اچھا بتائیے کہ امی

سے کیا کیا باتیں ہوئیں۔ آپ نے مجھ سے کہا ہی نہیں کہ آپ ان سے ملنا چاہتی ہیں۔ میں

لے چلتا آپ کو۔ آپ کی خاطر تواضع کرتا امی بیچاری سے کیا ہو سکا ہو گا۔"

"سچ مچ آپ بہت برے ہیں۔" روحی نے کہا۔ "جتنی میں آپ سے اپنائیت

کی توقع رکھتی ہوں آپ اسی قدر غیر اور اجنبی بنتے چلے جا رہے ہیں بھلا اگر کبھی

آپ نے امی کے بارے میں کچھ کہا تھا۔ ان سے مل کر مجھے اتنا افسوس ہوا۔ میرا

بس چلتا تو میں ان بے چاری کی تنہائی بانٹ لیتی! اکیلی چھوڑ آئی تھی دیر تک

انکا خیال لگا رہا جان بوجھ کر روحی نے ٹیوشن وغیرہ کا تذکرہ نہ کیا! "کیا معلوم

بگڑ جاتا۔ اس کے غصہ ور موڈ کا اسے اندازہ ہو چکا تھا۔

"کون سی دلچسپ بات تھی جس کا تذکرہ کرتا؟" شکیل نے کہا۔ "یہ مصیبت تو

دس پندرہ سال پرانی ہے۔ پہلے امی اچھی بھلی تھیں مگر مسلسل گریہ وزاری اور متواتر سوزن کاری کے باریک کام نے ان کی آنکھوں کا یہ حشر کیا ہے۔"

"گریہ وزاری، شاید آپ کے ابا کی یاد میں۔" روحی چپکے سے بولی

"نہیں ایسی بات نہیں تھی امی کہتی ہیں کہ ان کا ایک بیٹا مجھ سے بڑا اور بھی تھا وہ کہیں ریل کے سفر میں گم ہو گیا۔ پتہ نہیں کہاں رہ گیا۔ کون لے گیا۔ اس کی تلاش بھی کی گئی مگر وہ نہیں ملا۔ بس اس کی یاد میں ان کی آنکھوں کے تار نہیں ٹوٹتے تھے! سچ تو ہے۔ کسی مرحوم کو صبر آجاتا ہے۔ کسی گم گشتہ کی یاد بھلائی نہیں جا سکتی۔

"آپ نے نہیں دیکھا۔ کیسا بھائی تھا آپ کا؟" روحی دکھ سے بولی۔

"ہاں۔ یہی تو وہ کہہ رہی تھیں کہ جانے والا آنکھوں کی روشنی لے گیا۔"

"میں نے انہیں نہیں دیکھا میں ان دنوں پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ امی سے سنا ہے کہ بہت خوبصورت بچہ تھا۔ لیکن کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ واقعی وہ کہیں ہو گا بھی کہ نہیں اگر زندہ ہو گا تو کس حال میں ہو گا؟" اس نے گہری سانس لی۔ ایسے بچے جو کہیں کھو جاتے ہیں وہ اگر کسی بدمعاش کے ہتھے چڑھتے ہیں تو پھر چور، ڈاکو، خونی، قاتل کے سوا اور کچھ نہیں بن سکتے۔ کتنی عجیب بات ہے۔

"کہیں پتہ نہ چلا ان کا؟"

"نہیں اور اب کیا چلے گا۔ برسوں گزر چکے ہیں۔"

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر روحی نے پوچھا۔ "اب تو امی کی آنکھوں کا آپریشن ہی ہو گا شاید۔؟"

"ہاں۔ یہی ایک علاج ہے۔"

"پھر کب کروا رہے ہیں؟"

"جب ڈاکٹر صاحب کوئی تاریخ دے دیں"۔

"خدا کرے کہ ان کی بصارت واپس آجائے!"

"ہاں۔ بس خدا کرے"۔

روحی نے یہ نہیں پوچھا کہ فیس کا کیا بندوبست ہوا تھا؟ کیونکہ بندوبست تو اس نے کر ہی لیا تھا! کسی سے کہے بغیر اس نے اپنا لاکٹ اور بالیاں پانچ ہزار میں فروخت کر دیے تھے۔ اور پوری رقم پرس میں لئے پھرا کرتی تھی۔ کسی موقع کی تلاش میں۔ جب شکیل کی عدم موجودگی میں اس کے گھر جاسکے اور رقم ناظمہ بیگم کو دے آئے۔

"اچھا جناب" شکیل نے کتابیں سمیٹ کر اٹھتے ہوئے کہا۔ "اب اجازت دیجئے پھر ملیں گے۔ ہاں خوب یاد آیا۔ چوری کی چیز براہ کرم واپس کر دیجئے۔ یا پھر کوئی نعم البدل۔ نقصان کا اثر کچھ تو زائل ہو"۔

"شفیق الرحمٰن صاحب کا جواب میرا بھی ہے چور کی کوئی چیز آپ بھی چرا لیجئے"۔ روحی برجستہ بولی۔

"اپنی چیز بھی کبھی چرائی جاتی ہے!" شکیل نے کہا اور اس کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگا۔

"شکیل صاحب! آپ نے کبھی یہ بھی سوچا کہ میں اپنے محسوسات میں کتنی سنجیدہ ہوں۔ آپ نہیں جانتے! میں بڑوں کی رائے کی پابند وہ لڑکی ہوں جسکے مستقبل کے چرچے ہوتے رہتے ہیں کبھی کسی کا نام لیا جاتا ہے کبھی کسی کا۔ لیکن ان گنواروں سے ہٹ کر اس ہستی کا نام میں نے نہیں سنا جسکے سننے کا بہت جی چاہتا ہے مجھے ڈر لگتا ہے اگر آپ یونہی اجنبی بنے رہے تو پھر میرا ہاتھ کسی کے ہاتھ میں تھمانے کسی کو میرے جذبات و محسوسات کا پاس و لحاظ بھی ہوگا۔

کہ میں وہی بابل کے صحن کی چڑیا اڑ کر کسی اور کے صحن میں جا اتروں گی! شکیل صاحب!۔ کیا اپنی نسوانی شرم و غیرت کو بالائے طاق رکھ کر آپ سے یہ سب کچھ کہنے کا حق صرف میرا ہی ہے؟۔ آپ کچھ بھی نہیں چاہتے؟۔ آپ کے دل میں میری اتنی سی وقعت بھی نہیں!"

شکیل جاتے جاتے رک گیا اور پاس آ کر روحی کے پاس والی کرسی پر ٹک کر بڑی سنجیدگی سے کہا "روحی میرے اور تمھارے جذبوں میں بس یہی فرق ہے کہ تم اپنے جذبوں کو زبان دے سکتی ہو مگر میں بہت کچھ ضبط کر سکتا ہوں۔ انجام و عواقب تمھارے نزدیک بے معنی ہیں۔ جبکہ ان الفاظ کا مفہوم میرے نزدیک بہت وسیع و عمیق ہے!۔ محبت کے ہاتھوں کیے ہوئے فیصلے احمقانہ ہوتے ہیں جبکہ محبت ضروریات زندگی کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔ زمانہ ہم سے ہماری پوری توانائی مانگتا ہے روحی۔ انسان صرف جذبوں کے سہارے نہیں جی سکتا!۔ اسے اور بھی بہت کچھ چاہیئے۔ جس کے فراہم کرنے کے لیے مادی وسائل و ذرائع کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لیے انسان کو محنت مشقت، کوشش، جد و جہد اور بھاگ دوڑ کرنی پڑتی ہے۔ جس کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔

"اور وقت پر کسی کا اختیار نہیں" روحی نے بھرائی ہوئی آواز میں اس کی بات کاٹ دی "وقت نہ آپ کے اختیار میں ہے نہ میرے۔ یہ وقت مجھ پر کٹھن آ جائے۔ مجھ سے میرا جذبہ چھین لے، میرے محسوسات کا خون کر دے میری محبت کا گلا گھونٹ دے۔ مجھے جیتے جی درگور کر دے۔ آپ بھی مجبور رہیں میں بھی۔ قربانی مجھے دینی پڑے گی۔ ایثار مجھے کرنا پڑے گا۔ اپنی امیدوں کا قتل مجھے کرنا ہوگا۔ اور سب کچھ بھول کر تیاگ کر کسی اور کے ساتھ زندگی

گزارنا پڑے گی جو زندگی نہیں ہوگی موت ہوگی۔ آپ سب کچھ دیکھا کریں گے سہا کریں گے یا برداشت کرنے کی اداکاری کریں گے۔ جو چیز قربان ہو رہی ہے اس سے آپ کو ہمدردی کیا ہے۔ اور قربانی کے بعد آپ عواقب و انجام کو سنوارنے اپنا سنہرا مستقبل بنانے کے لیے دنیا کی بھیڑ میں گم ہو جائیں گے۔ پھر ایک وقت آپ کا بھی آجائے گا۔ جب مادی وسائل و ذرائع آپ کو دولت مند بنا دیں گے۔ ایک ساتھی بھی آپ کو میسر آجائے گا۔ اور تب شاید آپ کو وہ بدنصیب یاد بھی نہ آئے جو آپ کی آنکھوں کے سامنے کسی ناپسندیدہ دیوتا پر بھینٹ چڑھا دی گئی تھی جسے آپ چاہتے تو بچا سکتے تھے۔ مگر آپ نے اپنی برگشتگی، بے حسی کو مادی وسائل کے نقاب میں چھپا کر خود کو محفوظ کر لیا۔ یہی نا۔ تب بھی سہی۔ عورت ہمیشہ قربانیاں دیتی آئی ہے۔ جان کی مال کی، محبت کی، میں بھی عورت ہوں۔ قربانی مجھ سے بھی ممکن ہے۔ شکیل صاحب! اب کبھی کوئی بے حجابی مجھ سے سرزد نہ ہوگی۔ آپ سے جواب میں سننا چاہتی تھی میں نے سن لیا۔ خدا حافظ!"

وہ اٹھ کر دروازے کی طرف بھاگی۔ مگر شکیل نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا اور زبردستی ایک کرسی پر بٹھانے میں کامیاب ہوا۔

روحی۔ تم اپنا اور میرا تماشہ بنانا چاہتی ہو کیا۔!" اس نے اپنے ہاتھ سے اس کے آنسو پونچھے اور گڑگڑایا: "خدا کے لیے رؤ مت روحی۔ اپنا چہرہ متبسم بناؤ۔ ابھی کوئی آجائے تو کیا سوچے گا؟ یہاں تو یونہی بات کا بتنگڑ بنتا ہے۔ خدا کے لیے خود کو سنبھالو۔!"

"نہیں اب میں جاؤں گی!۔ میری وجہ سے کیوں کوئی تماشہ بنے!" وہ جان بوجھ کر سخت خفا رہی۔!

شکیل ایک لمحہ تک اسے عجیب طرح دیکھتا رہا پھر بولا: "اچھی بات ہے

چلو چلیں۔ میں بھی چلتا ہوں!"

روحی منہ پھلائے اٹھی اور چل دی۔ اس کے پیچھے وہ یوں جا رہا تھا جیسے اس کا غلام ہو۔ بوٹی ایرڈے میں اس نے روحی کو جا لیا۔! اس کا بازو پکڑا اور اس کا چہرہ اپنی طرف گھماتا ہوا بولا: "خدا کے لیے کہو تو کہ میں نے ایسی کون سی بات کہہ دی ہے جو تمہیں اتنی بری لگی ہے۔ تم رو رہی ہو۔ پریشان ہو رہی ہو۔ اپنا دل دکھا رہی ہو۔ آؤ روحی اس کنج کے پیچھے بیٹھیں۔ یہاں سایہ ہے ٹھنڈی ہوا ہے۔ پھول ہیں۔ ان کی مہک ہے۔ آؤ روحی۔ خدا کے لیے آؤ۔ مجھے زیادہ دکھ نہ دو!"

خفا ہونا یا بگڑنا تو فقط دکھاوا تھا وہ تو گرم لوہے پر ضرب لگا رہی تھی ہرے بھرے لطیف و معطر کنج میں بیٹھ کر اس نے طنز بھرے لہجے میں کہا۔

"پھر دکھ کا سامان اپنے ساتھ یہاں کیوں لائے ہیں۔ مجھے جانے دیا ہوتا!"

شکیل نے بڑے پیار سے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ اور اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا مسکرا کر بولا: "جانے کون دیتا ہے تمہیں۔ جب تک کہ تمہارا موڈ درست اور صاف نہ ہو جائے۔ اُف توہ۔ کب سے بھری بیٹھی تھیں۔ بجانے کیا کچھ مجھ غریب کو سنا دیا۔ جس کا ایک لفظ بھی مجھے یاد نہیں۔ ہاں محترمہ اب فرمایئے۔ کیا مطلب تھا آپ کی فراٹے دار تقریر کا؟"

روحی نے اس کا ہاتھ اپنے چہرے سے ہٹا دیا۔ اب وہ شرما رہی تھی۔ کیسے کہہ سکتی کہ وہ سب کی دستبرد سے بچا کر اسے اپنا لے! چپکے سے بولی۔

"آپ تو بڑے ذہین ہیں۔ میرے کہے بغیر کیا کچھ سمجھ نہیں سکتے؟"

شکیل نے ایک سانس لے کر کہا: "روحی جو کچھ میں سمجھا ہوں۔ اس کی تردید کرنا چاہتا ہوں!"

"ترد ید ؟ - !"

ہاں۔! شکیل نے روشن خلا میں محو پرواز طیور پر نگاہیں جما دیں۔"کیونکہ روحی ہم میں ایک بڑا فرق ہے !۔

"مرد و عورت کا۔؟ بے اختیار روحی کے منھ سے نکل گیا۔

شکیل کو ہنسی آگئی۔"تم نہیں سمجھیں۔ یہ فرق دراصل کچھ اہم نہ ہوتا اگر ہم میں طبقاتی ہم آہنگی بھی ہوتی۔ روحی مجھے کہنے دو کہ تم ایک اعلیٰ ماحول کی پروردہ اور اسی رہن سہن کی عادی ہو۔ اگرچہ اپنے جذبات کے ہاتھوں تم فی الحال اس فرق کو محسوس نہیں کر رہی ہو۔ مگر جب ان جذبوں کی ہوا اترے گی۔ محبت اپنا اثر کھونے لگے گی۔ تم متواتر بیزار اور پریشان رہنے لگو گی۔ اور یہ میں ابھی نہیں چاہتا کہ تم میرے ساتھ کسی امتحان میں مبتلا ہو جاؤ۔ روحی سنو۔ ابھی تو ہم زیر تعلیم ہیں نا۔ جب میں دو ایک سال میں اس قابل ہو جاؤں گا کہ تمھارا ہاتھ طلب کر سکوں تو پھر کون ہے جو ہمیں ـــ !"

"دو سال !۔" روحی نے زانو پر ٹھوڑی ٹیک کر مخملی گھاس نوچ کر پھینکتے ہوئے کہا:"زبان سے تو یہ مدت ایک لمحہ میں نکل گئی مگر پتہ ہے۔ یہ کتنے جان لیوا لمحوں پر محیط ہے۔ آپ سے میں نے کہا ہے کہ میرے والدین اب مجھے زیادہ مہلت نہیں دینا چاہتے۔ میں نے رات چھپ کر ان کی گفتگو سنی ہے۔ ان کے پاس ان کے عزیزوں کے دو پرو پوزل تو بالکل تیار ہیں۔ ایک صاحب ممی کے بھتیجے ہیں دوسرے صاحب بھی کوئی غیر نہیں۔ اگر ان میں سے کوئی ایک ممی یا ڈیڈی کی نظروں میں آگیا تو پھر شکیل صاحب ؟ ؟"

"پیاری روحی:" شکیل نے اس کا ننھا منا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر لبوں پر رکھ لیا:"میں تم سے منت کرتا ہوں کہ اپنے والدین کی مرضی پر سر جھکا

دو۔ وہ جو کچھ کریں گے تمہارے حق میں وہی بہتر ہوگا۔ روحی۔ میں سچ مچ تمہارے قابل نہیں ہوں۔ نہ میں نہ میرا گھر۔ تم ایک قیمتی ہیرا ہو۔ اور اس ہیرے کو کسی بادشاہ کے تاج میں جگمگانا چاہیئے جو اس کی قدر کر سکے۔ جسے اس کی قیمت معلوم ہو۔ یہ ہیرا کسی بوسیدہ کیس میں نہیں رکھا جا سکتا! ۔ روحی میں تم سے کہہ دوں کہ میں بھی تمہیں بہت چاہتا ہوں۔ جس دن میں نے تمھیں دیکھا تھا۔ مبہوت رہ گیا تھا! ایسی حسین اور پیاری لڑکی بھی خدا نے بنائی ہے مگر جس طرح رقص کے بعد مور اپنے پاؤں دیکھتا ہے اور شرمندہ ہوتا ہے۔ اسی طرح میں بھی بس تمہاری حسرت کر کے رہ گیا۔ روحی پیاری۔! اب مجھے بھول جاؤ۔ ان دنوں کو بھول جاؤ۔ ان یادوں کو اپنے ذہن سے نکال پھینکو اپنی زندگی میں کانٹے نہ بوؤ۔ میری روحی۔ میں تمہاری خوشی، تمہاری پُرمسرت زندگی کا طلب گار ہوں۔ تم جہاں کہیں رہو گی۔ جس کے ساتھ رہو گی۔ میں یہ سوچ سوچ کر دل کو بہلا لیا کروں گا کہ میری روحی ہر طرح خوش ہے۔ بس میرے زندہ رہنے کا بھی بہانہ مل جائے گا!"

"تو آپ کو یقین ہے کہ میں کسی اور کے ساتھ خوش رہ سکوں گی!" روحی اب غصہ بھول کر مسکرا رہی تھی۔

شکیل اس کی پُراسرار سی مسکراہٹ سے الجھ کر بولا "نہیں! یہ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا! ۔ چند روز بے شک نئے ماحول نئی فضا اور نئے ساتھی کے ساتھ تمھیں میری یاد آئے گی مگر جسطرح وقت ہر زخم کا اندمال بن جاتا ہے اسی طرح ___!"

"شکیل صاحب! بعض زخم ناسور بن جاتے ہیں۔ بیمار کو بالآخر قبر میں پہونچا دیتے ہیں" روحی نے جواب دیا "اور یہ دن۔ یہ آپ کا ساتھ۔ آپ

کی صورت و سیرت میں عمر بھر بھولنے کی نہیں۔ آپ نے اگر نصیحتوں کا طومار باندھے رکھا۔ بزرگ بنے رہے تو کیا ہوگا؟ معلوم ہے؟"

حسن صورت، و حسن سیرت؟" شکیل نے گاو گیر لہجے میں کہا: "اگر یہ صورت تمھارے مستقبل پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اگر یہ سیرت تمھیں ورغلاتی ہے تو روحی اس کا مداوا ابھی مجھ سے ممکن ہے!" اس نے روحی کی شکل پر نظر ڈالی اور پھر گہری آہ بھر کر بولا: "اس چہرے کو میں تیزاب سے سیاہ کر سکتا ہوں۔ اس سیرت کو بھی تباہ کر سکتا ہوں۔ صرف اس لیے کہ اگر تمھارا مستقبل روشن و تابناک ہے تو میری وجہ سے کسی تاریکی میں نہ جا پڑے۔!"

"شکیل صاحب اب تک تو میں آپ کو ایک عام آدمی ہی سمجھا کرتی تھی۔" اب روحی نے بے ضبط ہو کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اس لہجے میں جیسے کہ کسی مہاتما کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کر رہی ہو۔ بولی۔ لیکن آپ کی باتیں سن کر میرے دل میں آپ کی محبت کے ہمالیہ بلند ہو گئے ہیں جو شخص اپنی محبت سے کسی کی بھلائی کے لیے دستبردار ہو جائے۔ اپنا چہرہ مسخ کر سکے۔ اپنا کردار داغدار کر سکے۔ اس سے بڑھ کر وسیع الظرف، فراخدل اور شریف النفس بھلا اور کون ہو سکتا ہے۔ نہیں" وہ یکبارگی رو پڑی" مجھے کوئی شہنشاہ بھی نہیں چاہیئے آپ کے سوا۔ محبت جواب میں محبت مانگتی ہے دولت و ثروت نہیں!۔ اگر مجھے دولت مل گئی۔ محبت نہ مل سکی تو زمین و آسمان کی قسم میں خودکشی کر لوں گی!"

اور اپنے محبوب کو جیت کر وہ سرشار و مسرور سی گھر پہونچی تھی!۔ اس کے دل میں یقین و عزم کی شمعیں فروزاں تھیں۔ وہ نگار و نگسار نشۂ الفت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے دنیا حاصل کر لی تھی۔ شکیل نے اس سے کہا تھا۔

وہ صرف روحی کی بھلائی کی خاطر بزرگوں کی سی باتیں کر رہا تھا ورنہ روحی کا حصول اس کی پہلی اور آخری تمنا تھی۔ وہ بہت جلد اپنی امی کا آپریشن کروا دے گا اور پھر جیسے ہی وہ ٹھیک ہوئیں۔ اس کو گھر لے آئے گا!۔

گھر پہنچی اور دالان میں قدم رکھا تھا کہ موڈ تلخ ہو گیا۔ آمنہ بیگم کے کمرے سے اپنی ممانی اماں کی کرخت آواز آتی سنی!۔ اور سمجھ گئی کہ انھوں نے کس لیے قدم رنجہ فرمایا ہے ایک زہر سا اس کے سینے میں بھر گیا!۔ یہ کہیں اس کی کان کی کچی امی کو ورغلا نہ دیں!۔

ملازمہ چائے کے برتن لیے کمرے سے نکل رہی تھی اس کی نگاہ روحی پر پڑی اور وہ پردے میں منہ ڈال کر بولی: "بیوی۔ آپ بٹیا کو پوچھ رہی تھیں۔ وہ مدرسہ سے آ گئی ہیں!"

روحی نے دانت پیسے اور ملازمہ کو گھونسہ دکھایا۔ وہ ہنستی ہوئی چلی گئی۔ روحی کو اندر سے ممانی اماں نے آواز دی۔ اسے جانا پڑا اور یہ دیکھ کر وہ حیران رہ گئی کہ وہاں سعید صاحب بھی خلاف توقع موجود تھے اور اس کے ماموں زاد بھائی ناصر بھی!۔

"آج بہت دیر لگا دی۔!" آمنہ بیگم نے کہا۔ سعید صاحب نے اس پر ایک معنی خیز نگاہ ڈالی۔ ناصر مسکرائے۔ اور ممانی اماں نے ایک تنکے کی طرح اسے کھینچ کر اپنے جہازی سینے سے چپکا لیا۔ پھر بولیں: "ارے کیا تمہاری آنکھوں پر پٹی بندھی ہے آمنہ۔ دیکھ رہی ہو کہ چھوکری مرمر کی سلائی ہو رہی ہے۔ پھر یہ مراد جلی نگوڑی کا ہے کی پڑھائی ہے کہ بس پڑھائے جا رہی ہو۔ ارے اسے گھر بٹھا لو کچھ تندرستی بناؤ اس کی۔ ہا۔ ہا مار کے لڑکی کے گال جبڑوں سے جا چپکے ہیں۔ یہ میرے ہاتھوں میں پیٹھ اور پسلی کی ہڈیاں چبھ رہی ہیں!۔ آمنہ!

کیا لڑکی کو پیٹ بھر کھانا نہیں دیتیں۔؟"

وہ ان پہاڑ سی ہاتھوں کی گرفت سے چھوٹ کر ایک اسٹول پر ٹک گئی۔ اور سوچنے لگی کہ اس بے پایاں محبت کا سبب کیا ہے۔ ممانی اماں نے کبھی بھولے منہ خیریت تک نہ پوچھی تھی۔ پھر یہ آج۔ مامتا کے چشمے کیوں جاری ہو گئے ہیں"

"بھاوج۔ آج کل کی لڑکیاں دبلے ہونے کے شوق میں کھانا پیٹ بھر کھاتی ہی کیا ہیں"

آمنہ بیگم نے کہا اور سوچا کہ لفظ چھوکری پر روحی ضرور جز بز ہوئی ہو گی!۔

"روحی بیٹی۔ جاؤ" سعید صاحب نے نہایت سنجیدہ لہجے میں کہا "منہ ہاتھ دھو کر لباس تبدیل کرو۔ ہاں۔ میں نے پوچھا تھا کہ آج تمھیں واپسی میں دیر کیوں لگی؟"

ان کا لہجہ تشویش سے خالی، شکوک و شبہات سے لبریز تھا۔ روحی نے گستاخانہ لہجے میں جواب دیا "جی! میں کچھ مصروف تھی ڈیڈی۔!" اور ایک برہم نظر سب پر ڈال کر وہ جھٹکے سے اٹھی اور کمرے سے چلی گئی۔ آمنہ بیگم کی پیشانی پسیج گئی!۔

ناصر کی آمد کی وجہ یہ تھی کہ وہ لڑکی کو دیکھنے اور خود کو دکھانے آئے تھے۔ حالانکہ روحی ان کی پھوپھی زاد بہن تھی۔ مگر ہونے والی بیوی کے روپ میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ بے حد پسند کیا تھا سر سے پیر تک سفید ریشم میں لپٹی، سفید گلاب کانوں کے پیچھے لگائے وہ سچ مچ سنگ مرمر کی مورتی لگ رہی تھی!۔

انھیں یہ تشویش تھی کہ روحی نے بھی انھیں دیکھا اور بحیثیت شوہر کے منتخب کیا تھا کہ نہیں۔ لہٰذا وہ اٹھتے ہوئے بولے۔

"تو پھر میں چلوں پھوپھی جان! ۔ مم۔ میں۔ یہ ۲ کتابیں روحی کے لیے لایا

تھا۔ اگر آپ کہیں تو انھیں دے دوں!"

"دے آؤ۔ اس میں پوچھنا پاچھنا کیا۔!" ان کی والدہ محترمہ نے کہا۔ چنانچہ وہ ایک جہان آرزو دل میں بسائے اس کے کمرے پر آئے۔ دستک دی!۔

"لے آؤ!" روحی بولی۔ ناصر نے پردہ سرکا کر اندر قدم رکھے۔ روحی نے جھپٹ کر مسہری پر سے ڈوپٹہ اٹھایا اور کندھوں پر ڈالنے لگی۔

"تمھیں کیسے پتہ چلا کہ میں تمھارے لیے کتابیں لا رہا ہوں!" ناصر نے اندر آ کر ایک کرسی سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

"بالکل پتہ نہیں تھا۔ ناصر بھائی!" اس نے جان بوجھ کر انھیں بھائی کہا تاکہ کسی خوش فہمی کا امکان نہ رہ جائے۔!

"مگر تم نے کہا تھا کہ لے آؤ!" وہ ہنس کر بولے۔

"معاف کیجیے۔ میں سمجھی بوا نانی ہیں۔ چائے لائی ہیں!" وہ بھی ہنس کر بولی۔ "آپ کے یہاں تک آنے کا تو گمان بھی مجھے نہ تھا!۔ یہ کون سی کتابیں ہیں؟"

"بھئی ایگزیبیشن گیا تھا۔" انھوں نے کتابیں اس کی طرف بڑھا دیں: "اردو بک اسٹال پر یہ کتابیں دیکھیں۔ تمھارا خیال آ گیا۔ لے لیں۔ شاید تمھیں پسند آ سکیں!"

"حریف قلم اور بادِ شمال!" روحی زیر لب بولی: "ہاں۔ یہ مجھے بہت پسند ہیں آپ کا بہت بہت شکریہ ناصر بھائی!۔ آپ کو میرا خیال آ گیا۔ دراصل میں نے آپ کو ہمیشہ اپنا حقیقی بڑا بھائی سمجھا ہے۔ اللہ میاں نے ایک چھوٹا سا احمق بھائی دیا ہے۔ مگر وہ بھی دور چلا گیا۔ ناصر بھائی۔ سچ بتائیے۔ کیا آپ بھی مجھے اپنی چھوٹی سگی بہن نہیں سمجھتے؟!"

وہ اپنی خوشنما رحم طلب آنکھوں سے انھیں دیکھ رہی تھی!۔ اور کیا نہ تھا ان آنکھوں میں۔ ناصر کے وہ نوزائیدہ خیالات جوان کی جہالت مآب والدہ محترمہ کے ذہن کے پیداوار تھے۔ تحلیل ہونے لگے!۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بلند خیال تھے۔ اور اپنی بے رنگ و بو زندگی کے خلا کو روحی کے وجود سے رنگین و دلکش بنانا چاہتے تھے۔ لیکن اب۔؟ ان کی دفعتہً قلب ماہیت ہوگئی۔ آناً فاناً بے ساختہ ان کی زبان سے نکل گیا!۔

"ہاں روحی کیوں نہیں۔ تم حقیقی بہن کے سوا اور کیا ہو سکتی ہو!"۔ یہ کہتے ہوئے ان کے لب کانپ رہے تھے مسکرانے کی کوشش میں وہ کچھ بسور رہے تھے۔ پھر وہ دیر تک اس کے کمرے میں بیٹھ بھی نہ سکے!۔ اپنی بدحواسی اور متغیر کیفیت کو چھپانے کے لیے انھوں نے کہا: "کبھی ہمارے ہاں بھی آؤ۔ تم نے تو آنا ہی چھوڑ دیا:"

ان کے جانے کے بعد روحی نے سکھ کی سانس لی۔

سعید صاحب نے روحی کے جارحانہ لب و لہجے سے خطرہ سر پر محسوس کیا اور طے کر لیا کہ قبل اس کے کہ وہ آپنے سے بالکل ہی گزر جائے۔ اسے سسرال پہونچا دیا جائے انھیں یہ بھی اندیشہ تھا کہ اگر روحی کی حماقت کی کہانی گھر سے باہر چلی گئی تب شاید ہی مصطفےٰ یا ناصر اسے قبول کر سکیں۔ لہٰذا انھوں نے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد ناصر کی والدہ محترمہ سے کہا۔

"بہر کیف! بھاوج مجھے کہنا تو نہیں چاہئے مگر میں یہ چاہتا تھا کہ اگر آپ اسی وقت ایک حتمی جواب دے دیتیں تو آپس کے فروعی معاملات بھی طے ہو جاتے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ آمنہ کے پاس لڑکی کا جہیز قریب قریب تیار ہی ہو گا کیوں۔؟" انھوں نے تائید طلب نظروں سے بیوی کو دیکھ کر پوچھا۔

"فرنیچر تک!" آمنہ بیگم نے سرخروئی سے جواب دیا۔

"میرا جواب کیا۔!" انھوں نے اطمینان سے کہا پھر پاندان اپنی طرف گھسیٹا پان بنایا اور گابدی گال میں دبا کر مزے میں لونگ الائچی اور قوام کا منکسیچر ہتھیلی سے منھ میں منتقل کرتی ہوئی بولیں: "ان بیوی سے کہہ چکی ہوں کہ چار جگہ اچھی لڑکیاں دیکھیں مگر لین دین اچھا نہ تھا۔ بات آگے نہ بڑھائی۔ اب سعید میاں تم یہ دیکھو بیٹا کہ تین تین لونڈیوں کا بھگتان کر کے میں تو بالکل بکھر گئی ہوں۔ پہلے تو گھر کا نقشہ یہ تھا کہ الحمدللہ فقد آدم تھرماس تک اجڑا نہ تھا۔ مارے گرم پانی سب پیتے تھے۔ میں نے قسطوں پر وہ خریدا تھا اب عامر شاکر کے ضد کرنے سے بارہ ہزار کا رنگین ٹی وی لیا ہے۔ اس کی قسطیں کبھی بھرنا ہیں۔ یہ بوجھ جو سر پر پڑا ہے تو بارہ کے پلیتھن نکل گیا ہے۔ تمھارے بہنوئی جب سے حج کر کے آئے ہیں اور نظامیہ میں دینیات کے استاد لگ گئے ہیں گھر کی طرف مڑ کے نہیں دیکھتے۔ اب یہ سارا وبال ہزاروں کا میرے سر ہے ناصر کو فقط تین ہزار تنخواہ ملتی ہے۔ اس میں کیا رکھوں کیا اٹھاؤں۔ سو بھیا میں نے سوچا تھا کہ اگر اس کے بیاہ کے بہانے ہی کچھ مل جاتا تو ادھر ادھر کے قرضوں سے تو نجات مل جاتی! یہ ہے ساری بات۔ اب سوچ لو!"

نہایت صبر و سکون سے سعید صاحب نے ان کی نامناسب کہانی سُنی اور دل پر جبر کر کے پوچھا:

"میں آپ سے یہی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آپ نے لین دین کا کوئی نشانہ تو مقرر کیا ہی ہوگا۔ وہ اگر مجھے بھی بتا دیتیں تو ٹھیک ہوتا۔ مجھے بھی تو کچھ انتظام کرنا ہی پڑے گا!"

"لو اور سنو۔ ان کی باتیں:" انھوں نے زور دار ٹھٹھا مار کے اور پیک کی پھوار چاروں طرف اُچھال کر فرمایا: "ہمارے سامنے کے بچے۔ انگوٹھا

چڑستے پھرتے تھے۔ آج ہی کو بیو توف بنانے چلے ہیں۔ کہتے ہیں انتظام کرنا پڑے گا! اے کیا ہم کو معلوم نہیں ہے۔ اللہ رکھے تمھاری ایک ہی تو بچی ہے لاکھوں اس کے نام سے جوڑ رکھا ہو گا! آخر تمہیں بھی تو چار لوگوں میں ناک کا بھرم قائم رکھنا ہے "

"وہ تو ٹھیک ہے بھا دج" آمنہ بیگم نے کہا" ہم نے اس کے لیے دو جوڑ زیور اکیاون جوڑ کپڑے کے۔ برتن، اور فرنیچر۔ مطلب یہ کہ ۔!"

"اُئی بیٹی آمنہ۔ یہ تم کیسی ہلکی ہلکی باتیں کر رہی ہو۔!" وہ ٹھڈی پر انگلی رکھ کر حیرت کی تصویر بن گئیں" تم ماشاء اللہ ایک ڈائرکٹر کی بیوی ہو کر یہ رکشے والے تانگے والے کی طرح جہیز کی فہرست مجھے سنا رہی ہو۔ ارے ابھی پچھلے مہینے ہی میرے گھر کے پچھواڑے رہنے والے باورچی نے اپنی لڑکی کی شادی کی ہے۔ اس نے دیے اکیاون جوڑ کپڑے اور دو سیٹ زیور کے۔ تو بہ کرو۔ ہمیں تو ڈپٹی صاحب کے۔ . . . ہاں کے چار سیٹ زیور اور ایک سو ایک جوڑ کپڑوں پر لعنت بھیج کر آئی ہوں!۔ ناصر بھی کہہ رہا تھا کہ اماں میرا مرتبہ باورچی کی بیٹی سے تو کچھ بڑا ہی رکھیے۔ وہ ساری عمر مجھے طعنے دے گا!"

"تو پھر!" ششدر رہ کر سعید صاحب نے دریافت کیا" آپ صاف صاف اپنا مطالبہ پیش کیوں نہیں فرماتیں!"

"بھا دج۔ روحی بھی تو آپ کی بچی ہے۔!" آمنہ بیگم نے کہا کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھیں۔ مگر سعید صاحب کے گھورنے پر چپ رہ گئیں۔

"شادی کے بعد جہیز ہی کے نام پر میاں بیوی میں جو تم بیزار ہوتی ہے۔ عزیز رشتے دار۔ . .سب پیچھے جا پڑتے ہیں" انھوں نے فرمایا" خیر اب تم صاف

صاف۔ سننا چاہتے ہو تو میاں سنو کہ ناصر بڑے عہدے پر ہے۔ اس کی ساکھ ہے۔ نام ہے۔ عزت ہے۔ سب میں اسے بھرم رکھنا ہے۔ لہٰذا اس کی حیثیت کے مطابق ایک لاکھ نقد مجھے چاہئیں۔ جہیز کی فہرست میں خود تیار کرکے تم کو بھیج دوں گی اور چھ سیٹ زیوروں کے ہوں۔ ڈھائی سو جوڑے ملبوسات دو سو جس میں الگ سے نوشہ کے لیے ہوں گے!۔ اور یہ ٹی، وی۔ بڑا اتھر ماس دی سی آر، کپڑے دھونے کی مشین، ہیٹر، ائیر کولر، ماروتی موٹر، یا کوئی گاڑی چھوٹا موٹا دو منزلہ بنگلہ۔ یہ سب معمولی چیزیں ہیں۔ تقریباً ہر بڑے گھر میں ہوتی ہیں۔ یہ تو خیر تم بغیر کہے بھی دو گے۔ اور بس اس وقت اتنا ہی یاد آ رہا ہے۔ جو کچھ گھر جا کے یاد آئے گا۔ سوچ کر لکھ بھیجوں گی۔"

سعید صاحب کے لبوں پر استہزائیہ اور تمسخرانہ مسکراہٹ تھی۔ آمنہ بیگم عرق عرق ہوئی جا رہی تھیں۔ آخر ان محترمہ کے لالچ اور لوٹ مار کی کوئی حد بھی تھی!۔

جی ہاں بہت معمولی چیزیں ہیں" سعید صاحب نے ہنستے ہوئے کہا "چند ایک معمولی چیزیں مجھے بھی یاد آ رہی ہیں۔ وہ میں سوچ کر فہرست میں بڑھا دوں گا!۔ آپ مطمئن رہیے۔!"

تو پھر تاریخ۔!" انھوں نے خوشی کے مارے بوکھلا کر پوچھا

"تاریخ۔ وہ بھی میں آپ کو لکھ کر دے دوں گا!" سعید صاحب نے کہا۔

اور پھر ایک برہم پر نفرت نظر ان پر ڈال کر اٹھ گئے!۔"

"بھاوج اتنا سب کچھ ہم کیسے دے سکتے ہیں!" آمنہ بیگم نے چپکے سے کہا "یہ تو آپ نے لاکھوں سے اوپر کی فہرست بنا دی ہے!۔ ابھی ہمارے سامنے لڑکے کا مستقبل بھی تو ہے

سب اپنی قسمت کا کھاتے ہیں!" انھوں نے جواب دیا۔

آمنہ بیگم تو بہت مایوس ہوئیں۔ ان سے کیا کیا توقعات انھوں نے وابستہ کی تھیں۔ یہ محترمہ پر امید ہو کر سدھاریں اور گھر جا کر خوش خبری ناصر کو سنا دیں۔

"لو میاں۔ تمھاری پھوپھی کی لڑکی سے رشتہ طے ہو گیا۔ جلدی تاریخ ڈلوا دوں گی۔ اگلے سے اگلا مہینہ رجب کا ہے۔ بڑا کاج ہو جائے۔ سن کر خوش ہو جاؤ گے۔ سعید میاں نقد ایک لاکھ کے سوا لاکھوں کا جہیز دے رہے ہیں۔ گھر، موٹر، رنگین — !"

"کچھ نہیں اماں" ناصر نے صاف جواب دے دیا۔ "یہ شرمناک مطالبہ آپ نے پھوپھا سے کیوں کیا ہے۔ مجھے کمی کیا ہے جو میں لڑکی والوں کا احسان لوں گا۔ اور مجھے روحی سے شادی ہی نہیں کرنی ہے۔ میں اسے سگی بہن کی طرح چاہتا ہوں۔ آئندہ وہاں جا کر بات خراب نہ کیجیے گا!" اماں جان نے سر پیٹ لیا۔ محمد احمد صاحب زیر لب مسکرا رہے تھے!!!

روحی سے اپنے گھر کے حالات پوشیدہ نہیں رہتے تھے۔ بوا نانی کی نواسی جمالی کو اس نے رازدار بنا رکھا تھا۔ وہ اسی کی ہم عمر تھی اور ایک گھر میں ساتھ کھیل کود کر بڑی ہوئی تھیں۔ روحی اسے اپنے کپڑے، پیسے کوڑی ہمیشہ دیتی رہتی تھی۔ کسی کو جمالی پر شبہ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ ہر آئے گئے کی خدمت میں حاضر رہتی حکم کی منتظر ایک طرف کھڑی رہا کرتی۔ کوئی نہیں جانتا

تھا کہ وہ چلتی پھرتی ٹیپ ریکارڈر ہے اور سب کی باتیں من و عن روحی کے سامنے دوہرا دیتی ہے!۔

چنانچہ سعید صاحب اور آمنہ بیگم کی جو تفصیلی گفتگو ناصر کی والدہ محترمہ سے ہوئی تھی وہ رات کو دروازہ بند کر کے پردہ برابر کر کے بہت چپکے چپکے جمالی نے روحی سے دوہرا دی۔! اور پھر بعد میں اس گفتگو پر تبصرہ کرتی ہوئی بولی۔

"میں تو جانوں بی بی۔ بڑے سرکار نے تبھی ناصر بھیا کی اماں جان کو صاف جواب دے دیا تھا۔ ارے انھوں نے بھی حد کر دی۔ ایک میل لمبی فہرست سرکار کو سنا دی۔ گھر موٹر اور فریز تو ان موٹی تازی بیوی کی زبان سے چپک کر رہ گئے تھے۔ ایسی ہی فہرست تمام لڑکی والوں کو پکڑا دیتی ہوں گی۔ کوئی خاک ان کا مطالبہ پورا کر سکے گا؟"

"بے چارے ناصر بھائی اپنی اماں جان کی زبردستیوں کے آگے یونہی لنڈورے رہ کر بڈھے ہو جائیں گے"۔ روحی بولی "اچھا تو تو اب یہ بتا بہن کہ خدانخواستہ کسی کی زبان سے سوچ کے جواب دینے کا وعدہ تو نہیں نکلا تھا!"

اب کیا نکلے گا؟" جمالی نے کہا پھر مسکرا کر بولی "بی بی میں سچ کہتی ہوں کہ آپ کے لائق بس وہ تصویر والے صاحب ہی ہیں۔ ہاہ۔ میری آنکھیں چھاب سے ہو گئیں۔ تصویر دیکھ کر۔ کیا وہ سچ مچ اتنے ہی خوبصورت ہیں!"

تصویر سے کہیں زیادہ اچھے!" روحی خوش ہو کر بولی "کاش تو انھیں دیکھ سکتی جمالی۔ جتنے وہ صورت کے اچھے ہیں نا اتنے ہی مزاج کے بھی عمدہ آدمی ہیں بس تو دعا کیا کر کہ خدا ان کے سوا مجھے کسی اور کا نہ بنائے!"

ارے ہاں۔ ایک بات تو میں آپ سے کہنا بھول ہی گئی تھی نہ وہ اچھل پڑی ہو مگر نہیں! جب تک آپ مجھے وہ نیلا پھولدار شرٹ دینے کا وعدہ نہ کریں

گی۔ میں وہ بات بالکل نہیں سناؤں گی!"

"ارے ایک نہیں تو پچاس شرٹ لے لے جمالی" روحی پلنگ سے اتری اور جمالی کے پاس قالین پر آ بیٹھی" بتا دے کیا بات ہے۔ اور لے لے اپنا پسندیدہ شرٹ!"

"ابھی اس دن میں سرکار اور بیگم صاحب کی خدمت میں حاضر تھی!" جمالی نے کہا "وہ لوگ آپ کی وجہ سے بہت فکر مند ہیں!" کہہ رہے تھے کہ اگر روحی شکیل کو اتنا ہی پسند کرتی ہے تو کیوں نہ ہم ایک دفعہ اس لڑکے کو اپنے ہاں بلا کر اسے دیکھیں۔ صورت کا کیسا ہے۔ بات چیت کس انداز کی کرتا ہے۔ اس کا حسب نسب گھرانا کیسا ہے۔ اگر کچھ معقول ہوا تو پھر روحی کی ہی مرضی سہی۔! اس پر بیوی جی نے کہا کہ کیا کہہ کے بلائیے گا تو سرکار بولے کر کوئی نذر نیاز کا بہانہ کر کے روحی کی کلاس کے سارے لڑکوں اور اس کے استادوں کو بلا بھیجیں گے۔ وہ لڑکا بھی آئے گا بس اطمینان سے دیکھیں گے!"

"سچ؟" فرط مسرت سے روحی کا چہرہ رنگین ہو گیا!۔

ہاں؟" تائید کے زور میں جمالی نے جلدی جلدی پلکیں جھپکائیں۔

"مگر پھر کوئی ایسی بات ہوئی تو نہیں ابھی تک؟"

"ہوتی کیسے۔ یہ ناصر بھیا کی اماں جان جو بیچ میں ٹپک پڑیں!"

جمالی سن!" روحی نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے جوش سے بھرے لہجے میں کہا "میرا دل کہتا ہے کہ ڈیڈی اور ممی کو وہ ضرور پسند آئیں گے۔ خدا کرے کہ ـــــ!"

"آپ بیوی جی کو تصویر تو دکھا دیجئیں کہ یہی ہے وہ لڑکا جسے میں پسند کرتی ہوں"

"بیوقوف۔ میرا یونیورسٹی جانا بھی بند کرائے گی کیا۔ خبردار، کوئی ایسی بات چلے تو تصویر کا تذکرہ بھولے سے نہ کرنا!۔ سمجھی!"

"اچھی طرح۔!"

"خدا کرے کہ ان کی امی کا آپریشن جلد ہوئے۔ انھوں نے وعدہ کرلیا ہے کہ جیسے ہی ان کی امی ٹھیک ہوں گی۔ یہاں لائیں گے!"

"مگر بی بی ایک بات ضرور ہے!۔ برا نہ مانو تو کہوں۔؟"

تو دس باتیں کہہ جمالی۔! میں برا نہیں مانوں گی۔!" روحی مسرور انداز میں اس کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی!۔

بی بی سنو!" جمالی اس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتی ہوئی کچھ ہچکچا کر بولی: "جیسا کہ تم نے کہا تھا۔ وہ صاحب چھوٹے سے گھر میں رہتے ہیں۔ ان کے پاس موٹر نہیں ہے۔ ٹی وی نہیں ہے۔ روپیہ پیسہ نہیں ہے۔ ابھی تو وہ پڑھ ہی رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ ان کی کہیں نوکری چاکری بھی نہیں ہے۔ پھر ان کی امی آنکھوں سے معذور ہیں۔ تو بی بی۔ مجھے یہ بتاؤ کہ اگر ان سے تمھاری شادی ہو بھی جائے گی تو کیا تم ان کے گھر کا سارا کام کر سکو گی۔ روکھی سوکھی کھا کر گزارہ کر سکو گی۔ بی بی تم تو شہزادیوں کی طرح رہتی سہتی ہو۔ وہ دوسری طرح کی زندگی تم سے گزاری جائے گی۔؟ کہیں تم اپنے کیے پر پچھتاؤ گی تو نہیں۔ شادی ہونے کے بعد پھر حالات کچھ اور ہو جاتے ہیں مطلب یہ کہ آج جو آدمی صرف دوست ہے۔ برابری پر ہے۔ کل کو شوہر بن کر تمھارا آقا بن جائے گا۔ اس کا کہا تم کو ماننا پڑے گا!۔ اور پھر آگے چل کر بچے بالے۔۔ تم اپنے مزاج کی اتنی اٹل ہو بی بی؟۔ تم نے سب کچھ سوچ لیا ہے؟۔"

روحی نے آنکھیں بند کر کے شکر آمیز لہجے میں کہا "ہاں۔ جمالی۔ سب کچھ سوچ لیا ہے؟" "میں نے۔ تجھے میں کیا سمجھاؤں۔ تو محبت کا فلسفہ نہیں سمجھ سکتی جمالی، محبت، ایثار، قربانی، تیاگ، جاں نثاری کا نام ہے۔ آدمی جس سے محبت کرتا ہے۔ اس کی ذات میں مدغم ہو جاتا ہے پھر من و تو کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا۔ ان دو محبت کرنے والوں کے سینوں میں صرف ایک دل دھڑکتا ہے۔ ان کی مسرتیں ان کے دکھ سکھ ان کے جذبات ان کے محسوسات حتّیٰ کہ ان کی جانیں تک ایک ہو جاتی ہیں۔ کسی سے وابستگی کا تصور بڑا جانفزا ہوتا ہے۔ محبت میں جب من تو شدم تو من شدی کا معاملہ ہو گیا تو پھر صبر و برداشت کی باتیں بڑی دور جا پڑتی ہیں۔ محبت کوئی پر مسرت چیز نہیں ہے جمالی۔ محبت بہت تکلیف دہ اذیت ناک خلش آمیز جذبہ ہے۔ اس میں دکھ سہنا ہی پڑتا ہے۔!"

"تمہاری باتیں میری سمجھ سے اونچی ہیں۔ اچھا سنو۔ میرا بھی ایک کہا مان لو!"

"کہہ دیوانی۔ بڑی نانی دادی بن کر نصیحت فرما رہی ہے!"

تمہاری شادی تصویر والے صاحب سے ہو جائے نا۔ تو تم ۔۔!"

"تمہارے منہ میں گھی شکر جمالی!"

"اونہہ!۔ بی بی پوری بات تو سنو۔ میں یہ کہہ رہی تھی کہ پھر تم مجھے اپنے ساتھ لے چلنا۔ میں تمہارے جانے کے بعد یہاں نہیں رہ سکتی۔ میں تمہارے گھر تمہاری کنیز بن کر رہوں گی۔ میں وہاں سارے گھر کا کام کر دیا کروں گی اور ان بڑی بی کی خدمت بھی کروں گی۔

"سچ مچ جمالی!"

"بالکل سچ بی بی! مجھے تو اس خیال ہی سے رونا آجاتا ہے کہ جب اس گھر میں تم نہ رہو گی تو پھر میں یہاں رہ کر کیا کروں گی۔ یہ در و دیوار، یہ کمرے یہ دالان۔ جہاں جہاں تم چلتی پھرتی ہو۔ جہاں تمھاری خوشبو بسی ہے۔ جہاں تمھاری آواز رچی بسی ہے۔ یہ سب مجھے کاٹنے کو نہ آئیں گے!"

"جمالی؟"

ہاں بی بی!

جمالی۔؟

جی بی بی۔!

اب تیری سمجھ میں آیا کہ محبت کیا چیز ہوتی ہے؟۔

"ہاں بی بی۔ اب سمجھ میں آگیا۔ محبت سچ مچ بہت عجیب چیز ہوتی ہے۔ جو سمجھ میں کبھی نہیں آتی۔ جو سمجھائی بھی نہیں جاسکتی!۔

صبح کو حسبِ معمول روحی لباس وغیرہ تبدیل کر کے طعام خانے میں آئی۔ بکھرے بالوں کے "پیش منظر" میں اس کا صبیح و شگفتہ چہرہ نودمیدہ گلاب لگ رہا تھا!"

سید صاحب نے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔ اور اس کے چہرے کا غائر نگاہوں سے جائزہ لیا۔ انھیں وہ کچھ سادہ سادہ سا لگا!۔ مگر وہ کچھ نہ بولے البتہ آمنہ بیگم نے چونک کر کہا۔

"یہ کیا۔ بالیاں اور گلے کی زنجیر کہاں ہے۔ اتار کے رکھ دی ہے کیا؟"

ممی وہ۔! روحی نے ندامت و خجالت کا خاطر خواہ تاثر آنکھوں میں سمو کر مدھم لہجے میں بولی "ممی۔ میں بہت پریشان ہوں۔ ڈر رہی تھی کہ کہیں آپ پوچھ نہ لیں۔ وہ۔ ہوا یہ ممی کہ ہفتہ بھر پہلے بی اے کی لڑکیوں نے جو چھوٹا سا ڈرامہ کیا تھا نا۔ تو اس میں باہر کی لڑکیوں نے بھی حصہ لیا تھا۔ ایک لڑکی نے مجھ سے

کچھ دیر پہننے کے لیے بالیاں اور لاکٹ مانگا تھا۔ میں نے دے دیئے کہ ڈرامہ ختم ہو گا تو مجھے واپس کر دے گی۔ مگر وہ شاید بھول گئی اور دونوں چیزیں پہنے پہنے چلی گئی۔ اس عرصے میں کتنوں سے میں نے پوچھا ہے کہ وہ جو کالی سی لڑکی تھی اس کے نام پتے سے کوئی واقف ہے۔؟ سب نے انکار کر دیا۔!"

"درجنوں کالی لڑکیاں کالج میں بھری ہوں گی" آمنہ بیگم نے خفا ہو کر کہا "تم نے اس ٹھگ چھوکری کا نام پتہ پوچھے بغیر اپنی چیزیں دے کیسے دیں۔ ایک تم ہی نصیب ہوئی تھیں اسے ؟"

"میں خود اتنی شرمندہ اور پریشان ہوں ممی۔ !" روحی زیادہ پُرسوز لہجے میں بولی "قسم سے ممی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ اتنی چور ہو گی۔ پانچ چھ ہزار کی چیزیں ہوں گی!"

"خیر بھئی۔ آئندہ احتیاط رکھو۔ اب بہے ہوئے دودھ کا ماتم کب تک" سعید صاحب نے کہا "جو چیز گئی۔ سمجھو کہ تقدیر میں نہیں تھی۔ بیٹی تم دل پر اثر نہ لو۔ ہم تمہیں ویسی ہی چیزیں اور بنوا دیں گے!۔ ہاں۔ اب کہو کسی سے ناشتہ لے آئے!۔ مجھے دیر ہو رہی ہے!"

آمنہ بیگم آج کچھ ضرورت سے زیادہ برہم سی ہو رہی تھیں۔ کچھ تو اپنی ناقابلِ احترام بھاوج کی کمینگی کا اثر تھا کچھ دوسری فکریں تھیں۔ روحی کے زیوروں کی گمشدگی نے انھیں زیادہ خفا کر دیا تھا۔ وہ ایک سلائس لے کر انھوں نے چائے پی اور چلی گئیں۔

سعید صاحب آہستہ سے کھنکارے اور بولے "یونیورسٹی جا رہی ہو تم ؟"

"جی!"

"اچھا بیٹی دیکھو! میں تم سے یہ کہنے والا تھا کہ میں تمہارے اساتذہ صاحبان اور کلاس کے ساتھیوں سے ایک بار ملنا چاہتا ہوں۔ اگر میں انھیں گھر پر مدعو کروں تو کیا وہ چلے آئیں گے ؟"

روحی کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے جسم کا سارا خون اس کے چہرے پر جمع ہو گیا ہو۔ سعید صاحب اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس نے جلدی سے پانی کا گلاس اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔ پھر آواز سنبھال کر بولی۔

"یہ میں کیسے بتاؤں ڈیڈی۔! ان کی مرضی!؟"

"تعجب ہے کہ اتنی شرافت و تہذیب ان میں نہ ہو گی۔ خیر! میں ایک معمولی سا ایٹ ہوم سلیبریٹ کر رہا ہوں۔ انھیں دستی کارڈ بھیجوں گا!۔ آنا نہ آنا بقول تمہارے ان کی مرضی پر منحصر ہے۔ تمہیں کبھی وقت ملے تو ان کے اسمائے گرامی لکھوا دینا۔!"

روحی سر جھکائے کیک کا ایک پیس ٹونگتی رہی۔! اور سوچتی رہی کہ سعید صاحب کا لہجہ کتنا اجنبی اور برہم سا تھا! آج تک کبھی انھوں نے ایسے متاثرانہ لہجے میں کم از کم اس سے بات نہ کی تھی!۔ خفا ہیں ڈیڈی۔! انھیں اور کون سی نئی بات معلوم ہو گئی ہے۔ کہیں یہ غضب تو نہیں ہو گیا ہے کہ اس کی غیر موجودگی میں انھوں نے الماری میں رکھی شکیل کی تصویر دیکھ لی ہو۔!؟ اس خیال کے ساتھ ہی اس کے ہر مسام نے پسینے کا آبشار سا جاری کر دیا۔ شکیل کی تصویر کے پیچھے دفتی پر اس نے بڑے خوشخط انداز میں ایک پر محبت سا شعر بھی لکھ رکھا تھا۔

میرے شکیل سے

لمحہ لمحہ نفس نفس مجھ کو

تجھ سے کیا بیکراں محبت ہے

اگر یہ چیزیں جو ایٹم بم سے کم نہیں ہیں۔ اور ان لوگوں کے ہاتھ لگ چکی ہیں تو پھر پرخچے ان کے نہیں خود روحی کے اڑیں گے!۔

سعید صاحب کافی کا دوسرا کپ پی رہے تھے۔ تبھی وہ معذرت کر کے اٹھی

اور اندر بھاگی۔ الماری کھول کے دیکھا کہ تصویر اپنی جگہ پر تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے سکون کی گہری سانس لی اور پھر تصویر اس چور خانے میں چھپا دی جس کی موجودگی کا پتہ شاید اس کے سوا کسی کو نہ تھا!۔

جمالی اندر آئی "بی بی۔ وہ کوئی چپراسی سا آدمی آیا ہے آپ کو پوچھ رہا ہے"
اسے تو ہر دم دہشت ہی لگی رہتی تھی۔ جھپٹتی ہوئی باہر نکلی اور نینا کے ملازم پر نظر پڑی تو ذرا دل ٹھہرا۔

اس نے دانت نکال دیے "وہ صاحب۔ یہ رقعہ دیا ہے۔ بڑے سرکار نے۔ اور چھوٹی بٹیا نے کہلوایا ہے کہ اگر آپ کو فرصت ہو تو آج کسی وقت گھر آ کے مل جایئے!"

"ہائیں!" روحی اچھل سی پڑی "یہ کیا؟ ابھی کل تک چڑیل کالج آئی ہے اور اب پرسوں جمعہ کو عقد مسعود ہے۔ واہ خوب۔ اچھا سنو۔ رحیم خاں۔ کیا احسان صاحب اپنے گھر آ گئے ہیں۔!

"آ گئے ہیں صاحب!"

"اچھا تم جاؤ۔ میں آج ہی نینا سے ملوں گی۔ اس سے کہہ دینا۔ تمہارے ہاں تو شادی کی خوب تیاریاں ہو رہی ہوں گی"

"جی ہاں۔ اب آپ آ کے دیکھئے۔ احسان میاں دو ہفتوں بعد پھر جا رہے ہیں نا اس لیے ان کی امی نے جلدی تاریخ مانگ لی ہے۔ اچھا اب میں چلوں؟"

ملازم کو رخصت کرنے کے بعد اس سے گھر پر ٹھہرنا محال ہو گیا۔ آمنہ بیگم کو نینا کی شادی کا کارڈ تھما کر وہ بولی۔

"آج میں یونیورسٹی نہیں جا رہی ہوں ممی!۔ مجھے نینا نے بلایا ہے۔

اب وہ مجھے کب واپس آنے دے گی۔ معلوم نہیں۔ آپ رات کے وقت میرا انتظار نہ کیجئے گا۔ اچھا ممی بائے۔!"

نینا کے ہاں واقعی اتنی پُرشور چہل پہل تھی کہ ابھی سے کان پڑی آواز کا سنائی دینا دشوار ہو رہا تھا! شادی میں صرف دو تین دن تھے۔ لہٰذا تیاریاں زوروں پر تھیں۔ چند مزدور باہر کا لان ہموار کر رہے تھے۔ ایک طرف چھ سات نوعمر لڑکے بیٹھے رنگین اور سنہری جھنڈیاں بنا رہے تھے۔ دیوان خانے میں نینا کے ابا اور چند بزرگ موٹی موٹی آوازوں میں باتیں کر رہے تھے۔ اندرونِ دالان میں ابھی سے خواتین کا جمگھٹا لگنے لگا تھا۔ روحی کو شادی بیاہ کے پُرمسرت ہنگاموں سے بے حد دلچسپی تھی۔ وہ اس کی امی کو یونہی سا سلام کرتی نینا کے کمرے کی طرف بھاگ گئی!۔

یہاں کئی ایک شوخ و شریر لڑکیاں زرد لباس میں ملبوس بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ ہنس رہی تھیں۔ ایک پلنگ پر نینا بیگم بھی زرد مانجھے کے کپڑے پہنے جلوہ افروز تھیں۔ مگر کسی قسم کی فکر، پریشانی یا تردد کے آثار ان کے شوخ و شنگ چہرے پر نہ تھے۔ روحی کو دیکھ کر وہ مسکرائی! اور شریر آواز میں بولی۔

"بددعائیں دے دے کے آخر یہ نوبت بلا دی نا۔ اچھا نہیں لگ رہا تھا میرا ساتھ۔ اب میں تو چلی پیا کے دیس۔ اکیلی پھرا کرنا یوسفِ بے کارواں ہو کر۔ مگر تم اکیلی کیسے خالہ جان نہیں آئیں!"

خالہ جان آئیں چاہے نہ آئیں!" روحی اس کے پلنگ پر بیٹھ کر آدھی اس پر لد گئی اور دانت پیس کر بولی "تم یہ بتاؤ بے شرم کہ کس نے تمہارے حق میں بددعا کی۔ اپنے خود ہی مارے ارمان پھٹے پڑتے تھے۔ جب دیکھو تب احسان بھائی بے چارے نوکِ زبان پر۔ جانے کون سی گھڑی کیسی تھی کہ آخر ہیر

عبرتناک وقت، آہی گیا! ۔ اب بھی چڑیل کو احساس نہیں۔ منھ کھولے دانت
نکالے ایک ایک کو گھور رہی ہے۔ ارے ینا کی بچی تجھے آخر حیا شرم کب آئیگی!
بس اسی کو لیے بیٹھی ہو" فرخندہ نے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا "بچی یہ اتنی
ڈھیٹ بے غیرت ہے کہ جب خالہ اماں ہم لوگوں کو مانجھے کے زرد کپڑے رنگ
لینے کی ہدایت کر رہی تھیں تو اس نے کہا تھا کہ خیال رہے رنگ چوکھا آئے

مارتے مارتے چھوڑ دیا خالہ اماں نے!"

عجیب مصیبت ہے" ینا نے آنکھیں نکالیں "ارے شادی میری ہو رہی
ہے کہ کسی اور کی۔ کیا تماشہ ہے کہ مجھی کو ارمان نہ ہو۔ واہ۔ کوئی انصاف کرے
یہ میرے سرخ و سفید کلر پر زرد پھیکے بدرنگ کپڑے کیا کھلتے؟ ۔ ذرا سی میں نے
رائے دی تو کیا غضب کیا؟"

"آیا کہیں سے سرخ و سفید کلر۔!" زاہدہ بولی "خاصی بجھنگی ہے۔ تجھ سے
تو احسان بھائی لاکھ درجے سفید ہیں۔ شام کو آئے تھے۔ خالو جان سے کچھ
باتیں کرنے۔ قسم سے ڈارک سرمئی شیروانی اور موٹی موٹی مونچھوں میں ایسے
سجیلے نوجوان لگ رہے تھے کہ میری تو نظر لگتے لگتے رہ گئی!"

"بس بیوی۔ یہ اچھی بات نہیں ہے" ینا نے سنجیدگی سے کہا "کسی کے
میاؤں کو گھورنا بدنظری ہے۔ اب اگر تم نے دوبارہ مدعی ان کی مونچھوں
کو ہونس دیا ہو تو ایک ایک بال ہتھیلی پر آجائے گا نا؟"

کتنی ماتما سے کہتی ہے "ان"! جل کر فوزیہ نے اس کے ایک چٹکی لی "سمجھ
ہی میں نہیں آتا۔ ایسی محبت کہاں سے پھوٹ پڑی ہے۔! احسان بھائی خوش
نصیب ہیں ایسی محبت کرنے والی بیوی مل رہی ہے۔ کبھی جوان کی شیروانی
کا دامن یہ چھوڑے۔ ہمزاد بنی ہر جگہ ساتھ جائے گی!" نورین نے کہا

"اے اللہ رکھیے جائیں گی ہی۔ اور پھر کیا۔ لفنگوں اُچکوں کے بیچ کیا ان معصوم جان کو یونہی چھوڑ دوں گی۔ میرا میاں کتنا بھولا بھالا بونگا سا ہے۔ میں خوب جانتی ہوں۔! نینا نے کہا۔

بس اب سسرال سے احسان بھائی کو یہی خطاب ملے گا۔ بونگا!" خورشید نے کہا۔

ارے یہ باتیں رکھو ایک طرف!" روحی ان کی آوازوں پر اپنی آواز ابھار کر بولی: "پہلے میری حیرت دور کرو۔ یہ اچانک ہوا کیا؟ جنگل کا جنگل ہرا ہو گیا۔ اس تنہا خور نے کچھ کہا ہی نہیں۔ اکیلے اکیلے مانجھے بیٹھ گئی!۔ اور ۔۔۔ !"

کیا مطلب؟۔ تنہا خور" نینا نے جیسے کہ برا مانا: "تنہا وہ میرا ہی میاں تو ہے ۔۔!

"بس خبردار۔ اب میاں۔ میاں کی بکواس کی تو گدی سے زبان کھینچ لوں گی:" نوزیہ بھپر گئی: "معلوم ہے کہ ایک کلیجڑا سا احمق ملا جارہا ہے۔ لڑکی جامے ہی سے باہر ہوئی جارہی ہے۔ لو۔ منہ سی کر چپ بیٹھنا اب"

مگر میں اس انقلاب کی وجہ تو پوچھ لوں پہلے!" روحی بے بسی سے بولی۔

"یہ میری بات کا جواب دے لے پھر سی دینا منہ۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا!" میں مانجھے کی دلہن ہوں۔ بیوی" سنجیدگی سے نینا نے کہا: "اب پٹاپٹ نہ بولوں گی سچ تو ہے۔ پرسوں جمعہ کو میرے منہ پر نور نہ اترا تو ساس اماں کیا کہیں گی!"

ہائے ہائے۔ کیا بے شرم چھوکری ہے۔ خدا بچائے!" فرخندہ نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

ساس اماں۔؟" ہنستے ہوئے نورین نے کہا "ذرا تم لوگوں نے دیکھا۔ ماشا نقطہ احسان بھائی کی نہیں اٹھتی۔ ساس اماں کے لیے بھی ابھی سے دل پھڑ پھڑا رہا ہے۔ سچ پچ تم سسرال جا کے ناک جڑ سے کٹواؤ گی نینا۔ اب بھی سویرا ہے کچھ تیہوڑ کر بیٹھو۔!"

"اوے خدا کے لیے مجھ سے کہو نا۔ احسان بھائی کب آئے اور کب یہ بات پکی ہو گئی۔؟" روحی نے پھر پوچھا۔ اور نینا کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا وہ نفی میں سر ہلا کر بولی۔

"ان کم بختوں سے پوچھو۔ جو کچھ پوچھنا ہے۔ میں اب ہونٹ نہ ہلاؤں گی۔ واہ۔ اب کیا سچ پچ چاہتی ہو کہ میرے منہ کی رونق اڑ جائے!"

رونق کی بچی!" روحی نے دانت پیس کر کہا۔

ایک ملازمہ نے دروازے سے جھانکا! "آپ سب کو بڑی اماں دالان میں بلا رہی ہیں۔ دلہن کے جوڑے ٹانکنا ہے۔ کہہ رہی ہیں جلدی آکے کام نپٹا لیجیے۔ وقت کم ہے!" "سچ پچ جلدی چلو" لڑکیاں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "خالہ اماں نے مجھ سے پہلے ہی کہا تھا"

اوے ڈھولک کے گیت نہ گاؤ گی کیا خورشید؟" نورین چلائی۔

"رات کو۔!"

"البتہ تم لوگ جاؤ۔ میں اس شیطان کی خالہ سے سارا حال پوچھ کر ابھی آتی ہوں"

روحی نے خوشامد سے کہا۔ چنانچہ وہ سب روحی کو نینا کے پاس چھوڑ کر باہر نکل گئیں۔ تب روحی نے اس پر گھونسہ اٹھایا اور بولی "ہاں اب بولو بیگم صاحب۔ سچ پچ تم اتنی خوش ہو کہ بلبل کی طرح چہک رہی ہو

تمھیں چپ نہ لگی ؟"

"لگ جائے گی کل پرسوں تک !" بڑے خلوص سے نینا نے کہا۔ "ابھی تو میں خود کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ یہ سب خواب ہے۔ ابھی آنکھ کھل جائے گی۔ پھر وہی تم سب ہوگی۔ وہی گھر ہوگا۔ وہی میں ہوں گی !" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولی۔ "مجھے بھی تو کچھ پتہ نہ تھا۔ ابھی احسان صاحب کے آنے میں دیر بھی تھی۔ مگر وہ دفعتہً آپہنچے۔ ان کی نانی کی طبیعت خراب ہے۔ وہ چہیتے نواسے کا سہرا دیکھنا چاہتی ہیں !۔ بس اس کے بعد ان کا ٹرانسفر ہو جائے گا !"

احسان بھائی کا ؟" روحی نے پوچھا۔

"نانی کا۔ یہاں سے وہاں !" نینا کی سنجیدگی میں فرق نہ آیا۔ روحی کو ہنسی آگئی پھر وہ سنجیدہ ہو کر بولی۔ "مگر نینا۔ تمھارے جانے کے بعد میں کتنی اکیلی ہو جاؤں گی۔ اب کیا تم یہ سال پورا نہ کرو گی ؟"

اب میرے اختیار میں کیا ہوگا روحی ؟" وہ دکھ سے بولی۔ "میں تو جمعہ کی شام ہی کو کلکتہ چلی جاؤں گی۔ اور بس۔ یہ دن یہ راتیں یہ تمھارا ساتھ یہ سب خواب ہو کر رہ جائے گا !" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور سر جھکا کر چادر کی شکنیں درست کرنے لگی۔ روحی بھی خاموش تھی !۔ اسے افسوس ہو رہا تھا !۔ کیا تقدیر ہوتی ہے لڑکیوں کی بھی۔ اپنے بس میں کچھ بھی نہیں۔ ہزار پڑھ لکھ گئیں۔ ترقی پسندی کا دعوٰی بھی کیا۔ مگر رہیں وہیں بابل کے آنگن کی گائے۔ جس کے ہاتھ میں باپ نے رسی تھما دی۔ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑیں !۔

"روحی۔ !" نینا نے اسے مخاطب کیا۔

وہ اپنی سوچوں سے ابھری اور اسے تکنے لگی۔!

"اب مجھے کیسے معلوم ہو سکے گا کہ تمہارا کیا ہوا۔ وہ تین پرپوزل تمہارے آئے تھے نا۔ ان کا کیا ہوا۔"

مجھے پتہ نہیں۔ ابھی کل ہی پرسوں نام بھا، کی امی کو جواب دیا گیا ہے۔" روحی بولی۔" دوسرا ہنوز موجود ہے۔ اب وہ مصیبت بھی ٹلے تو میں سمجھوں کہ میں بھی خوش نصیب ہوں۔"

"تم تو شکیل صاحب۔!"

شکیل صاحب!" روحی نے گہری سانس لے کر کہا۔" شکیل صاحب کی رسائی نہ ہمارے یہاں ہے نہ ڈیڈی ممی انھیں جانتے ہیں۔ خود ان کا یہ حال ہے کہ جب کبھی اس قسم کا تذکرہ آتا ہے وہ الٹا مجھے سمجھانے لگتے ہیں کہ یہ طبقاتی فرق ہمیں ایک دوسرے کا نہ ہونے دے گا! نجانے انھیں کہاں سے یہ وہم ہو گیا ہے کہ میں بھی عام لڑکیوں کی طرح دولت کی پرستار ہوں۔ میں اپنے منھ سے کیسے سمجھاؤں کہ میرے نزدیک دولت بے حقیقت چیز ہے!"

تم سچ کہتی ہو روحی۔!" نینا نے کہا۔" جب دو دل ایک ہوں تو دولت کی اہمیت اور افادیت ثانوی چیز بن جاتی ہے۔ کیا فائدہ اس سے کہ تم میجر مصطفیٰ کی بیوی بن جاؤ۔ سونے چاندی کی سیج پر سوؤ۔ دولت میں کھیلو، مگر تمہیں دلی سکون نہ مل سکے۔ سچی محبت بڑی قیمتی نعمت ہے روحی۔ اگر شکیل صاحب اپنے قول و فعل میں مخلص ہوں تو ان کا ساتھ نہ چھوڑنا۔ محبت بجائے خود ایک دولت ہے روحی۔ وہ اپنا شیش محل آپ تعمیر کر لیتی ہیں۔ تم اچھی طرح سوچ لو!"

"ٹھیک ہے نینا۔ تم سب سچ کہہ رہی ہو۔ تمہارے سوا اتنی پیاری اتنی قیمتی

باتیں کسی نے مجھ سے نہیں لیں۔" روحی متاثر ہو گئی۔" مگر میں ڈرتی ہوں۔ ایک طرف ڈیڈی ممی اور مصطفےٰ صاحب کا خاندان ہے۔ دوسری طرف میں اکیلی۔ کوئی سخت مقابلہ ہوگا تو کیا میں ہار نہ جاؤں گی!"

"کاش میں شکیل صاحب سے ایک بار مل سکتی!" نینا نے کہا۔" ان سے کہتی کہ اگر آپ کی امی مجبور بھی ہیں تو کیا۔ انھیں ڈائریکٹر صاحب کے پاس لے جائیے! اور روحی کا ہاتھ طلب کیجئے۔ مگر اب کہاں موقع ہے! میں تو قید ہوں۔ اور وہ مجھ تک پہونچ نہیں سکتے!"

"نینا۔ تم یہ سب کچھ دل سے کہہ رہی ہو؟" روحی متحیر بھی تھی مسرور بھی۔

"ہاں روحی۔ میں چاہتی ہوں کہ تم اپنی آرزو کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گزارو۔!"

"نینا۔ میں تمہارے پاس سے ان کی امی سے ملنے جا رہی ہوں۔" روحی سرگوشی میں بولی۔"

اگر وہاں شکیل صاحب ملے تو کیا میں انھیں تم سے ملنے کے بہانے لے آؤں خالو جان یا خالہ اماں کو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا!۔ مگر تم کہنا مت کسی سے کہ میں ان کے گھر جاتی ہوں۔"

توبہ کرو۔ میں کس سے کہنے جاتی ہوں۔" نینا نے کہا۔ پھر جلدی سے کچھ یاد کر کے بولی۔" مجھے اپنے گلے کا ہار لینا تھا۔ جوہری نے مجھے گیارہ بجے بلایا تھا۔ اب بہانہ اچھا ہے۔ میں امی سے کہہ دوں گی کہ تمہارے ساتھ ہار لینے جا رہی ہوں۔ ادھر سے ہم شکیل صاحب کے گھر چل دیں۔ کیا خیال ہے؟"

اگر شکیل صاحب نہ ملیں؟" روحی بولی۔

توکیا۔ ان کی امی کو سب سمجھا دوں گی!" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ تم ذرا امی

کو تو یہاں بلا لاؤ!" روحی کے تو دل سے لگی تھی۔ وہ بھاگ کر اس کی امی کو بلا لائی۔

بینا کو واقعی اپنا گلوبند لینا تھا۔ چنانچہ اس کی امی نے روحی کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔ اس نے زرد لباس اتار کر روزمرہ کے سیدھے سادے کپڑے پہن لیے اور روحی کے ساتھ چل دی۔ روحی کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہ رہا تھا!۔ اس کی تقدیر اس روز اس کا ساتھ دے رہی تھی۔! جوہری کے ہاں گلوبند تیار تھا۔ وہ لے کر جب شکیل کے ہاں پہنچی تو وہ خلاف معمول گھر پر مل گیا۔ لیکن کس حال میں۔ دالان میں چوکی پر بیٹھی ناظمہ بیگم بچوں کی طرح رو رہی تھیں اور شکیل ان کے پاس بیٹھا اسی طرح سمجھا رہا تھا جیسے بزرگ کسی بچے کو سمجھاتے ہیں۔ آہٹیں سن کر بڑی بی کی سسکیاں تھم گئیں اور شکیل نے بھی سر اٹھایا۔ پھر وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا!۔

آپ لوگ؟" وہ حیرت سے بولا۔ "مگر کل دوپہر تو محترمہ رابعہ فاطمہ کے عقد کا کارڈ چشتی صاحب کو ملا ہے اور آج آپ یہ نفس نفیس غریب خانے پر نظر آ رہی ہیں!"

کون آیا ہے بیٹا۔!" ناظمہ بیگم نے پوچھا۔

میرے ساتھ جو بچیاں پڑھتی ہیں نا امی۔ وہ آئی ہیں!"

بچیاں؟" بینا نے بڑا سا منھ بنا کر کہا۔

ارے تو انھیں بٹھاؤ ادھر تخت پر بیٹا۔!" ناظمہ بیگم نے کہا۔ "اور کھڑکی سے سفینہ کو آواز دو۔ آ کے چائے بنائے۔!

"کیوں امی۔ آپ ابھی رو کیوں رہی تھیں؟" روحی نے ان کے پاس بیٹھ کر بڑی دلسوزی سے پوچھا۔ اس کی دیکھا دیکھی بینا بھی وہیں بچھی دری پر ٹک گئی!۔

امی ابھی ادھر دہلیز پر گر پڑی تھیں ..!" شکیل نے بڑے درد سے کہا: ماتھے پر چوٹ لگی ہے اور گھٹنے بھی چھل گئے۔ میں امی سے کہتا ہوں کہ آپ چلا پھرا نہ کیجئے۔ یہی ہوتا ہے ..!"

ایک جگہ بت بنی کیسے بیٹھی رہیں گی؟" نینا نے کہا: "جی نہ گھبرا جائے گا!" پھر دونوں نے انہیں اٹھا کر تخت پر آرام سے لا بٹھایا۔

آج آپ یہاں نظر آرہے ہیں شکیل بھائی ..!" اچانک نینا نے اسے بھائی کے رشتے سے سرفراز فرماتے ہوئے کہا۔ "ہمیں توقع نہیں تھی کہ آپ ہم سے مل سکیں گے ..!"

جی ہاں۔ آج میں امی کو ڈاکٹر صاحب کے پاس لے جا رہا ہوں۔ آج ہی انھوں نے وقت دیا تھا۔" شکیل نے جواب دیا۔ نینا کے بھائی کہنے سے بیحد خوش ہوا تھا۔ "اب آج وہ معائنہ کرکے بتا دیں گے کہ آپریشن کب کیا جائے گا۔ ابھی میں شاید ہفتہ بھر تک یونیورسٹی نہ جا سکوں گا!"

"تو پھر لے جائیے نا!" نینا نے کہا۔

"دراصل امی کا لباس تبدیل کرانا ہے۔" شکیل نے سر کھجاتے ہوئے بے بسی سے کہا: "آج وہ ہمسائے کی لڑکی سفینہ بھی نہیں آئی ابھی تک۔ پتہ نہیں کیا ہوا۔ میں امی سے کہہ رہا تھا کہ آپ منھ ہاتھ دھو کر کپڑے پہن لیجئے مگر بے چاری غسل خانے جاتے جاتے گر پڑیں۔"

"تو یہ کون سا اہم مسئلہ ہے۔" نینا نے کہا پھر بولی: "زوحی تم خالہ جان کے کپڑے بدلوا دو۔ میں تب تک کچھ چائے وائے بنا لوں۔" وہ مسکرائی "چلیے بھائی صاحب کچن تک میری رہنمائی کر دیجیے ..!"

"مگر آپ۔" شکیل اس کی بے تکلفی پر حیرت سے بولا: "یہ سب کیوں

کریں گی۔ آپ تو خدا کے فضل سے دلہن بننے والی ہیں۔ آپ کی خاطر داری تو مجھ پر لازم ہے۔"

"جب میں اللہ رکھے آپ کے بہنوئی کے ساتھ آپ کے گھر آؤں تو خاطر داریاں بھی کر دیجئے گا اور سلامی بھی تیار رکھیے گا! آیئے چلیں!" نینا نے کہا۔

تشکیل ہنسنے لگا! ۔ روحی بڑبڑائی "بے غیرت کہیں کی۔ یہاں بھی باز نہ آئی!"

بہر حال نینا تشکیل کو باورچی خانے میں لے ہی آئی اور یہاں قدم رکھتے کے ساتھ ہی بولی "آپ کچھ سمجھے کہ میں ایک نازک پوزیشن سے ہمت کر کے اٹھی اور یہاں کیوں آئی ہوں!"

"آپ کو اپنا گلوبند ___!"

"جی نہیں!" اس نے چولھا آن کر کے چائے کا پانی رکھتے ہوئے کہا "میں آپ سے یہ کہنے آئی ہوں کہ اگر سچ مچ آپ کے دل میں روحی کی محبت ہے تو تشکیل بھائی اس کے والدین سے فوری ملیے اور اپنا پرپوزل ان کے سامنے رکھیے آپ کو نہیں معلوم کہ اس کا ایک رشتہ تو بالکل تیار ہے۔ اگر آپ نے سلسلہ جنبانی کی تو جانتے ہیں آپ۔ ایک سنگین حادثہ رونما ہو جائے گا! آپ روحی کو انتہا پسندی، حساسیت اور فطرت سے واقف نہیں ہیں۔ وہ آپ کی محبت میں اتنی دور پہونچ چکی ہے کہ میرے سامنے کئی بار قسمیں کھائی ہیں اگر آپ اسے نہ مل سکے تو وہ جان پر کھیل جائے گی تشکیل بھائی۔ وہ بہت ضابطہ ہے۔ میں سچ سچ کہہ دوں کہ آپ نے اس پر سحر کر دیا ہے۔ اگر آپ نے اسے اپنا نہ لیا تو وہ بے شک خودکشی کر لے گی! یہ باتیں اس سے کہہ نہ دیجئے گا۔ اس کی انانیت اور خودداری پر چوٹ پڑے گی۔ سمجھے آپ؟"

رابعہ ناظمہ! آپ اپنی سہیلی کی اتنی راز دار ہیں۔ اس کے دل کا حال جانتی

ہیں، لیکن میرا کون ہے جس سے میں اپنے دل کا حال کہہ سکوں۔ امی کو آپ دیکھ رہی ہیں۔ اس صورت میں اکیلا میں کس طرح اپنا پرپوزل روحی کے والدین کے سامنے رکھ سکتا ہوں! رابعہ! آپ نہیں جانتیں۔ روحی میری پہلی اور آخری تمنا ہے اگر وہ مجھے مل سکے تو میں زندگی بھر اپنی تقدیر پر ناز کرتا رہوں گا! لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا ہے کہ میں کیونکر۔۔!"

آپ اکیلے کیوں"۔! ابینا نے کہا۔" ہفتہ عشرہ میں خالہ جان انشاءاللہ ٹھیک ہو جائیں گی۔ آپ انھیں لے کے جائیے۔ اچھا سچ سچ بتائیے۔ آپ کو روحی سے کچھ اُنس ہے یا وہ پاگل یکطرفہ بدحواس ہوئی جارہی !"۔

"یہی تو میں نے ابھی آپ سے کہا کہ اپنی سہیلی کے حال سے آپ آگاہ ہیں۔ لیکن میرا کوئی دوست ایسا نہیں جس سے میں حال دل مبتلا کہوں۔ رابعہ!۔ اگر۔۔۔ خدانخواستہ روحی کسی اور کی ہوگئی تو میں نجانے کیا کر گذروں گا۔ پھر زندگی مجھے بوجھ معلوم ہوگی۔ جس کے گرانے کا مجھ میں یارا نہیں ہوگا جو زبردستی میں اٹھائے اٹھائے پھروں گا!۔ شاید پھر میں یہ شہر چھوڑ جاؤں گا!"

"اور روحی دنیا چھوڑ جائے گی!" بینا نے چائے پیالیوں میں انڈیلتے ہوئے کہا۔ اتنی بے دردی سے یہ بات مت کہیئے!" شکیل بولا۔ جب تک شکیل اور بینا کچن میں باتیں کرتے رہے تھے۔ روحی نے ناظمہ بیگم کو لباس پہنا دیا۔ پھر وہ انہیں کمرے کے ایک گوشے میں لے گئی اور بولی۔

"امی!۔ اجازت دیجئے تو کچھ عرض کروں آپ سے!"

کہو میری بچی!" انھوں نے پیار سے اس کے گال چھوئے۔" تم تو میرے ہاتھ پاؤں میری آنکھیں بن گئی ہو۔ دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔ تمہارے لیے!"

امی میرا بے حد جی چاہتا ہے کہ آپ جلد سے جلد اچھی ہو جائیں!" روحی نے کہا

اور ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی۔ "میں آپ کی بیٹی ہوں نا۔ آپ کہہ چکی ہیں نا امی کیا بیٹی کا فرض یہ نہیں ہے کہ وہ آماں کے کام آئے۔ امی۔ سنئیے! یہ تھوڑی سی رقم ہے۔ یہ میں نے آپ کے لیے جمع کی ہے۔ اسے رکھ لیجیے۔ مگر شکیل صاحب پوچھیں تو میرا نام نہ لیجیے گا۔ آپ کہہ دیجیے گا کہ یہ آپ ہی نے جمع کی ہے!"

ناظمہ بیگم بھی شکیل ہی کی ماں تھیں۔ ان کی غیرت بھلا یہ کیسے گوارا کرتی انھوں نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

"بیٹی۔ اپنی مصیبت کی کہانی میں نے اس لیے تم سے نہیں کہی تھی۔ وہ مجبوری کی ایک بات تھی جو کسی کو ہمدرد پاکر میرے منھ سے نکل گئی تھی۔ بیٹی یہ جو بوند بوند تم نے اکٹھا کر کے لٹیا بھری ہے۔ اسے میری طرف سے رکھ لو میری بچی، کھاؤ پیو۔ شکیل نے ڈاکٹر کی فیس کا انتظام کر لیا ہے۔ اب کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ تم کچھ خیال نہ کرنا!"

میرا دل نہ توڑیے امی۔ میں بہت مان کر کے آئی ہوں آپ کے پاس۔ آپ نے یہ قبول کر لیا تو مجھے کتنی خوشی ہوگی!" اس کا لہجہ اتنا روہانسا تھا کہ وہ چپ ہوگئیں روحی نے پورے پانچ ہزار کے نوٹ لفافے میں رکھ کر انھیں تھما دیے!

"ہیں کتنے؟" وہ بدرجہ مجبوری بولیں اور سوچا کہ جب آپریشن ہو چکے گا تب روحی کو واپس کر دیں گی!"

"بہت تھوڑے سے ہیں امی!" وہ اب خوش تھی۔ لہٰذا آواز بلند کر کے بولی۔

"یہ بھائی بہن چائے بنا رہے ہیں کہ بریانی پکا رہے ہیں۔ چائے میں اتنی دیر؟" دونوں باورچی خانے سے نکلے، بینا نے چائے کی کشتی اٹھا رکھی تھی۔

شکیل نے کہا۔ "یہ تو مستقبل قریب کی دلھن پر آپ نے ظلم کیا ہے روحی۔ ان کی خاطر تواضع کرنے کی بجائے آپ الٹی ان سے خدمت لے رہی ہیں!"

پرلے سرے کی بکی ہے۔ فقط چائے ہی تو بنائی ہے۔ دس گھنٹے میں۔ اور کون سی خدمت میری کر دی!" روحی بولی "اب قدم بڑھاؤ جلدی جلدی۔ ابھی سے دلھن کی چال کیوں چل رہی ہو؟"

"کون دلھن؟ بیٹی یہ کس کا تذکرہ کر رہی ہو۔" ناظمہ بیگم نے پوچھا۔

"یہ جو میری سہیلی ہے نا رابعہ بی۔ پرسوں اس کی شادی ہے!" روحی ہنستی ہوئی بولی "مگر یہ اتنی ہوائی دیدہ ہے کہ سر نیہوڑا کے ایک جگہ بیٹھ رہنے کی بجائے بندریا کی طرح چھلانگیں مارتی پھر رہی ہے!"

"دیکھا آپ نے خالہ اماں" نینا نے فریاد کی "گناہ برباد نیکی لازم۔ چائے بنا کے تم کو ٹھسانے کا یہ انعام ہے!" سچ ہے۔ اچھائی کا تو زمانہ ہی اٹھ گیا۔!

چائے کے بعد روحی نے تجویز پیش کی کہ وہ سب دواخانے جاتے ہوئے نینا کو اس کی کوٹھی پر ڈراپ کر دیں اور وہ خود ان دونوں کے ساتھ جائے گی!۔ نینا نے اسے منع بھی کیا تھا مگر وہ روحی تھی۔ اپنی ہٹ پر اٹل اضعر کی بچی۔ !چنانچہ یہی ہوا کہ راہ میں نینا کو اس کے گھر پر اتار کر وہ۔ دونوں کے ساتھ اسپتال چلی گئی!۔ نینا سے اس نے تاکید کر دی کہ اگر کبھی کسی نے کچھ پوچھا تو یہی کہہ دے کہ وہ سارا دن اسی کے ساتھ رہی تھی!۔

اسپتال میں ڈاکٹر نے ناظمہ بیگم کا معائنہ ایک بار پھر کیا اور شکیل کو اطلاع دی کہ اب آپریشن کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے!۔ اگر وہ چاہے تو اسی وقت انھیں ایڈمٹ کرا سکتا ہے!"

ناظمہ بیگم جو اپنی اندھیری زندگی سے بہت تنگ آ چکی تھیں۔ انھوں نے بھی ہر چہ بادا باد کہہ کر داخلے پر آمادگی ظاہر کر دی!۔

چنانچہ انھیں اسپتال میں ایڈمٹ کر لیا گیا اور ڈاکٹر نے دوسرے دن

صبح پانچ بجے آپریشن کا وقت دے دیا!!!

نینا کی شادی نے روحی کو اچھا بہانہ دیا تھا وہ گھر سے نکلتی پڑھنے کے بہانے اور دس پندرہ منٹ نینا کے ساتھ گزار کر کلینک کا رخ کرتی۔ جہاں آنکھوں کے آپریشن کے بعد ناظمہ بیگم کو رکھا گیا تھا!۔

وہ روزان کے لیے ہوٹل سے بہت کچھ خرید کر لے جاتی اور ان سے بہانہ بناتی کہ گھر سے پکا کر لائی ہے۔ اشکیل لاکھ منتعلق اور مہذب بنتا تھا مگر تھا ترقی پسند آب و ہوا کا پروردہ ایک نوجوان آدمی۔ جو بالآخر اپنے جذبات سے مغلوب ہو گیا۔ اور اگر پہلے روحی کا خیال اس کے دل میں گھر نہیں بنا سکا تھا تو اب ہر روز کی اس کی والہانہ خدمت اور مخلصانہ پرستش نے اسے بھی اس کا گرویدہ کر دیا۔ جب تک وہ کلینک نہ پہونچتی۔ دونوں ماں بیٹے اسی کی باتیں کیا کرتے تھے!۔

ناظمہ بیگم تو اس پر اس قدر مفتون و شیدا ہو چکی تھیں کہ ان کا بس نہ تھا جو وہ اسے دل چیر کر دل میں رکھ لیتیں۔ شکیل کی باتوں سے انھیں بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ بھی اسے بہت پسند کرتا تھا۔ ایک مرتبہ انھوں نے اس کی شکل و صورت کے بارے میں شکیل سے پوچھا۔ ابھی روحی نہیں پہونچی تھی۔ اس کے انتظار کی کوفت مٹانے کے لیے وہ اس کی باتیں کرنے لگے تھے!۔

شکیل نے انھیں جواب دیا۔ اس کی صورت کا نقشہ میں آپ کو کیا بتاؤں۔ اب تین چار روز بعد جب آپ کی پٹی کھلے گی اور آپ دیکھ سکیں گی تو آپ کو معلوم ہو گا کہ وہ کتنی خوبصورت ہے!!

"ہاں میں تو خدا سے چاہتی ہوں کہ میری آنکھیں اسی من موہنی صورت پر کھلیں۔ انھوں نے کہا۔"میں حیران ہوں۔ اس بچی کے دل میں اللہ نے ہماری کتنی محبت بھر دی ہے۔ روز اپنی پڑھائی کا حرج کرکے آجاتی ہے اور خدا جانے گھر میں بھی کچھ آرام کرتی ہے کہ وہاں بھی کھانا پکاتے وقت گزار دیتی ہے۔ اللہ کرتا کہ میں اسے اپنی بہو بنا سکتی!" انھوں نے آہ بھر کر کہا۔"پہلے کا زمانہ رہا نہیں سب کچھ تمھارے ظالم چچا کے پیٹ میں اتر گیا ورنہ آج میرا لاکھوں کا سونا چاندی میرے پاس ہوتا تو میں سب کچھ بیچ باچ کے ایک ایسا گھر خرید لیتی۔ جو اس کے شایان شان ہوتا۔ رہی سہی رقم سے تم کچھ تجارت کر لیتے؟ یوں ہم اسے اپنے گھر لانے کے قابل ہو سکتے!۔ اب یہاں تم کہتے ہو کہ مجھے اس کے ماں باپ کے گھر لے چلو گے۔ میں بھی ان سے ملنے کو بے تاب ہوں۔ مگر بڑی پڑی سوچتی ہوں کہ کہوں گی کیا؟"

ہم ہمیشہ ہی ایسے کہاں رہیں گے امی۔!" شکیل پر روحی کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا!"میں اس امتحان کے بعد جونیئر کالج میں پارٹ ٹائمر ہو جاؤں گا۔ میرا ایک دوست ہے اس کی گودریج کے سامان کی بہت بڑی فیکٹری ہے اس نے مجھے پچھلے دنوں دو ہزار ماہوار کا آفر دیا تھا۔ یہ تو میں نے قبول نہ کیا کہ صبح سے شام تک فیکٹری کی دیکھ بھال کرنے میں مجھے پڑھنے کا وقت نہ مل سکے گا۔ اس دوست نے وعدہ کر رکھا ہے کہ میرے لیے وہ جگہ ہمیشہ خالی رکھے گا!۔ اب کیا تین آدمیوں کے لیے دو ہزار ماہوار کافی نہیں ہیں؟ امی آپ ان لوگوں سے ملنے جائیے تب بھی کسی قسم کی کمتری کا احساس دل میں نہ رکھیے!۔ ورنہ آپ اس کی والدہ سے اچھی طرح بات چیت نہ کر سکیں گی!"

"ہاں یہی میں سوچتی ہوں کہ احساس کمتری کا ہے کا!" انھوں نے کچھ سوچتے ہوئے

کہا۔

"ابھی تک آئی نہیں!" تشکیل نے کلائی کی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔
"آتی ہوگی۔ اتنا سب کچھ پکا کے لاتے دیر تو لگتی ہی ہے!۔
"میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اس کے ان احسانوں کا بدلہ میں کیا دے سکوں گا!
وہ ہمارے حق میں فرشتہ رحمت بن گئی ہے!"

رہ رہ کر ناظمہ بیگم کی زبان پر یہ بات آرہی تھی کہ اس نے انھیں کچھ رقم بھی دی تھی۔ مگر وہ تشکیل کی افتاد طبع سے ڈرتی تھیں۔ وہ جتنا نرم مزاج، خاکسار اور با مروت تھا، کسی بات پر مشتعل ہو جاتا تو پھر اتنا ہی سنگدل اور غصہ ور بھی بن جاتا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ روحی کا عملی ایثار اسے اپنی توہین لگتا اور وہ اس کا جتنا ممنون و مرہون منت تھا اسی قدر مخالف اور بے مہر بن جاتا!۔ وہ سوچا کیں کہ کس طرح اور کیونکر وہ روحی کی دی ہوئی رقم کا تذکرہ کر سکتی ہیں!۔

"آج شام کو میں تھوڑی دیر کے لیے جاؤں گا!۔ نینا کی آج شادی ہے۔ بہت سے ساتھی اور بھی آئیں گے۔ اس نے مجھے بھائی کہا ہے۔ نہ جاؤں گا تو اسے شکایت ہوگی۔" تشکیل نے دھیان بٹانے کے لیے کہا۔ پھر اس کی نظریں کلائی پر منڈلائیں۔"
ایک بجنے والا ہے۔ روحی آج کیوں نہیں امی۔ آپ کو بھوک لگی ہوگی۔ صبح آپ نے چند توس کھائے تھے!۔ آپ کو میں کچھ لا کے کھلاتا ہوں! جاؤں؟"
"مجھے اتنی بھوک نہیں لگی سارا دم روحی میں پڑا ہے۔ کیوں نہیں آئی؟"
ناظمہ بیگم نے کہا۔ "کہیں نصیب دشمناں ایسا تو نہیں ہے کہ جی اچھا نہ ہو!"
"کچھ کہا نہیں جا سکتا!"
"بیٹا تم اس کے گھر جا کر معلوم کرتے!"
"میں آج تک اس کے گھر نہیں گیا امی۔ میرا جانا کچھ مناسب بھی نہیں۔"

شکیل نے کہا پھر اٹھ کر بالکونی میں جا کھڑا ہوا۔

انتظار کے جانگسل لمحے گزرتے رہے۔ گزر گئے!۔ روحی نہیں آئی۔ شکیل نے کچھ کھانے پینے کی چیزیں بازار سے لاکر ماں کو کھلا دیں اور خود اضطراب و پریشانی کے عالم میں بالکونی میں ٹہلتا رہا۔ پھر اسے خیال آیا کہ آج ہی اس کی جگری سہیلی کی شادی تھی!۔ ہو سکتا ہے کہ وہاں کی نئی نئی دلچسپیوں میں روحی یہاں کا آنا بھول گئی ہو۔!

پھر شام کے چھ بج گئے!۔ موسم بڑا اداس ہونے لگا! جگہ جگہ مرکیوری بلب جل اٹھے۔ کلینک میں لوگ آنے جانے لگے!۔ ڈاکٹر راؤنڈ پر نکلے، باہر کمپاؤنڈ میں سواریوں کا شور گونج رہا تھا!۔

"شاید شام ہو گئی!" نابینا خاتون نے بڑی حسرت سے پوچھا۔

"ہاں امی سوا چھ بج چکے ہیں!" شکیل نے پژمردہ لہجے میں کہا۔ "اب اگر آپ اجازت دیجئے تو میں بھی تھوڑی دیر کے لیے شادی میں ہو آؤں۔ میں نہ گیا تو بعد کو بینا شکایت کرے گی۔ اور میں نے سنا ہے کہ وہ رخصت ہو کر کلکتہ جا رہی ہے۔ پھر شاید اس سے ملنا نہ ہو!"

"جاؤ بیٹا جاؤ!" انھوں نے کہا۔ "اگر کسی سے کہلوا سکو تو میری دعائیں بھی بینا کو پہونچا دینا۔ کہنا کہ اگر خدا نے مجھے اس قابل کیا ہوتا تو میں بھی اس کی شادی میں شریک ہوتی!۔ اور ہاں۔ اگر روحی سے ملنا ممکن ہو سکے تو ضرور پوچھنا کہ وہ آج کیوں نہ آئی!"

شکیل اسی بہانے جا رہا تھا۔ شاید روحی سے مل سکے۔ شاید اس سے پوچھ سکے۔ اس نے ایک مجبور عورت ایک محروم القسمت انسان کو کس ناکردہ گناہ کی سزا دی تھی!۔ بے گنتی اندیشے اور لاتعداد وہم دل میں چھپائے وہ شادی

میں شرکت کی غرض سے چلا گیا!۔

نینا کا گھر بقول کسی کے کناروں پر سے چھلک رہا تھا!۔ باہر مہمان تھے اندر مہمان۔ وہ طوفان بے تمیزی برپا تھا کہ کان پڑی آواز کا سنائی دینا مشکل! وہ محفل میں بیٹھا کسی شناسا چہرہ کا متلاشی تھا!۔ اس کے ساتھی، پروفیسر، دوست یہاں کا کوئی آدمی۔ کوئی تو اس سے ملتا؟ کسی سے وہ کچھ پیغام اندر پہونچا سکتا۔ مگر کوئی نہیں۔ وہاں سب اپنے حالوں اتنے مگن تھے کہ کہ اس کیطرف کوئی متوجہ ہی نہ ہوا۔

نکاح ہو چکا تھا!۔ اب ایک ٹرک پر جہیز کا سامان بار ہو رہا تھا اور باہر لان پر بڑی میزوں پر کھانا لگنے کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں!۔

اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا!۔ کیا کرے گا یہاں ٹھہر کر۔ یہاں تو محفل کی تنہائیاں ہیں۔ تہقہہ بردوش آہ و بکا ہے۔ پرشور نالہ و شیون کی صدائیں ہیں۔ وہ باہر نکل آیا۔ تبھی اتفاق سے اسے ایک لڑکا مل گیا!۔ یہ اکثر نینا کو گھر پہونچانے کے لیے یونیورسٹی آیا کرتا تھا!۔ شکیل کو دیکھ کر وہ ٹھٹھک گیا!۔ پھر پرجوش لہجے میں بولا۔

ارے! یہ کیا؟ آپ تو شاید جا رہے ہیں! نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا! آیئے میرے ساتھ اندر چلیے۔ کھانا کھا کے جایئے گا!۔ چلیے!۔

"سنو بھائی۔ تمھارا بہت بہت شکریہ!" شکیل نے کہا۔ "میں ذرا جلدی میں ہوں۔ ایک کام سے یہاں آیا تھا۔ وہ بن نہ سکا!۔ مجبوراً جا رہا ہوں!"

"تم جانتے ہو میں رابعہ فاطمہ کے ساتھ۔ مطلب یہ کہ تمھاری بہن نینا بھی میرے ساتھ پڑھتی تھیں۔

بہت اچھی طرح جانتا ہوں!" وہ مسکرایا۔

تو میرے دوست! ۔ میرا اتنا سا کام کر دو کہ یہ میرا تحفہ تم ٹھیک نینا بہن کے ہاتھ میں دے آؤ اور کہنا کہ شکیل بھائی نے اور ان کی والدہ نے آپ کو بہت بہت مبارکباد اور دعائیں بھیجی ہیں! ۔ کہہ سکو گے!؟"

"کون سی مشکل بات ہے!؟"

"تو میاں تمہارا شکریہ ۔ میں یہاں تمہارا انتظار کرتا ہوں ۔ ذرا جلدی چلے آنا ۔!"

لڑکا اس کا تحفہ لے کر چلا گیا اور حسب ہدایت دس منٹ بعد ہی واپس آگیا اور بولا ۔ "آپا نے آپ کو بھی سلام کہلا بھیجا ہے اور پوچھ رہی ہیں کہ آپ کی امی کا آپریشن ہوا تھا ۔ کامیاب ہوا ۔ اور یہ بھی پوچھ رہی تھیں کہ کیا بات ہے جو آپا کی گہری سہیلی روحی آپا شادی میں نہیں آئیں! ۔ نینا آپا صبح سے ان کی یاد میں ہلکان ہو رہی ہیں! آپ تو روحی آپا کو جانتے ہوں گے نا؟"

"روحی نہیں آئی!" ۔ اس کے لبوں پر ہوا سی سرسرائی ۔ "نا ممکن سی بات ہے کیا وجہ ہوئی کہ نینا کی شادی میں روحی نہ آ سکی! کیا ہوا ہے اسے؟ ۔ کئی بدترین اندیشے زہریلے سنپولوں کی طرح اس کے دماغ میں رینگنے لگے! ۔ کیا ہوا روحی کو کسی نے مجبور تو نہیں کر دیا ۔

اس سے واپسی دشوار ہو گئی ۔ قدم من من بھر کے ہو رہے تھے ۔ روشنیوں میں نہائے ہوئے راستے تیرہ و تار معلوم ہو رہے تھے ۔ وہ کہیں اندھے اندھیروں میں ڈوبتا جا رہا تھا روحی کی چند گھنٹوں کی مفارقت وہ سہار نہیں سکتا! ۔ اگر روحی اس سے جدا کر دی گئی تب کیا وہ زندہ رہ سکے گا! ۔

جو شخص نظروں کے سامنے رہتا ہے ۔ تب اندازہ ہی نہیں ہو سکتا کہ اگر وہ نظروں سے اوجھل ہو جائے گا تو کیا ہو گا؟ ۔

شکیل کا دل آنسوؤں سے بوجھل ہو رہا تھا۔!

کیا کرے۔ کس سے پوچھے۔ گھر پر پہونچ کر اس کی خیریت معلوم کرنا اور بھی دشوار تھا۔ ہو سکتا تھا کہ اس طرح روحی پر کوئی نئی مصیبت آجائے!۔ یہ بات تو وہ ضرور سوچ رہا تھا کہ روحی کسی نئی پریشانی میں مبتلا ہو چکی تھی۔ ورنہ ناممکن تھا کہ وہ بینا کی شادی میں شریک نہ ہوتی جبکہ وہ دونوں ایک جان دو قالب تھیں!۔ مسافت دور کی تھی۔ راستہ دشوار، کلینک پہونچتے شکیل کو صدیاں لگ گئیں!۔

ناظمہ بیگم جاگ رہی تھیں۔ ویسے ان کا سونا جاگنا برابر تھا!۔ آہٹ سن کر انھوں نے آہستہ سے پکارا۔

"شکیل"؟

"جی ہاں۔ میں ہوں۔!" اس نے زبردستی آواز میں تازگی پیدا کی۔

"بیٹا مل سکے روحی سے!" پہلا سوال انھوں نے یہی کیا "وہ اچھی تو ہے نا۔ کچھ کہہ رہی تھی کہ کیوں نہ آ سکی؟"

"جی ہاں۔ وہ۔ اچھی ہے امی اس لیے نہ آ سکی کہ۔ کہ۔ وہ بینا کی شادی ہے نا۔ دونوں بہت گہری سہیلیاں ہیں۔ اس لیے۔!"

"یہی میں بھی کہہ رہی تھی۔" وہ پیار سے مسکرائیں "بچہ آخر بچہ ہے۔ شادی کی دھوم دھام میں یہاں آنے کا خیال نہ رہا ہوگا!۔ خواہ مخواہ تم پریشان ہو رہے رہے تھے۔ اچھا۔ بینا بیٹی تک میری دعائیں بھی پہونچائیں؟"

"پہونچا دیں!"

"اللہ سدا سکھی رکھے" ناظمہ بیگم نے کہا "اس دن تھوڑی دیر کے لیے آئی مگر میرا دل موہ لیا۔ کیسی پیاری بچی ہے۔! تھوڑی ہی دیر میں سب سے بے تکلف

ہوگئی۔"

چونکہ ساتھ پڑھتی ہے۔" اتنا کہہ کر شکیل پھر اپنی تکلیف دہ فکروں میں مبتلا ہو گیا۔ اتنے میں ایک جونیئر ڈاکٹر وارڈ میں آیا۔ اس نے ناظمہ بیگم کی خیریت پوچھی اور کوئی دوا پلا کر چلا گیا!۔

تھوڑی دیر بعد وہ دوا کے اثر سے سو گئیں۔ تین شبانہ روز سے ان کی آنکھوں پر پٹی بندھی تھی اور وہ بے چاری جو ہمیشہ ہی سے صبر و سکون سے ہر مصیبت کو سہنے کی عادی ہو گئی تھیں اس صبر آزما کیفیت کو بھی برداشت کر رہی تھیں!۔

شکیل نے اٹھ کر سیلنگ فین کی رفتار مدھم کی۔ ماں کے پیروں پر رلائی برابر کر کے کرسی برآمدے میں نکال لایا۔

تیسری منزل کے اس برآمدے سے بہت نیچے لان پر بچھی گھاس اس وقت سیاہ معلوم ہو رہی تھی۔ درختوں پر نرسیں اور آرڈلی وغیرہ چلتے پھرتے کھلونے سے لگ رہے تھے۔ دور سڑک پر ٹریفک کا اژدہام تھا۔ آس پاس کی عمارتیں روشنی سے جگمگا رہی تھیں۔ کہیں ٹی وی آن تھا۔ کہیں بالکونی پر بچے چہچہاتے پھر رہے تھے۔ خنک اور خوشگوار ہواؤں کے ہلکے ہلکے جھونکے اونچے اونچے درختوں سے سرگوشیاں کر کے نکلتے تو پتوں اور سبزی کی بو اپنے ساتھ لے آتے!۔ رات اندھیری تھی۔ چاند کا زرد و نامکمل چہرہ پچھلے پہر نظر آتا تھا۔ آسمان پر اتنے بہت سے ستارے چمک رہے تھے جیسے دور نظر آنے والے تارے کہیں سے اپنے مہمانوں کو لے آئے ہوں۔ ادھر ادھر کے نظارے بہت دلکش اور خوبصورت ہو رہے تھے لیکن شکیل کا دل اداس تھا لہٰذا اسے سارا ماحول ماتمی لگ رہا تھا!۔

وہ ایک رخ پر بیٹھا مسلسل یہی سوچ رہا تھا کہ روحی سے دوری اگر مستقل ہو گئی ہے تو پھر وہ زندہ رہنے کا کون سا بہانہ ڈھونڈے گا!۔

روحی پر اس روز جو قیامت ٹوٹی تھی۔ اس کی اطلاع شکیل کو نہ ہو سکی تھی۔ ہوا یہ کہ سعید صاحب نے طے کر لیا تھا کہ بیٹی کی خاطر اس کے ساتھیوں سمیت شکیل کو اپنے گھر بلا کر اس کی صورت و سیرت کا جائزہ لینا چاہیئے!۔ چنانچہ انھوں نے روحی سے کہے بغیر معین میاں کے ہاتھ دو تین دستی رقعے اس کے ڈپارٹمنٹ کے صدر اور پروفیسر کو بھجوا دئے! کہ اس رات ما حضر ان کے ہاں تناول فرمائیں!۔

روحی کو کچھ پتہ نہ چلا۔ اپنی دانست میں روحی سے کہنا سعید صاحب نے اپنی بزرگی اور شان کے خلاف خیال کیا تھا!۔

ڈپارٹمنٹ کے صدر ڈاکٹر پروفیسر ہارون احمد خان نے ان کی دعوت بڑی خوشی سے قبول کر لی۔ کیونکہ سعید صاحب بھی بڑے آدمی تھے۔ ان کی پوزیشن بہت اونچی تھی!۔ حالانکہ خان صاحب کے پاس نیلما کے والد کی طرف سے بھی اس کی شادی کا کارڈ پہنچ چکا تھا! لیکن انھوں نے ایک شاگرد کی شادی پر ایک گزیٹڈ افسر کے ہاں کی دعوت کو ترجیح دے دی! معین میاں سے کہلوا دیا کہ ضرور حاضر ہوں گے!۔

روحی کو کچھ پتہ نہ تھا۔ سعید صاحب جلد آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔ اور بیوی سے کہتے گئے کہ روحی کو آج گھر پر روک لیا جائے۔!

روحی ان دنوں کسی اور ہی دنیا میں رہنے لگی تھی۔ اور اپنی دانست میں یہ طے کر چکی تھی کہ اس نے بزرگوں کو مسخر کر کے اپنا ہمنوا بنا لیا ہے۔ اب کوئی اس کی محبت کے راستے میں پہاڑ نہ بنے گا!۔

وہ کافی پینے اور بڑے تھرماس میں کافی بھرنے کے لیے کچن میں آئی!۔ جمالی جو اس کی رازدار تھی اور سب کچھ جانتی تھی۔ اور جو کھانے پینے کی

چیزیں ٹفن میں رکھ کر ساتھ کر دیا کرتی تھی۔ اس صبح بڑی فکر مندی سی نظر آئی اس کے علاوہ ایک خانساماں کی بجائے کچن میں دو خانساماں دکھائی دیے! کچھ غیر معمولی سی مصروفیت بھی وہاں نظر آئی۔!

روحی نے معنی خیز نظروں سے جمالی کو دیکھا۔ اس نے ایک طرف آنے کا اشارہ کر کے اکیلے میں روحی سے سارا ماجرا بیان کیا!۔

روحی سن سی کھڑی ہو گئی! "مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ ڈیڈی نے سب کو بلایا ہے "۔

اور پھر یہ دوسرا خانساماں کس لیے آیا ہے" جمالی نے کہا "حکم ملا ہے کہ شام سے پہلے سب کچھ تیار ہو جانا چاہیئے"!

مگر یہ سب کس لیے!" روحی پاگل ہوئی جا رہی تھی "جس کی خاطر یہ سارا ہنگامہ کیا جا رہا ہے۔ وہی نہیں آئے گا۔ وہ اس دعوت اور اپنی عزت افزائی سے بے خبر اپنی ماں کے ساتھ نرسنگ ہوم میں ہے۔ اوہ میرے خدا۔ ڈیڈی نے مجھے اس قدر غیر اہم سمجھا کہ مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ اتنا نظروں سے گرا دیا ہے مجھے!" اس کی آواز بھرا گئی!۔

"کیسی عجیب بات ہے۔ آج نہ شکیل صاحب آسکیں گے نہ نینا۔ اس کی شادی ہے۔ کیا یہ لوگ اس کی شادی میں بھی نہیں جائیں گے۔!"

"اس کا مجھے پتہ نہیں بی بی!"

اچھا جمالی تم ذرا جلدی سے تھرماس تو بھر دو" روحی نے کہا۔ "اور وہ کباب جو تم نے علٰحدہ تل کر رکھے ہیں۔ وہ بھی بڑے ڈبے میں رکھ دو۔ میں یہ ساری بات کم از کم شکیل صاحب سے تو کہہ دوں!۔ ادھر سے ادھر ہی نینا کے ہاں بھی چلی جاؤں گی۔!"

ٹھیک اسی وقت آمنہ بیگم نے صحن میں قدم رکھے اور روحی کی بات سن لی۔ وہ تو اس سے مسلسل ناراض ہی تھیں۔ تیوری پر بل ڈال کر بولیں: "کہاں جانے کی بات کر رہی ہو۔ آج تم کہیں نہیں جا سکتیں!"

"میری اسپشل کلاس ہے۔" روحی نے کہا اور یہ بھول گئی کہ اس کے پروفیسر یا کسی ساتھی کے ذریعہ اس کے جھوٹ کا پول کھول سکتا ہے۔ "آج نینا کی شادی ہے۔ اور شادی میں تو مجھے ضرور شریک ہونا ہے!"

"کسی کی شادی غمی تمہارے بغیر ہونے سے رکی نہ رہے گی!" آمنہ بیگم نے ترش لہجے میں کہا۔ "یہ تمہارے باپ کی تاکید ہے کہ آج تم گھر پر رہو گی! میں کچھ نہیں جانتی۔ کیونکہ میری تم سنتی نہیں ہو۔ فون کر کے اپنے باپ سے پوچھ لو۔ اجازت لے لو ان سے اور جہاں جی چاہے چلی جاؤ۔!"

"یہ خواہ مخواہ کا ظلم مجھ پر کیوں ہے ممی۔!" وہ پاؤں پٹخ کر اور چیخ کر بولی "کون سی ایسی قابل اعتراض حرکتیں ڈیڈی نے میری دیکھی ہیں جو مجھ پر ایسی بے جا پابندیاں عائد کر دی ہیں!۔ آخر میں کیوں نہ جاؤں؟ کیا وجہ ہے؟"

"کہہ تو رہی ہوں کہ میری بات کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ تم ٹیلی فون کر کے اپنے باپ سے آنے جانے کی اجازت لے لو۔!" آمنہ بیگم نے کہا۔ "اور چلی جاؤ۔!"

"نینا کی شادی میں آپ لوگوں کو بھی تو چلنا ہے!" روحی بولی۔

"اگر ان کا جی چاہا تو چلے جائیں گے!"

"میں تو بہرحال جاؤں گی!"

"شام کو گھر پر ڈنر ہے۔" آمنہ بیگم بدستور غیر نرم رہیں: "اور تمہارے بابا کہہ گئے ہیں کہ تمہاری موجودگی بھی ضروری ہے۔ بس۔ ان کا پیغام میں نے

تمھیں سنا دیا۔ اب تم جانو وہ جانیں میں تم سے زیادہ باتیں کرنا نہیں چاہتی
تمھاری سرکشی اور گستاخی اتنی بڑھ چکی ہے کہ تم مجھے برابر سے جواب دیے
چلی جاتی ہو۔ تمھیں جو کچھ کہنا سننا ہو اپنے باوا ہی سے کہا سنا کرو۔!" یہ کہہ
کر وہ خانساماں سے مخاطب ہوگئیں!" جو فہرست تمھیں دی گئی تھی اس کے
مطابق سب سامان لے آئے؟"

"جی سرکار!"

"تو بس میٹھی چیزیں ابھی سے تیار کرکے فریج میں رکھ دو۔ مرغ اور مچھلی
کے کباب دوپہر کو پکانا۔ قیمہ بھرے سموسے، گرلڈ چکن سہ پہر تک۔ قورمہ اور پلاؤ
سرِشام دم دینا تاکہ میز پر گرم جا سکے!۔ سمجھے!"

"آپ بالکل بے فکر رہیے سرکار یہاں کی کتنی دعوتوں کا کھانا ہم پکا چکے
ہیں" خانساماں نے جواب دیا" آپ کو اور بڑے سرکار کو شکایت کا موقعہ
نہ دیں گے!"

"کسی چیز کی ضرورت ہو تو بڑی اماں سے کہلوا دینا!" یہ کہہ کر وہ کچن
سے نکل کر چلی گئیں!۔

"آپ کو کافی بنا دوں سرکار!" اس کے خانساماں نے پوچھا۔

"نہیں!" روحی نور نے ہی لکھا تھی۔ اس کے دل کے ٹکڑے ہو رہے تھے
شکیل تک نہ پہونچنے کا غم اسے ڈس رہا تھا۔ نینا کی شادی میں شرکت نہ
کرنے کا دکھ رگ رگ سے لہو نچوڑ رہا تھا۔ اس منحوس دعوت میں شکیل کے نہ
آنے کا روح فرسا خیال دماغ کو پریشان کر رہا تھا اور سب سے بڑھ کر اپنی
چاہنے والی ماں کی خفگی کا اثر تھا۔ جو آہستہ آہستہ اس کے جسم سے جان کھینچے
لے رہا تھا!۔ اگر ممی ناراض ہوگئیں تو پھر وہ کس کی محبت کے بھرم پر جیے گی؟۔

شکست خوردہ اور بدحواس سی وہ اپنے کمرے میں آئی اور بے ضبط ہو کر رونے لگی۔ کئی غموں نے ایک ساتھ اس پر حملہ کیا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ کون سا غم کس غم پر سبقت رکھتا ہے۔ جس پر زیادہ آنسو بہائے جائیں!

سارا دن وہ کمرے میں پڑی رویا کی۔ کسی نے مڑ کر نہ پوچھا۔ اس کی خود سری اور ضد نے آمنہ بیگم کو واقعی اتنا ناراض کر دیا تھا کہ وہ اسے خاطر خواہ سزا دینے کے خیال سے اس کے پاس نہ آئیں۔ غرور حی کی ہمت ان کے پاس جانے کی نہ پڑی۔ وہ بھوکی پیاسی آنسو بہایا کی۔ گھر میں دعوت کا سامان ہوتا رہا۔

روحی کے نزدیک یہ دعوت محض بیکار تھی۔ جس مقصد کے تحت اس کے سارے ساتھی مدعو کیے گئے تھے۔ ان میں اصلی کردار تو تھا ہی نہیں۔ وہ کسی پروگرام اور پلان سے بالکل بے خبر اپنی ماں کی تیمارداری میں مصروف تھا!۔

رات کو بڑا ہال بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ بیرے اور ملازم کمر کسے مستعد پھر رہے تھے۔ سعید صاحب بھی آچکے تھے۔ اور ایک ایک کر کے ان کے اجنبی مہمان بھی!۔ سب ان کے خوبصورت مرعوب کن ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے! خان صاحب نے اپنے ساتھیوں کا تعارف کرایا تھا۔ ان سے ملنے کے بعد انھوں نے اپنے ہونہار شاگردوں کا تعارف بھی کرا دیا۔ مثلاً یہ ہیں عبدالرحمٰن صاحب انھوں نے پچھلے سال ٹاپ کیا تھا۔ یہ ہیں محسن میاں۔ طالب علم بھی ہیں اور شاعر و ادیب بھی ان کے عمدہ عمدہ آرٹیکل ملک کے موقر رسائل میں نمایاں حیثیت سے شائع ہوتے ہیں۔ اور یہ ہیں میاں انصاری۔ کرکٹ کے اچھے کھلاڑی یہ میڈل لے چکے ہیں۔ ہماری یونیورسٹی کے اول نمبر کے اتھلیٹ!۔

ہائیں!: سعید صاحب نے دل میں سوچا۔! بس اسی قدر۔ اور شکیل کہاں ہے؟ سب لڑکے انھیں تعارف کے بعد تسلیمیں کرنے لگے! تب انھیں پوچھنا پڑا۔

"میں نے سنا تھا کہ کوئی صاحبزادے اور بھی ہیں۔ وہ کیوں نہیں آئے؟"
جی ہاں۔!" خان صاحب نے کہا "ان کا ساتھی ایک لڑکا اور بھی ہے۔ شکیل احمد۔ بڑا ہونہار، ذہین اور ہمہ صفت موصوف واقع ہوا ہے۔ آپ اس سے مل کر یقیناً خوش ہوتے۔ مگر وہ ہفتہ بھر سے غیر حاضر ہے۔ نجانے کیا بات ہو گئی!"

"مگر وہ ان کی والدہ محترمہ کی آنکھوں کا آپریشن ہوا ہے" رحمان نے کہا "وہ اپنی والدہ کے ساتھ ڈاکٹر جبین صاحب کے نرسنگ ہوم میں ہیں اور ہماری ایک ساتھی اور بھی تھیں۔ رابعہ فاطمہ۔ وہ نینا کہلاتی تھیں روحی بہن کی دوست تھیں وہ۔ آج ان کی شادی ہے۔ لہٰذا اس طرح ہمارے دو اچھے ساتھی آپ کی خدمت میں حاضر ہونے سے محروم رہ گئے!"

سعید صاحب کی پوری اسکیم فیل ہو چکی تھی۔ اس تضیع اوقات پر وہ بددل بھی تھے۔ برہم بھی۔ مگر سب سے انھیں منافقت برتنی پڑ رہی تھی!!

سادی رات کی مسلسل جگار اور اضطراب نے شکیل پر نہایت ناگوار اثر ڈالا رات بھر ناظمہ بیگم دوا کے اثر سے بے خبر سویا کیں اور وہ برآمدے میں بیٹھا اندھا دھند سوچتا رہا۔ خیال زنجیر در زنجیر اس کے دماغ میں یوں چلے آ رہے تھے۔ کہ کبھی کچھ کبھی کچھ اور۔ لڑکپن سے لے کر جوانی کی آمد اور اب تک اسے یاد نہ تھا کہ اس نے ایک سانس بھی فراغت کی لی ہو۔ ایک عجیب سی کشاکش اور مجاہدے کی زندگی تھی کہ جس کا کوئی اور چھور نہ تھا۔ اسے علم کا شوق تھا وہ پڑھ رہا تھا اور اسے پتہ بھی تھا کہ اس علم سے فی الحال مستقبل سنورنے والا نہیں ہے۔ تو پھر کس

لیے یہ ساری تگ و دو تھی۔ آخر اس کا ہوگا کیا؟ تعلیم پوری کر کے بھی کیا کرنا ہے؟ اپنی ماں کی طرح کیا وہ اچھی زندگی کی طلب میں گھلتا رہے گا؟ وہ بھی ایک گوشت پوست کا انسان تھا۔ جس کا سینہ آرزوؤں کی گرمی سے خالی نہ تھا۔ اس کا بھی بہت کچھ جی چاہتا ہے۔ تھوڑی سی آرائش، ایک چھوٹا سا صاف ستھرا گھر، ایک خوبصورت سلیقہ مند وفا شعار بیوی، پیارے پیارے دو تین بچے اور بے غبار ماحول۔ وہ اپنے آس پاس دیکھتا تھا اس کے اکثر دوست بھرے پڑے کنبے کے افراد تھے۔ جنھوں نے ڈونیشن کے نام پر پچاس ہزار اور ایک لاکھ تک نقد ادا کر کے اپنی پسندیدہ تعلیم اختیار کر لی تھی۔ وہ ہر طرح بے فکر تھے۔ اطمینان سے ذاتی سواریوں پر آتے۔ دوستوں کے ساتھ ریفرشمنٹ پر ایک دفعہ میں پچاسوں روپیے بل دے دیتے۔ ان کے لباس نہایت قیمتی اور نفیس ہوتے تھے۔ وہ لوگ اپنی ذاتی کوٹھیوں اور بنگلوں کی باتیں کیا کرتے۔ ان کے خاندان کا کوئی نہ کوئی قابل فرد کہیں باہر گیا ہوا ہوتا۔ جو ہر ماہ ایک معقول رقم بھجوا دیا کرتا۔ جس کے بل پر یہ مفت خورے عیش کیا کرتے! ان کے ذریعے تھے۔ انھیں ہاتھ ہلانا نہیں پڑتا تھا۔ ان کا کام یہی تھا کہ برائے نام تعلیم حاصل کریں۔ باقی وقت تفریح۔ سیر سپاٹوں میں گزار دیں۔ اور پھر بھی ان کا مستقبل محفوظ تھا وہ جانتے تھے۔ ایک گرانقدر رقم کا نذرانہ انھیں کوئی اچھا عہدہ فراہم کر سکتا تھا۔!"

تو پھر۔ اس کا دل باغی ہو جاتا!۔ ایک وہی محروم و بدنصیب کیوں ہے۔ کیا صرف اسی لیے کہ اس کے ددھیال کے ظالم بے حس لوگوں نے اس کی بنیاد کی اینٹ یوں رکھ دی تھی!۔ اس کا کوئی سرپرست، کوئی ذریعہ کوئی معقول آمدنی نہ تھی! اس کے مقدر میں پانی پینے کے لیے کنواں کھودنا کیوں لکھا تھا؟۔ یہ کب تک ہوا کرے گا۔ اس کا کوئی مقصد بھی تو نہیں ہے۔ کیا ساری عمر تیرے میرے ٹیوشنوں پر بسر

ہو سکتی ہے۔ یہ تو عارضی آمدنی ہوتی ہے۔ کل کوئی ٹیوشن نہ ملے۔ کسی نے پڑھنا نہ چاہا تو پھر۔ کیا ہوگا اس کا اور اس کی ماں کا حشر۔؟

اس کے دماغ میں گرم بگولے سے ناچنے لگے! وہ خود کو بالکل بے یار و مددگار اور حرماں نصیب لگا۔ اپنی ذات پر اسے ترس آنے لگا۔ اور اسے محسوس ہوا دنیا میں اس کا وجود محض بیکار ہے۔ پھر یاسی کے خیالوں نے اس سے امنگیں چھین لیں۔ وہ جو ہمیشہ پر امید رہا کرتا تھا نا امیدیوں کا دامن تھامنے لگا! اسے یونہی سسک سسک کر جینا اور یونہی مر جانا ہے! تو پھر وہ یہ نیا کون سا روگ خرید بیٹھا ہے اس نے کیا سمجھ کے خود کو نئی تکلیف دہ جذبوں کے حوالے کر دیا ہے؟ کیوں وہ ایک معصوم بھولی بھالی لڑکی کے قریب گیا ہے؟۔۔ اسے امید کس بات کی دلائی ہے اس سے وعدے کس لیے کیے ہیں۔ کیا اسے چند دنوں بعد چھپر پھاڑ کر کوئی خزانہ ملنے والا ہے۔؟

وہ خود پر بوجھ ہے۔ کیا وہ ایک ناز پروردہ ہستی کا بوجھ اٹھا سکتا ہے؟ پھر اس نے اسے صاف جواب کیوں نہیں دے دیا۔؟ تھوڑی سی اذیت بے شک دونوں ہی کو برداشت کرنی پڑتی مگر یہ خلش، یہ بے چینی تو نہ ہوتی۔ جو دائمی ہے۔ اس کے لیے بھی اور اس غریب کے لیے بھی۔ جو اس کے وعدوں کے کھوکھلے بنیادوں پر آئندہ کے خوش رنگ شیش محل کی تعمیر کرنے لگی ہوگی!۔

"نہیں!" اس نے اپنی جلتی ہوئی آنکھیں جگمگاتے ہوئے آسمان پر گاڑ دیں اور سسکی سی لی "ابھی سویرا ہے۔ میں اسے خود سے برگشتہ کر سکتا ہوں۔ میری ذرا سی بے رخی اور سرد مہری کی دیر ہے۔ وہ خود بخود کترا جائے گی میں اس کے سنہرے مستقبل کو اپنے ساتھ ظلمتوں کے غار میں نہیں دھکیل سکتا!" اس کے جذبے اندھے شباب کی پیداوار ہیں۔ ان میں عقل کا دخل نہیں ہے۔ یوں بھی محبت کو عقل سے کیا

سرکار — !

اس نے گہری سانس لے کر سوچا۔ بس اسے خود سے منحرف کرنا ہے۔ خود اس کی بہتری کے لیے۔ یہاں یہ سوال نہیں ہے کہ خود شکیل پر کیا گزرے گی۔ اس پر تو بہت کچھ اور بھی گزر رہا ہے۔ کچھ یہ بھی سہی ! — ایسا کون سا فرق پڑ جائے گا ! —

آہستہ آہستہ ظلمت شب نور سحر میں تبدیل ہو گئی۔

وہ گرد و پیش سے بے خبر اب بھی نیم بیہوش سا بیٹھا تھا۔ اسے یہ تک احساس نہ تھا کہ نرسنگ ہوم میں صبح کی چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ ایک نرس آکر ناظمہ بیگم کو دیکھ گئی تھی اور کہہ گئی تھی کہ کچھ دیر بعد ڈاکٹر صاحب آکر پٹی تبدیل کریں گے۔ تب تک وہ ناشتے سے فارغ ہو لیں ! —

وہ متعجب تھیں۔ شکیل کی آواز کیوں نہیں سنائی دے رہی تھی ! — کیا وہ کہیں چلا گیا تھا ! — نرس کی آہٹ سن کر انھوں نے اس کی خوشامد کی۔ اگر شکیل باہر ہو تو جاتے جاتے بھیجتی جائے ! —

"مسٹر شکیل !" نرس نے دروازے کے پاس ہی سے پھیپھڑ کھینچ مارا "آپ کا مدر بلاتا۔ ابھی ڈاکٹر صاحب آنے کا۔ آپ اپنا مدر کو بریک فاسٹ دے دو ! جلد کرو۔ ڈاکٹر بہت گسے والا — !"

بیماروں کی طرح وہ اٹھا اور اندر آیا۔ اسے جیسے ہوش اب آیا تھا ! —

"سو رہے تھے بیٹا !" — ناظمہ بیگم نے پوچھا۔

اس وقت وہ سب سے بیزار تھا۔ خود سے۔ ماں سے، دنیا سے خدا کی خدائی سے تک۔

"نہیں" اس کی آواز کھردری سی تھی "آپ چائے وائے پی لیجئے۔ ڈاکٹر آنے والا ہے ! "

اور جب وہ انھیں سہارا دے کر جائے پلا رہا تھا تب ناظمہ بیگم کو یوں لگ رہا تھا کہ جیسے ان کی پیٹھ پر تپتی ہوئی اینٹ رکھی ہو۔! اس کا ہاتھ جل رہا تھا!۔

"تمہیں تو اچھا خاصا بخار ہے بیٹا۔!" انھوں نے سہم کر کہا۔ "یہ کیسے آگیا۔ مجھے اندیشہ ہی تھا یہ دن رات کی تمہاری محنت رنگ ضرور لائے گی۔ خدا تمھیں بچائے یہیں کے کسی ڈاکٹر سے اپنے لیے دوا لے لو۔ میرا دل دھڑک رہا ہے۔ اللہ نہ کرے تم کو کچھ ہو گیا تو کیا ہوگا!۔

"مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ رات نیند نہیں آئی تھی یہ اسی کا نکان ہے۔ آپ میری فکر نہ کیجئے۔!" جیسے وہ خواہ مخواہ معذرراں سے خفا تھا!۔

"بیٹا تم بھی ناشتہ کر لیتے۔ یہ پٹی میری آنکھوں پر ایسی بندھی ہے کہ میری دین دنیا تاریک ہے۔ پروردگار۔ کب اس عذاب سے نجات ہوگی۔ کچھ دیکھوں تو سہی۔ پر چھایئں ساہی کی طرح دیکھوں!۔ اب تو۔!"

"ڈاکٹر صاحب آ رہے ہیں!" اس نے ناگواری سے ان کی بات کاٹ دی

ڈاکٹر نے پٹی بدلی۔ اور مژدہ سنایا کہ ایک دن بعد پٹی کھول دی جائے گی!۔ اور پھر معائنہ کیا جائے گا کہ بینائی واپس آسکتی ہے یا نہیں!۔

ان کے جانے کے بعد دونوں کسی سوچ میں ڈوب گئے!۔

وارڈوں میں یہاں وہاں کئی لڑکے بسکٹ اور چائے کی ہانک لگاتے پھر رہے تھے زبردستی ناظمہ بیگم نے اسے بسکٹ کھلا کے چائے پلائی! اور پھر بولیں۔

"اب تم گھر جاؤ اور شام تک آرام کرو۔ یہاں بیٹھے بیٹھے بخار اور بڑھے گا گھر جا کے سو رہو ذرا دماغ درست ہو تو۔!"

"میں بھی یہی سوچ رہا تھا! اگر میں نے کچھ آرام نہ کیا تو بیمار پڑ جاؤں گا پھر آپ کی خدمت کون کرے گا۔!" اچھا امی میں پھر چلتا ہوں۔ پانچ بجے آؤں

گا! ایک بجے نرس آئے گی وہ آپ کو جوس اور دودھ دے دے گی!"

"دوپہر کو تم کیا کھاؤ گے!"

"میری فکر چھوڑیے!" اس کے لہجے میں بڑی تلخی تھی۔

"شاید آج روحی آئے!" وہ چپکے سے بولیں۔ مگر اس نے کچھ نہ کہا۔ فاطمہ بیگم اس کے جواب کا انتظار ہی کرتی رہ گئیں اور بھاری آہٹوں کے دور ہٹنے سے انھیں پتہ چلا کہ وہ چلا گیا!۔

ایک آہ بھر کر انھوں نے پیشانی پر ہاتھ رکھ لیا۔

بڑی دیر بعد ایک بھولی بسری نرم آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔ اور مخصوص مہک نے نوید دی کہ روحی آئی تھی!۔

"بیٹی! تم ہو!" وہ گویا از سر نو جی اٹھیں۔

"جی امی!"۔

"بیٹی اچھی تو ہو۔ تمھاری آواز اداس سی ہے۔ کیا ہوا روحی بیٹی کیا بات ہے! جی اچھا نہیں ہے۔؟" انھوں نے ایک طرف ہاتھ پھیلایا: "کہاں ہو میری بچی پاس آؤ۔ چپ چپ کیوں ہو۔ روز چہکتی ہوئی آتی تھیں۔ کیا کسی نے کچھ کہا ہے۔"

روحی پاس آ بیٹھی۔ اس کی نظریں یہاں وہاں شکیل کو دیکھ رہی تھیں۔ "کل تم نہیں آئیں۔! دن بھر تمھارا انتظار رہا تھا!" انھوں نے کہا "شاید اپنی سہیلی کی شادی میں گئی تھیں۔ بیٹی تم نہیں آتیں تو یوں لگتا ہے جیسے زندگی سے کوئی چیز نکل گئی ہو۔ اللہ تم کو خوش رکھے سلامت رکھے دل چاہتا ہے اپنی بچی کو میں دل چیر کر دل میں رکھ لوں۔ اب ڈاکٹر صاحب کہہ گئے ہیں کہ پرسوں پٹی کھلے گی تب اللہ کرے گا میں تمھارا چاند سا مکھڑا دیکھوں گی۔!" روحی کا چہرہ روہانسا تھا آواز اداس سی۔ مگر وہ خوش ہو کر بولی۔ "ہاں آپ ضرور دیکھیں گی۔ ڈاکٹر نے تو

کہا تھا کہ آپریشن کامیاب ہوا ہے۔ پھر آپ گھر چلیں گی نا؟"

"ہاں بیٹی ضرور!"

"شکیل صاحب کہاں ہیں؟۔ انھوں نے ابھی ناشتہ تو نہ کیا ہوگا۔ میں ان کے لیے کچھ چیزیں لائی تھی۔!"

"ارے بیٹی میرے پیچھے تباہ ہو رہا ہے۔ نہ دن کو چین ہے نہ رات کو ڈھنگ سے سوتا ہے۔ آج تو اسے بھی بخار آگیا تھا۔ میں نے زبردستی گھر بھیجا ہے۔ کچھ آرام کرلے۔ اگر خدانخواستہ بخار بڑھ گیا تو کیا ہوگا۔ کہہ گیا ہے کہ شام پانچ بجے آئے گا۔ مگر تم تو بیٹی اب کالج جا رہی ہوگی!"

"جی نہیں آج نہیں جا رہی۔!"

"بیٹھو گی کچھ دیر!"

"ابھی مجھے کچھ کام ہے امی۔ واپس آکر بیٹھوں گی آپ کے پاس۔ اچھا؟"

"اچھا بیٹی!"

"جاؤں؟"

"ہاں بیٹی جاؤ!"

روحی نے گیٹ پر آکر ایک رکشہ کرایہ کیا اور سیدھی شکیل کے گھر پہونچ گئی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ وہ ناعاقبت اندیشی کر رہی ہے۔ اکیلے میں اس کے پاس جانا مناسب نہیں ہے۔ مگر وہ عقل کے دلائل مانتی کب تھی!۔

دستک دینے پر دروازہ خود شکیل نے کھولا اور ہکا بکا رہ گیا۔ اسے خود بھی گمان نہ تھا کہ روحی یہاں تک آسکتی ہے!۔

ایک عجیب سی کھسیائی ہوئی مسکراہٹ روحی کے لبوں پر ابھری۔ "کیا دیکھ رہے ہیں اس طرح۔ راستہ دیجیے!"

"روحی۔ تم۔ تمھارا۔ اس طرح یہاں آنا۔ مطلب یہ کہ۔!" وہ ہکلایا۔ وہ اسے ایک طرف ہٹاتی ہوئی کمرے میں آگئی! شکیل نے دروازہ کھلا چھوڑ دیا اور پردہ دور تک سرکا دیا۔ اس طرح کہ سڑک سے گزرنے والے اسے بیٹھا ہوا بخوبی دیکھ سکتے تھے! روحی آڑ میں دیوار سے لگی کرسی پر ٹک گئی۔!

اسے اپنا رات کا عزم و فیصلہ یاد آیا۔ اس نے روحی سے بے اعتنائی اور بے رخی برتنے کا مستحکم ارادہ کر لیا تھا۔ لیکن روحی کی شکل پر نظر پڑی اور اس کا پختہ ارادہ پانی بن کر بہہ گیا!۔

اپنے پسندیدہ نیلے رنگ کے مہنگے سے لباس میں ملبوس۔ بال ماتھے پر بکھرائے اور شرمائی ہوئی سی مسکراہٹ لبوں پر لیے وہ کتنی پیاری ہو رہی تھی!۔ بھلا وہ اس سے بے رخی کر کے اس کا ننھا سا خوبصورت دل دکھا سکتا تھا؟

امی نے کہا کہ آپ کو بخار ہے: اس نے اپنی لمبی لمبی سحر کن پلکیں اٹھائیں۔ دکھائیے تو اپنا ہاتھ!:

نبض دیکھنا آتا ہے تمھیں!: وہ مسکرایا اور اس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ روحی اس کا ہاتھ تھام کر نبض نہ دیکھ سکی!۔ اور ہنس کر رہ گئی!۔

"میرا مطلب یہ تھا کہ اگر بخار نہ ہو تو جو چیزیں میں لائی ہوں۔ خوب سی کھائیے کل میں نہیں آسکی تھی!۔ اس کا مجھے بڑا افسوس ہے۔ کل معلوم ہے آپ کو ہمارے ہاں کیا ہوا تھا؟"

"ذرا ٹھہرو۔ میں منھ دھو کر ابھی آتا ہوں۔ پھر پوری تفصیل سے سنوں گا۔ کل کیا ہوا۔ تب تک تم یہ اخبار دیکھو!"

اس کے جانے کے بعد روحی نے میز پر اخبار بچھا دیا اور ٹفن کے ڈبے کھول کر رکھ دیے۔ وہ اپنے دل کو سمجھا رہی تھی کہ پچھلے دن کے واقعات من و عن بیان کر

سکے گی۔ حالانکہ اسے اس میں شبہ تھا۔ وہ مجھے کہہ دیتی۔ اس کے باپ نے کسی بہانے اسے بر دکھوے کے لیے بلایا تھا۔ مگر ان کا مقصد پورا نہ ہوا تھا۔

شکیل تولیہ سے ہاتھ پونچھتا ہوا آگیا! اور ٹھٹھک کر بولا۔

روحی! اب تمھاری اس سروس کو بند ہو جانا چاہیے!۔ امی پرسوں گھر آ جائیں گی۔ ان کے لیے کچھ نہ کچھ انتظام تو کرنا ہی پڑے گا! تم کب تک یہ تکلیف اٹھاتی رہو گی!"

"اب تو کھائیے!" روحی نے کہا۔ "یہ کارخانہ اب آئندہ چلے گا بھی نہیں! شروع کیجیے!"

"تم بھی تو ساتھ دو!"

"مجھے نہیں کھانے کا۔ سنیئے!۔ میں کل کی کہانی سنانے آئی ہوں۔ بڑی ہمت کر کے آئی ہوں۔ آپ بھی دل میں مجھے بے حجاب بے باک اور دلیر کہتے ہوں گے!"

"جرات، مانتا۔ میری روحی!" شکیل نے نظریں جھکا کر کہا۔ "ہم بھی تو انسان ہی ہیں۔ اور گناہ کا تصور صرف انسانوں سے وابستہ ہے۔ تم میرے اعتماد کے سہارے یہاں تک آگئی ہو۔ مگر۔ آئندہ۔ امی جب آئیں۔ تبھی آنا۔ تم کچھ محسوس تو نہیں کر رہی ہو۔!"

"نہیں نہیں!۔ آپ کی شرافت اور انسانیت کا نقش تو روز بروز میرے دل پر گہرا ہوتا چلا جا رہا ہے۔" روحی بولی۔ "سچ مچ آپ بہت اچھے ہیں! مجھے بہت اچھے لگتے ہیں!"

"زہے قسمت! شکریہ!" وہ ہنس کر بولا۔ "اور۔ وہ کل کی کہانی کیا ہے؟"

"یہ کباب تو آپ نے لیے ہی نہیں!"۔

وہی تو کہہ رہا ہوں!"

کل کیا ہوا۔ معلوم۔؟۔ مگر آپ میری طرف دیکھتے رہیں۔ میں کچھ بھی نہ کہہ سکوں گی!" شکیل نے مسکراتے ہوئے سر جھکا لیا: "بہت اچھا۔ لیجیے۔ میں رخ پھیرے لیتا ہوں۔ آپ شروع کیجیے!"

روحی نے اٹک اٹک کر اور رک رک کر پچھلے کل کی ساری باتیں سنا دیں اور پھر بے بسی کی تصویر بن کر شکیل کو دیکھنے لگی جو خود نقش حیرت بنا اسے گھور رہا تھا!۔ پھر اس نے پانی پی کر حلق تر کی اور کھانس کر بولا۔

"لیکن یہ سب۔ کیوں کیا ڈائریکٹر صاحب نے؟ میں ان کی اسکیم کی تہہ تک نہیں پہونچا!۔ کیا مطلب تھا ان سب کی دعوت کا!"

"وہ۔ وہ" روحی ہونٹ چباتی ہوئی بولی! "وہ۔ دراصل آپ کو دیکھنا چاہتے تھے!۔

"کیوں!" احمقوں کی طرح اس نے پھر پلٹ پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔!" روحی جھنجھلا گئی!

"اچھا۔ خیر" وہ پھر کھانس کھنکھار کر بولا: "اگر ان کا مقصد مجھے دیکھنا ہے تو۔ تو وہ پھر مجھے بلا بھیجیں گے۔! ہے نا؟۔

"بالکل!"

"اور مجھے ان کی خدمت میں حاضر بھی ہونا پڑے گا!"

"یہ بھی درست ہے!" روحی مسکرائی!۔

"لیکن اس کا مقصد اب بھی میری سمجھ میں نہیں آیا۔!" شکیل نے کہا

"دراصل آپ کی بے گنتی خوبیوں کا تذکرہ انھوں نے سن رکھا ہے" روحی نے کہا: "کہ آپ بہت ذہین و فطین طالب علم ہیں!۔ ادب و شعر میں آپ کو خاصہ

دخل ہے۔ مقالے آپ بہت عمدہ لکھتے ہیں۔ آپ بہت حسین ہیں۔ آپ کی سیرت بہت اچھی ہے۔ بس۔ یہی باتیں سن سن کر ڈیڈی آپ کو دیکھنے اور ملنے کے مشتاق ہو گئے ہیں!۔ اور کیا ؟"

اپنی قسمت پر کتنا ناز کروں!۔ ایسے چاہنے والے مجھے ملے ہیں!" شکیل نے کہا۔

"دراصل تہہ دل سے شکریہ آپ کا ادا کرنا چاہیئے کہ اپنے والد محترم کو صرف آپ نے ورغلایا ہے۔ ورنہ مجھ گمنام و بے نام کی اتنی ساری تعریفیں ان کی خدمت میں کون جا جا کے کرتا۔!اب اس اندیشے میں مبتلا ہو گیا ہوں کہ اگر واقعی انھوں نے مجھ خاکسار کو اپنی جناب میں طلب فرما لیا تو ان ساری خوبیوں کے برعکس مجھے پاکر وہ کیا سوچیں گے!؟"

اندیشہ کیوں" روحی بڑی مستعدی سے بولی "اتنے حسین جو ہیں آپ!" اسے بے ساختہ ہنسی آ گئی!۔

ہاں ہو سکتا ہے" اس نے ہنستے ہوئے کہا "میرے حسن سے ڈائریکٹر صاحب مسحور ہو جائیں! اور مجھے ڈبیہ میں بند کر کے رکھ لیں!"

"آپ کے خیال میں یہ ناممکن ہے؟" روحی نے عجیب سے لہجے میں کہا اور نظریں نیچی کر کے اخبار کا کونہ مروڑنے لگی!۔

"تو کیا!" شکیل نے تعجب سے کہا "ایسا ممکن ہے؟۔

"ڈیڈی اس کا فیصلہ کریں گے!" روحی کا چہرہ یکبارگی سرخ ہو گیا!۔

روحی۔ خدا کے لیے۔ سچ بتاؤ۔ انھوں نے آخر کچھ تو کہا ہی ہو گا۔!اس نے میز پر سر کا دی اور رومال سے ہاتھ پونچھتا ہوا روحی کے پاس والی کرسی پر آ بیٹھا۔

"مجھ سے کیا کہتے۔!" روحی نے بدن چرا کر اور رخ پھیر کر کہا "ممی سے کہہ دیئے

دیکھے کو شکیل کو دیکھ کر کچھ کہہ سکوں گا!۔ اسی غرض سے انھوں نے بہانے بہانے آپ
سب کو مدعو کیا تھا۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ آپ نہیں آسکیں گے!۔"

وہ اپنے سارے پختہ ارادے۔ سارے فیصلے اور عزم مستحکم بھول گیا۔ وہ آگے
جھکا اور اس طرح روحی کی کرسی کی پشت پر بازو پھیلایا کہ روحی اس کے سینے
سے آلگی!۔ اس نے اس کے کندھے پہ گال رکھ دیا اور پرجوش آواز میں سرگوشی
کی۔۔!" روحی۔ سچ بتاؤ۔ یہ مذاق تو نہیں ہے۔ روحی کیا وہ سچ مچ کوئی فیصلہ
کرنا چاہتے ہیں۔ کیا سچ مچ میرا مقدر اتنی ہی ٹھہر گیا ہے۔ یا میں کوئی خواب دیکھ
رہا ہوں!۔ اچھا تم میرے چٹکی تو لو!"

روحی نے اس کے کف دست پر باریک سی چٹکی لے لی۔ اور اٹھ کر کھڑی ہو
گئی!" آپ کافی پی لیجیے۔ میرا رکشا باہر کھڑا ہے۔ میں تو چلی!" اور اس کے
ایک قدم بھی آگے بڑھانے سے پہلے بھاگ کر دروازے سے باہر نکل آئی!۔

"سنو تو۔ روحی۔ جواب تو دو۔ کل ایک دن امی اور نرسنگ ہوم میں
رہیں گی۔ کل تو تم وہاں آؤ گی نا۔ روحی۔ پلیز۔ ضرور آنا۔ وعدہ کرو۔! سنو
میں تمہارا انتظار کروں گا!"

روحی نے شرارت سے مٹھی میں ہاتھ نچایا۔ رکشا آگے بڑھ گیا۔ شکیل جب
گھر میں گیا تب ہر بن مو سے مسرت کے چشمے جاری تھے!۔

اتنے میں شعلہ کی جھلک دکھائی دی۔ وہ ناظم بیگم کی خیریت دریافت کرنے
روز ہی آتی تھی!۔ شکیل کو مسکراتے دیکھ کر پوچھا۔

" بھیا کسی لاٹری کا انعام نکل آیا ہے کیا۔ اکیلے اکیلے مسکرا رہے ہیں آپ!
ہاں نکلا ہی سمجھو!" وہ ہنس کر بولا۔ " اچھا یہ بتاؤ اس روز وہ جو نیلے
کپڑے پہنے وہ لڑکی۔ مطلب یہ کہ۔۔!

"سمجھ گئی میں آپ کا مطلب۔ آپ روحی بی بی کو کہتے ہیں نا!"

"یہ بی بی میاں کیا بک رہی ہو۔!" وہ دفعتہً سنجیدہ ہو گیا۔ "تم خود کو اس سے کم سمجھتی ہو کیا۔ نام لیا کرو۔ کسی کو کوئی درجہ دینے کی بالکل ضرورت نہیں۔!

"چاہے وہ ایک روز آپ کی دلھن بن جائیں۔ تب بھی!"

"تو کیا۔ یا تو اس کا نام لو یا پھر آپا باجی کچھ کہہ لیا کرو۔ مگر ہاں خیر۔ میں یہ پوچھ رہا تھا کہ تمہیں وہ کیسی لگیں!۔

"اچھی لگی تھیں تبھی تو کہہ رہی تھی کہ میری بھابی بن جائیں تو اللہ قسم میری مراد پوری ہو جائے میں تو ہمیشہ اماں سے کہتی رہتی تھی کہ آپ جتنے خوبصورت ہیں۔ اتنی ہی خوبصورت آپ کی دلہن کو بھی ہونا چاہیئے۔؟"

ہو جائے گی۔ بس دل سے دعا کرو۔ اور اب آؤ۔ یہ سب کچھ تم اپنے گھر لے جاؤ بہت سا کھانا پڑ رہا ہے۔ کیا ہو گا یہ سب؟۔ میں تو اب رات ہی کو کھاؤں گا۔ تم مجھے گرم چائے دے دو۔ پھر میں ذرا سو رہوں گا!۔ بہت تھک گیا ہوں!۔

"میں آپ سے یہ پوچھنے آئی تھی کہ اب اماں کیسی ہیں۔ پٹی کب کھلے گی۔ گھر کب آئیں گی؟ ان کے بغیر جی نہیں لگ رہا ہے!"

آجائیں گی۔ انشاء اللہ پرسوں تک۔"

چائے کے بعد وہ کچھ دیر آرام کرنے کے لیے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ بستر پر لیٹ کر نیند کی خوشامدیں شروع کر دیا۔ آجائے تھوڑی ہی دیر کے لیے سہی۔ لیکن دماغ میں خوشیوں کے فوارے یوں جاری تھے کہ غنودگی کے لیے جگہ باقی نہ بچی تھی!۔ کچھ دیر کروٹیں بدلتے رہنے کے بعد وہ بے زار ہو کر

اٹھا اور کپڑے بدل کر اپنے کسی دوست سے ملنے چلا گیا!۔

روحی یہاں سے سیدھی نرسنگ ہوم پہونچی تھی۔ اور اب بیٹھی ناظمہ بیگم سے باتیں کر رہی تھی!۔ اس کے جذبے اتنے قوی اور شدید تھے کہ وہ اپنی تعلیم اور اپنا سب کچھ بھولی ہوئی تھی!۔ کچھ دیر کے لیے اس نے اپنی تقدیر کو بھی فراموش کر دیا تھا۔ جو اس کی محبتوں کے نشیمن کو پھونکنے پر تلی بیٹھی تھی!!

سعید صاحب اپنے بلال کے فیل ہونے کے بعد کچھ غصیلے اور چڑچڑے ہو گئے تھے۔ ان کے مزاج کی تبدیلی آمنہ بیگم پر بھی اثر انداز ہوئی تھی۔ وہ بھی سب سے کٹی کٹی کہ سعید صاحب سے بھی برگشتہ رہنے لگی تھیں۔ اب میاں بیوی کی ذہنی حالت یہ تھی کہ کسی چھوٹی سی چھوٹی بات کا الزام ایک دوسرے پر رکھ دیتے تھے!۔

سعید صاحب کا خیال تھا کہ بیوی نے اپنے دُلار میں روحی کو اس قدر نڈر کر دیا تھا کہ وہ من مانی کرنے لگی تھی۔ آمنہ بیگم ترکی بہ ترکی کہہ اٹھتی تھیں۔ وہ تو باپ تھے۔ ان کا رعب زیادہ ہونا چاہیئے تھا۔ انھوں نے اسے شہ دے دے کر اور بے جا طرفداری کر کے اس نوبت پر لا کھڑا کیا ہے!۔

بہرحال روحی ان دونوں کے نزدیک ایک مسئلہ بنی ہوئی تھی! سعید صاحب کو تو فقط غصہ تھا۔ جبکہ آمنہ بیگم کو غصہ کے ساتھ فکر بھی تھی! ان کی جانی بوجھی وہ ساری لڑکیاں جوان کی روحی کی ہم عمر تھیں۔ سب اپنے گھر بار سے لگ چکی تھیں۔ اور روحی ابھی اپنی دانست میں بچی ہی بنی تھی جبکہ اس کی عمر میں خود آمنہ بیگم دو بچوں کی ماں بن چکی تھیں!۔

اس طرح جو کہ وہ چلی گئی تھی۔ اور سعید صاحب بڑے غصے سے کچھ کہہ رہے تھے ”تم نے بھی آخر اپنے زمانے میں بھاڑ جھونکا ہی تھا۔ کیا کبھی یوں لبالب بھر کے ٹفن کالج لے گئی ہو! ۔ مجھے واقعی دال میں کالا نظر آ رہا ہے۔ وہ پڑھنے نہیں جاتی۔ پکنک منانے جاتی ہے۔!

روز کی پکنک کیا معنے“ آمنہ بیگم نے کہا۔ ”کہہ رہی تھی کہ اسپشل کلاسز ہونے لگی ہیں!۔

”حماقت انگیز باتیں مت کیا کرو۔! اسپشل کلاسز کے لیے وہ چار وقتوں کا کھانا لے کر جاتی ہے؟۔ وہ پھٹ پڑے ”کیا اس نے اپنے سب لفنگے ساتھیوں کی ذمہ داری بھی لے رکھی ہے۔ یہ آخر قصہ کیا ہے۔؟ تم نے تو شاید پوچھا ہی نہ ہو!“

”پوچھا تھا تبھی تو پتہ چلا“ آمنہ بیگم نے جواب دیا ”میں کہتی ہوں۔ آپ مجھ پر بیکار کیوں غصہ کرتے ہیں۔ آخر آپ ہی ایک چکر یونیورسٹی کا کیوں نہیں لگا لیتے۔ سب کچھ معلوم ہو جائے گا!۔ اور اسے بھی معلوم ہو جائے گا کہ آپ صرف اسی کی خاطر وہاں گئے ہیں!۔

”اور وہاں جانے کے بعد کوئی نامناسب بات معلوم ہو گئی تو پھر وہیں گڑ جاؤں زمین میں“ سعید صاحب نے بڑے غصے سے انھیں گھورا“ اتنا سوچا کہ پھر کیسے نظریں چار کروں گا سب سے!“

”یہ بھی تو سوچیے کہ آپ کی لاعلمی میں کوئی ایسی ویسی بات مبین میاں کی طرح کسی اور کو بھی معلوم ہو گئی تو بھی آپ کی عزت و نیکنامی کے لیے خطرہ ہے نا! میں تو یہی کہوں گی کہ اپنے اختیار کام میں لائیے اور بٹھا دیئے اسے گھر!۔ آمنہ بیگم نے مشورہ دیا۔

سعید صاحب کی برہمی کا رخ دوسری طرف پھر گیا: "خدا غارت کرے۔ تمھاری لالچی کنگلی بھاوج کو۔ وہی اتنا منھ نہ پھیلاتیں تو ناصر نہایت معقول بچہ تھا۔ اب دیکھتا ہوں کہ ان مٹلی گنبد کی کر دو پٹی کی لڑکی کہاں سے مل جاتی ہے۔ خدا کی مار! ناصر نے پہلے ہی گھر بھر رکھا ہے۔ پھر بھی ہوس اور ہو کا اس قدر ہے کہ بس سمیٹو جہاں سے جو کچھ مل سکے۔ لاحول ولاقوۃ۔ اب میں تمھاری نام نہاد بھاوج محترمہ کو گھر میں قدم نہ رکھنے دوں گا!۔

وہ آپی آپ کھول کر چپ رہیں!۔

سعید صاحب نے بڑے غصے میں کپڑے پہنے اور جوتے پہن کر ڈوریاں کس رہے تھے کہ ڈیوڑھی میں بہت سے قدموں کی آوازیں اور چھوٹے بڑے قہقہے سنائی دیے!۔

"اب کون آیا ہے۔!" وہ بڑبڑائے!۔

دفعتہ آمنہ بیگم کی پرمسرت ننھی سی چیخ سنائی دی: "ارے! نوید! عبید اور سلمٰی۔ یہ تم سب کے سب اچانک کیسے آگئے؟۔ پہلے سے نہ خیر نہ خبر۔ یکایک کیسے پروگرام بن گیا؟"

عبید آکر ماں سے لپٹ گیا!۔ آمنہ بیگم خوشی کے مارے بے حال سی اس کے گال منھ چومنے لگیں!۔ سب ادھر ادھر ٹک گئے!۔ سعید صاحب کا آتش فشاں غصہ بھی یکبارگی ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ اب وہ بھی کھلے پڑ رہے تھے!۔ اور اپنا جانا ملتوی کر کے بھائی کے پاس بیٹھ گئے، سلمٰی، نوید صاحب کی خوبصورت بیگم سامان رکھوا رہی تھیں۔ ان سب کے ساتھ ایک بے حد پیاری سی لڑکی بھی تھی۔ سفید لباس میں ملبوس حسین پر رو پہلے تاروں کا باریک و نفیس کام بنا ہوا تھا۔ سفید آنچل سے سر ڈھانکے ہوئے۔! بڑی پاکیزہ اور پیاری ہو

رہی تھی!۔

"یہ جویریہ بی بی کیسے آگئیں بھئی!" سعید صاحب اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ہنس کر بولے "شاید دس سال بعد تشریف لائی ہیں۔ مگر بھائی پچھلی مرتبہ کی طرح رو کر تو نہیں بھاگیں گی؟"

"اوہ چچا جان۔ وہ بات آپ کو اب تک یاد ہے۔!" وہ گلابی ہو گئی! "تب تو میں چھوٹی سی تھی۔ اور ممی یاد آگئی تھیں نا۔ اس لیے۔!"

"ہاں اب ماشاءاللہ تم پچاس سال کی ہو گئی ہو۔!" وہ ہنسے۔ پھر بولے بھئی بہت اچھا کیا۔ جویریہ کو بھی لیتے آئے۔ مگر یہ بتاؤ کہ کسی قسم کی اطلاع کے بغیر تم سب آ کیسے گئے!۔ ذرا دیر بعد آتے تو میں چلا گیا ہوتا!۔"

"بھائی جان بس عبید اور جویریہ کے امتحانات ختم ہو چکے تھے" نوید صاحب نے کہا "ہائی کورٹ بھی ڈیڑھ ماہ کے لیے بند ہے۔ ہم نے سوچا کہ آپ سب سے مل آئیں۔ پھر مصروف ہو جاتے ہیں۔ موقعہ کہاں ملتا ہے۔ بھابی اور دحی کہاں ہے! اسی سے ملنے کی اتنی جلدی تھی اور وہی دکھائی نہیں دے رہی!۔"

باجی یونیورسٹی میں ہوں گی کیوں نا ممی۔! "عبید بولا" اب ہم جائیں گے اور انھیں پکڑ لائیں گے! کیوں نا پاپا۔! اس نے نوید سے کہا "آپ چلیے گا میرے ساتھ" وہ چچا کو پاپا اور چچی یا خالہ کو امی کہتا تھا!۔

یہاں ہم تو اب خوب زوردار ناشتہ کر کے ذرا لمبی تانیں گے!" نوید بولے پھر پوچھا "بھائی جان ردحی کب تک آجائے گی۔ میں اس کے لیے جانے کیا کچھ اٹھا لایا ہوں۔ میں تو راستے بھر یہی سوچ رہا تھا کہ وہ میرے لپٹ جائے گی اور کیا لائے کیا لائے کا شور مچا کر ناک میں دم کر دے گی!۔ مگر وہ اب بڑی ساری ہو گئی ہو گی کیوں بھابی؟۔"

اے لو۔ تین سال بعد اسے دیکھو گے۔ اب اس میں فرق تو نہیں معلوم ہی ہو گا!" آمنہ بیگم نے کہا۔ پھر وہ ان سب کے ناشتے کے انتظام میں چلی گئیں!۔

"سنا ہے کہ آج کل لمبی چھٹی پر مصطفےٰ بھی آئے ہوئے ہیں!" نوید نے کہا۔ "یہاں سے ٹور پر ناظم صاحب گئے تھے۔ وہ انہی کے لائین کے ہیں۔ ملے تھے۔ وہی کہہ رہے تھے۔"

"ارے انھیں اپنے ہاں بلا لیجیے نا بھائی جان" سلمیٰ نے کہا "ایسا نہ ہو کہ واپس چلے جائیں۔ ہم اپنے یہاں رہتے تک سب سے ملنا چاہتے ہیں!۔

"بڑا پیارا آدمی ہے۔ مجھے بے حد پسند ہے۔ فون کر کے بلا لو۔ چلا آئے گا۔" سعید صاحب نے کہا۔ "مطلب یہ کہ ہیجر ہو گیا ہے۔ نام کو بھی اکڑ غرور نہیں۔ جب بھی ملتا ہے اتنی سادگی سے کہ مجھے تو پیار آ جاتا ہے۔

"میں فون کر دوں؟" نوید بولے۔

"ارے پہلے تم غسل کر کے ناشتہ تو کر لو۔ بعد کو فون کر دینا۔ یا پھر ہم ہی چل کر مل آئیں" سعید صاحب نے تجویز پیش کی تھی مگر سلمیٰ نے کہا "اب ہم لوگ ایک قافلہ کی طرح ان کے ہاں کیا جا دھمکیں گے۔ آپ بس مصطفےٰ ہی کو بلا لیجیے!۔

"ہاں تب تک ناشتہ وغیرہ تیار ہوتا رہے گا۔ وہ بھی شریک ہو جائیں گے!" نوید یہ کہہ کر فون کرنے چلے گئے!۔

"چچا جان میں جاتی ہوں۔ چچی جان کا ہاتھ بٹاؤں جا کے" جویریہ اٹھ کھڑی ہوئی "میرا دل نوروجی کے بغیر لگ ہی نہیں رہا۔ خدا معلوم کب آئیں گی۔ دراصل انھیں پتہ بھی کیا تھا کہ ہم سب آ رہے ہیں!۔

"ہاں یہی بات ہے۔ کچھ تم لوگ ٹیلی گرام وغیرہ دے دیتے تو وہ تم سب سے ملنے کی خوشی میں خود بھی نہ جاتی!" سعید صاحب نے کہا۔

پھر وہ بھی باہر چلے گئے۔ جویریہ کچن کی طرف چل دی۔ اور سلمیٰ بڑے کمرے میں نوکروں سے سامان رکھوانے لگیں! عبید ٹی وی آن کر کے ایزی چیئر پر آ بیٹھا۔!

آمنہ بیگم کا دل پھول کی طرح کھلا تھا۔ عبید کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں سترہ سال سے زیادہ عمر کا نہ تھا مگر کتنا بڑا لگ رہا تھا! صورت شکل کا بھی کیسا اچھا تھا۔ وہ بس ہنسے دیتی تھیں۔ اتنے میں جویریہ بھی پھر آ گئی!۔

"آپ جائیے چچی جان۔ جا کے سلمیٰ باجی سے باتیں کیجیے!" وہ ان کے ہاتھ سے انڈوں کی جالی لیتی ہوئی بولی "اتنے دنوں بعد تو آپ ان سے ملی ہیں۔ میں بس آدھے گھنٹے میں ناشتہ تیار کر کے لیے آتی ہوں!۔"آپ کہاں تکلیف کر رہی ہیں تم تو مہمان ہو بیٹی۔!" وہ بے حد خوش ہوئیں۔ "آرام تو تم کرو۔ تھکی ہوئی ہو گی۔ سفر کر کے آ رہی ہو!۔ ایسا ہی ہے تو پھر کبھی۔۔۔!"

"ہوائی جہاز کے سفر میں تھکنا کیا چچی جان!۔ وہاں بیٹھے یہاں اتر گئے!۔" وہ ہنس دی اور اس کے گالوں میں ننھے ننھے خوشنما گڑھے پڑ گئے!۔ بہرحال اس نے زبردستی آمنہ بیگم کو کچن سے جانے پر مجبور کر دیا۔ وہ ان کی رشتہ دار کسی بھابی کی لڑکی تھی!۔ چونکہ اس کے والدین اپنی وسیع زراعت اور تحصیل کی نگرانی اور ضعیف والدین کی خدمت و خبرگیری کے لیے مجبوراً کسی مضافات میں رہتے تھے۔ لہٰذا جویریہ کو نوید کے ہاں پڑھائی کی غرض سے بھیج رکھا تھا!۔ وہ بھی روحی کی ہم آغوش تھی!۔ اور بی اے کا امتحان دے کر آئی تھی۔ اس نے حنا سا ماں کے ساتھ مل کر سچ مچ بڑی جلدی ناشتہ تیار کر لیا اور جب ٹرالی میں لگا کر ڈرائنگ روم میں آئی تو تقریباً سب وہیں موجود تھے!۔

سعید صاحب اور آمنہ بیگم اس کی تعریفیں کرتے نہ تھک رہے تھے۔ انہیں وہ بے حد پسند آئی تھی!۔ خوبصورت جتنی تھی اتنی ہی خوب سیرت بھی اس لیے چند لمحوں

میں ہی نے بزرگوں کا دل موہ لیا تھا!۔

ابھی وہ لوگ ناشتے سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ ملازم نے مصطفےٰ کے آنے کی خبر دی۔

"یہیں لے آؤ۔ یہیں پہنچا جاؤ۔!" سعید صاحب چیخے!۔

ملازم کے ساتھ مصطفےٰ طعام خانے میں آئے تھے کہ عبید ایک نعرہ مار کر اٹھا اور ان کے گلے میں جھول گیا!۔

"ہا۔ مجو بھائی!" وہ ان کا گال چوم کر بولا "آپ تو مجھے ہالی ووڈ کا کوئی حسین اداکار رہے ہیں۔ گریس فل!۔ بیوٹی فل، اور اور"

"اماں تم بھی یکبارگی کتنے بڑے ہوگئے ہو!" مصطفےٰ نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا اور عبید کو باہوں میں جکڑ کر دو چار زوردار چکر دے دیے!۔

پھر وہ نوید، سلمیٰ سے ملے۔ نوید نے مصافحہ کرتے ہوئے انہیں اپنے پاس والی کرسی پر گرا لیا "آؤ ناشتہ کرو۔! واقعی۔ جب ناظم بھائی نے کہا کہ تم آج کل چھٹی پر گھر آئے ہوئے ہو تو میں تم سے ملنے کے لیے بے قرار ہو گیا! سچ پوچھو تو بھائی جان سے ملنے کا تو بہانہ ہے۔ میں تم سے ملنے آیا ہوں۔ نہایت تفصیلی طور پر۔!"

"جناب! اس طرح محض دل رکھنے کا میں قائل نہیں ہوں۔" مصطفےٰ نے کہا "اگر آپ مجھ سے ملنے تشریف لائے ہیں تو پھر انکل کے یہاں ٹھہرنے کا کیا جواز ہے۔ آپ جانئے کہ میں فوجی آدمی ہوں۔ اور جنگ و جدل کا مجھے تجربہ بھی خوب ہے! اب آپ کو میں سلمیٰ باجی سمیت اپنے یہاں لے چلوں گا! انکل سے معافی مانگے اور اجازت طلب کیے بغیر۔ میں اس ظلم پر احتجاج کا حق بھی رکھتا ہوں کہ آپ ہوائی اڈے سے سیدھے غریب خانے ہی پر کیوں نہ آگئے؟"

"یار سانس تو لے لو کم سے کم!۔ اتنی لمبی تقریر تم نے کر دی ہے!" نوید نے

کہا "میں تمھارے ہاں ضرور آجاتا مگر مجھے یہ یقین کہاں تھا کہ تم ابھی موجود ہو میں یہ سمجھ رہا تھا کہ چھٹیوں کے ختم پر تم جا چکے ہوگے!"

"اچھا تو اب چلیے نا۔ آپ کی تاویل پر میں آپ کی فرو گذاشت معاف کرتا ہوں" مصطفےٰ نے کہا اور آہستہ بیگم سے بولے "آنٹی۔ ذرا میری پیالی پھر سے بھر دیجیے!۔ یہ قیمہ بھرے سموسے نہایت لذیذ ہیں۔ کس نے بنائے ہیں!"

"جولی باجی نے!" عبید بول پڑا۔

"اوہ!" مصطفےٰ نے کہا اور ایک نظر جویریہ پر ڈال کر سر جھکا لیا۔ کتنی من موہنی سی لڑکی ہے۔ مگر ہے کون۔ وہ تو اسے پہلی دفعہ دیکھ رہے تھے!۔

"بھئی دیکھو!۔ ہم ایک منصفانہ فیصلہ کیے دیتے ہیں!" سعید صاحب نے کہا "نوید کے تمھارے ہاں رہنے کا مطلب یہ ہوگا کہ لامحالہ ہم سب بھی تمھارے ہاں چلے چلیں۔ کیونکہ ان کے بغیر ہم بھی نہیں رہ سکتے!۔ لہٰذا"

ارے تو آپ سب بھی ساتھ چلیے نا۔ واللہ۔ کیا یادگار اجتماع ہوگا۔ مجھے زندگی بھر یاد آیا کرے گا!۔ ہم ساتھ ساتھ سیر سپاٹے کرتے پھریں گے۔ مختلف تفریحیں ہوا کریں گی، کیرم، تاش، بیت بازی۔ واہ۔ میں تو ترستا ہوں ایسی محفلوں کو خدا کے لیے انکل آپ سب بھی چلیے ہمارے ہاں" مصطفےٰ نے کہا۔

میاں وہی تو میں بھی کہہ رہا تھا!"۔ سعید صاحب نے کہا "تم نے میری پوری بات ہی نہ سُنی!۔ بھائی ہم سب کا چلنا تو ذرا مشکل ہے۔ تم البتہ اکیلے ہو۔ اپنے ماحول سے گھبرا بھی چکے ہو۔ تمھارا یہاں چلا آنا ایسا مشکل نہیں ہے۔ چنانچہ تم اب یوں کرو کہ ان حضرات کے قیام تک یہیں رہو۔ کچھ یادگار دن گزر جائیں ہمارے بھی۔ کیا خیال ہے!"

"ملائیے ہاتھ!" نوید ان کی طرف ہاتھ پھیلا کر بولے۔

مجو بھائی۔ پلیز۔ میری خاطر۔۔! عبید کرسیاں پھلانگ کر ان کے پاس آ بیٹھا اور اپنا ہاتھ پھیلا دیا۔ "ملایئے ہاتھ مجھ سے بھی!"

مصطفےٰ نے ہنستے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ نوید و عبید کے ہاتھوں میں دیدیے!

تھری چیئرز فار۔ "نوید نے چلا کر کہا۔

مجو بھائی!" عبید بھی حلق پھاڑ کر بولا۔

ہپ ہپ۔۔!" نوید نے کہا۔

ہرے!" عبید نے نعرہ لگایا۔ مصطفےٰ کا قہقہہ اس کے نعرے میں گھل مل گیا

یا اللہ۔ ان کا بچپن نہ گیا!" سلمٰی نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔؟

جب تک یہ لوگ طعام خانے میں رہے۔ بڑا غل ہوتا رہا۔! پھر سعید صاحب اٹھ گئے!۔

"میرا جانا بہت ضروری ہے۔ شام کو جلدی چلا آؤں گا!۔ پھر وہ بیوی کی طرف مڑے۔ "آمنہ! رات کا کھانا شاہی ہونا چاہیئے۔۔!"

"ضرور ضرور!" وہ ہنس کر بولیں۔ "اب ہماری جویریہ آگئی ہے۔ مجھے کھانا پکانے کی کیا فکر!"

ڈیڈی۔۔!" عبید چیخا۔ "میں اور مجو بھائی یونیورسٹی جا کے باجی کو لے آئیں کیا؟۔ ان کے بغیر جی نہیں لگ رہا۔ نجانے کب آئیں گی؟"

ہاں ہاں۔ ضرور لے آؤ!" سعید صاحب نے کہا۔ وہ بھی یہی چاہتے تھے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ عبید اپنے ساتھ زبردستی مصطفےٰ کو لے گیا۔ یوں بھی اسے ڈرائیونگ نہیں آتی تھی!۔

عبید اپنی بہن سے ملنے کے لیے بہت بے چین ہو رہا تھا!۔ وہ راستے بھر مصطفےٰ کے پیچھے پڑا رہا۔ "اور تیز چلایئے۔ اور تیز۔!"

برکت پورہ کی سنسان سڑک پر کار فراٹے بھر رہی تھی!۔ لیکن ان کا یہ سفر محض بیکار گیا بلکہ سفر بن کر رہ گیا۔ کیونکہ جب وہ دونوں اوپر پہونچے اور انگریزی لٹریچر کے ڈین سے مل کر روحی کو اپنے ساتھ لے جانا چاہا تب انھوں نے انکشاف کیا کہ روحی سے انھیں بڑی شکایت ہے۔ کیونکہ عین امتحان کے اہم دنوں میں وہ مسلسل ہفتہ بھر سے غیر حاضر ہے!۔ اور بڑے ضروری نوٹس سے محروم ہو گئی ہے!"

"ہفتہ بھر سے!" بے اختیار مصطفےٰ کے منھ سے نکلا!۔

"مکمل ہفتہ بھر سے۔! طالب علموں کی اتنی بے پرواہی میں قطعی پسند نہیں کرتا"

ڈین صاحب بہت ناراض تھے" غیر حاضری کی وجہ کیا ہے۔ وہ اتنی ذہین اسٹوڈنٹ ہیں۔ ان کا کیریئر خراب جائے گا!۔ انھیں فوراً حاضر ہونے کی ہدایت کیجئے!"

ان کی واپسی خاموشی سے ہوئی!۔ اب عبید کہہ رہا تھا۔

"آہستہ چلائیے۔ اور آہستہ۔ اور آہستہ!۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ۔!"

اور وہ خاموش ہو گیا!۔

مصطفےٰ نے کسی سے کچھ نہ کہا۔ مگر عبید نے جاتے کے ساتھ ہی حشر اٹھا دیا۔ ڈین صاحب کی باتیں سب سے کہہ دیں۔ وہ بہت بگڑ رہے تھے۔ باجی مکمل ایک ہفتے سے یونیورسٹی نہیں جا رہی ہیں۔ فیل ہو جائیں گی تو کیا حشر ہوگا!۔ کیا سہیلیوں کے ساتھ مل کر سیر سپاٹے کرتی پھرتی ہیں۔ باجی اتنی کیر لیس تو نہ تھیں!۔

سب گم صم تھے۔

عبید!۔ میں شام کو آؤں گا بیٹے۔! اب اجازت دو!" مصطفےٰ نے کہا

کسی نے اسے نہ روکا اور وہ چپ چاپ چلا گیا!۔

دیر بعد سلمیٰ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا" یہ کیا قصہ ہے باجی۔ روحی وہاں نہیں جا رہی تو پھر کہاں جاتی رہی ہے؟"

عبید!۔ بیٹے تو جا کے سو رہ۔ آنکھیں لال ہو رہی ہیں تیری۔!" آمنہ بیگم نے اسے چمکارا۔ نہیں چاہتی تھیں کہ روحی کی دیدہ دلیری کی کہانی اس کے سامنے کہیں۔ وہ اٹھ کر چلا گیا!۔

نوید حیرت و تعجب سے انھیں دیکھ رہے تھے!۔ چنانچہ آمنہ بیگم نے گلو گرفتہ لہجے میں روحی کے مزاجی انقلاب کی کہانی کہہ دی۔! شکیل کا تذکرہ کیا۔ اپنے شکوک و شبہات کا اظہار کیا۔ اور بھی بہت کچھ کہتی رہیں!۔ اخیر میں رو بھی پڑیں!۔

" بھابی!۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ نے اور بھائی جان نے غلطی کی ہے مگر میں یہ آپ سے پوچھتا ہوں کہ جب آپ کو علم ہو چکا تھا کہ وہ شکیل نامی لڑکے کے ساتھ دیکھی گئی ہے تو آپ نے فوراً اس کی تعلیم ترک کرا کے اسے گھر کیوں نہ بٹھا لیا؟۔ میں تو حیران ہوں وہ اتنے دنوں سے یونیورسٹی نہیں جا رہی ہے اور اس بات کا علم نہ تو آپ کو ہے نہ بھائی جان کو۔ بھابی۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے؟"

خدا نہ کرے۔ بھیا۔ یہ نہ کہو۔!" آمنہ بیگم لرز کر رہ گئیں۔" شریف خاندان کی لڑکی ہے۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو اسے زہر دے کر سلانا ہی پڑے گا!۔ اس کے سوا کوئی دوسرا علاج نہیں۔ ہائے میں شروع ہی سے تمھارے بھائی سے کہتی رہی کہ اسے آگے نہ پڑھاؤ۔ ایف بی اے ہو چکی ہے۔ بس ہے۔ مگر وہ میری ایک نہ سنیں!۔ اب یہ بھگو!

کلیجہ کٹا جا رہا ہے۔ آخر وہ اس وقت ہوگی کہاں۔؟ مولیٰ تو خیر کرنا!"
اپنی بچی ایسی نہیں ہے" سلمیٰ نے کہا "اسے اس لڑکے ہی نے بہکایا ہوگا۔
یہ یونیورسٹی میں پڑھنے والے بدمعاش بس کسی معصوم اور بھولی بھالی لڑکی کو
دیکھ لیں۔ پھر کہاں چپ رہتے ہیں!۔

"اب وہ آجائے تو اس سے کچھ نہ کہیے" نوید نے مشورہ دیا "اور بھائی صاحب
سے بھی کہہ کر بات کا جھگڑا بنانا مناسب نہیں۔ بس آپ آئندہ اسے ہرگز ہرگز قدم
گھر سے باہر نہ نکالنے دیں!۔ بھابی۔ یہ معمولی بات نہیں ہے۔ ہم سب ہی کو زہر
کھا کر سو جانا پڑے گا!"

میرا تو دل رکا جاتا ہے" آمنہ بیگم کا حال ابتر تھا "خدا کرے اصل خیر سے
وہ آ تو جائے۔ پھر جو اسے باہر جانے دوں۔ سچ یہ ہماری غفلت ہے۔
ہم نے ایک نامناسب بات سنی تھی مگر کانوں میں تیل ڈالے آنکھوں پر پٹی
باندھے بیٹھے رہے!"

"مصطفےٰ کو بھی یہ بات معلوم ہوگئی ہے!" سلمیٰ نے بہت آہستہ سے کہا۔
"نہیں نہیں! وہ ایسا آدمی نہیں ہے کہ ایک ایک سے اس کا چرچا کرتا پھرے"
نوید نے کہا پھر پوچھا "کب تک آجاتی ہے!" نوید اٹھ کر ٹہلنے لگا!۔
چار پانچ اور کبھی کبھی چھ بج جاتے ہیں!" آمنہ بیگم نے کہا ان کا دل بیٹھا جا
رہا تھا۔ طرح طرح کے المناک اندیشے ان کا سکون درہم برہم کر رہے تھے۔ رہ رہ کر
ایک ناگ ان کے دماغ میں پھن پھیلا کر پھنکارنے لگتا!۔

اب ان کی وہ بچی معصوم اور پاک نہیں رہ گئی!"
اس خیال کے ساتھ ہی دل کی دھڑکن تکلیف دہ حد تک تیز ہو جاتی!۔
انھیں متفکر اور پریشان دیکھ کر جویریہ چپکے سے اٹھی اور باورچی خانے میں

پہونچ گئی!۔ وہ بھی یکبارگی خاموش سی ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ سارے واقعات سن کر اُسے عجیب سا محسوس ہو رہا ہے۔ جیسے روحی وہ روحی نہ ہو۔ جس سے ملنے کے اشتیاق میں وہ دوڑی آئی تھی!۔

دالان میں اب سناٹا تھا! بیٹھے سب تھے۔ لیکن اپنی اپنی فکروں میں غرق۔ وقت بڑی آہستہ روی سے گذر رہا تھا!۔ ان سب کے کان آہٹوں پر اور آنکھیں بڑے دروازے پر لگی تھیں!۔

شام کی چائے سرد کی جا چکی اور در و بام پر دھندلے سائے پھیلنے لگے!۔ پھر کسی ملازم نے گھر بھر کے بلب آن کیے اور خوشخبری سنائی۔

"چھوٹی سرکار آگئیں!"

نوید نے اشارے سے آمنہ بیگم کو منع کر دیا کہ وہ یکبارگی اس پر نہ امڈ پڑیں اور خود آگے بڑھ گئے اب عبید بھی اٹھ آیا تھا اور حسب وعدہ مصطفے ابھی آ چکے تھے!۔ دروازے میں سلمیٰ اور جویریہ بھی موجود تھیں!۔

روحی اوپر آئی اور ان سب کو دیکھ کر فرط مسرت سے یا فرط حیرت سے سکتہ زدہ سی رہ گئی!۔ پھر دفعتہً وہ جھپٹی اور نوید کے سینے سے لگ گئی!۔

"چچا جان آپ۔ ہائے آپ سب کو دیکھ کر کتنی خوشی ہوئی۔ آپ سب لوگ کب آگئے۔ بے خبر تک تو کچھ پتہ ہی نہ تھا۔! اچانک ہی پروگرام بن گیا کیا؟"

"بجو یہ بتایئے کہ آپ تھیں کہاں۔ میں اور مجو بھائی آپ کو لینے یونیورسٹی گئے تھے آپ وہاں نہیں تھیں آپ کے ڈین صاحب خوب ناراض ہو رہے تھے"۔ عبید بول پڑا مصطفےٰ دور کھڑے سینے پر دونوں ہاتھ لپیٹے بڑی گہری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اور سوچ رہے تھے۔ کوئی ایسا خوش قسمت ہوگا جسے اس کی محبت حاصل ہوگی!۔

روحی ایک پل کے لیے جھجکی پھر بڑی معصومیت سے بولی "ہاں میں تو ممی سے کہہ کے جاتی ہوں کہ کورس مجھے دشوار لگتا ہے۔ میں اپنی ایک دوست کے ہاں جاتی ہوں۔ ہم مل کے اسٹڈی کرتے ہیں!"

اچھا ہوگا!" نوید نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا" تم سب سے مل چکو اور ہم سب ناشتہ وغیرہ کرلیں تو پھر چلیں گے گھومنے پھرنے۔ ہاں بھئی تم نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میں تمھارے لیے کیا لایا ہوں!"

"اللہ چچا جان اب تو میں اتنی بڑی ہوگئی ہوں" وہ پیار سے ٹھنکی!۔

نوید دیکھ رہے تھے کہ وہ ہمیشہ کی سی سیدھی سادی معصوم بھولی بھالی لگ رہی تھی کسی قسم کی بدعنوانی کا نشان کسی پھندے کا کرب خفیف سے گناہ کی سیاہی اس کے صاف شفاف چہرے پر نہ تھی۔ بلکہ وہ تو انھیں ہمیشہ سے زیادہ حسین اور جاذب نظر لگ رہی تھی۔ انھوں نے سوچا کہیں ان ہی سب کو تو کوئی غلط فہمی نہیں ہوگئی؟۔

روحی باری باری سب سے ملی۔ اس کی خوشی جویریہ کو دیکھ کر دوبالا ہوگئی تھی کسی زمانے میں دونوں بہت گہری سہیلیاں تھیں۔ وقت نے مفارقت کی خلیج ان کے درمیان حائل کردی تھی لیکن اس نے ان کے جذبۂ الفت و موانست پر کوئی اثر نہ ڈالا تھا!۔

وہ سب کے ساتھ اندر آئی تو خلاف معمول اس کی نظر مصطفےٰ پر پڑی۔ پہلی دفعہ گھر پر دیکھا تھا۔ حیرت ہوئی!۔ پھر بھی وہ آگے بڑھی جارہی تھی لیکن مصطفےٰ نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"آداب عرض کرتا ہوں! آپ نے مجھے پہچانا؟"

آپ کو بھول کون سکتا ہے!" بے ساختہ روحی کی زبان سے نکل گیا

"زہے نصیب!" وہ زیرلب بولے

"جی؟"

"جی میں نے کہا آپ کا شکریہ!" وہ اپنی خاص ہنسی ہنسنے لگے جس سے ان کا وجیہہ و خوبصورت چہرہ روشن ہو جاتا تھا!۔

جویریہ اسے اپنے کمرے میں کھینچ لے گئی! اور صوفہ پر ڈھیر ہو کر بولی۔" ہاں اب سناؤ! تفصیل سے۔ پچھلے دس گیارہ برسوں کی ایک ایک بات۔ مع منظر نگاری و محاکات نگاری۔!"

اتنے میں جمالی ان کے لیے چائے لے آئی۔ اور بولی۔" چھوٹے صاحب کہہ رہے ہیں۔ تیار ہو کے جلدی چلی آیئے گا۔ انھیں شوپنگ کے لیے جانا ہے!"

"جمالی ایک خوشخبری سن جا!" روحی بولی۔ خوشی اس کے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔! اس نے فرط مسرت سے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"ارے جمالی۔ سچ مان کہ ان کی امی کی بصارت واپس آگئی ہے۔" وہ ہنس دی۔" میں وہیں تو تھی۔ ہائے جب ڈاکٹر صاحب نے ان کی پٹی کھولی ہے تو میرا دل مارے دھڑک دھڑک کے حلق میں آیا جا رہا تھا۔ شکیل صاحب کا چہرہ بھی فق تھا۔ ارے وہ بے چاری خود بھی اس قدر ڈر رہی تھی۔ مجھے ان پر بے حد ترس آ رہا تھا۔ مگر اللہ نے ان پر رحم کیا۔ انھوں نے اندھیرے کمرے میں آنکھیں کھولیں۔ اور پھر بولیں کہ مجھے سب کچھ نظر آ رہا ہے۔ میز کرسیاں، آدمی نرس، ان کا آپریشن بے حد کامیاب رہا! شکیل صاحب کی خوشی کا عالم نہ پوچھو!۔

جمالی چپ چاپ سنتی رہی!۔ جویریہ حیران تھی۔ اسے جھنجوڑ کر بولی۔" یہ کیا کہے جا رہی ہو۔ ایک لفظ تک میرے پلے نہ پڑ سکا!۔ کس کا تذکرہ ہے روحی۔ کس کا آپریشن ہوا کس کی بصارت واپس آ گئی۔ کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ!"

"ایک ہیں میری پہچان کی خاتون!" روحی نے کہا۔
جمالی جب برتن لے کر چلی گئی تب جویریہ نے اسے جھنجھوڑ ڈالا اور وہ سب باتیں اس سے کہہ دیں جو بزرگوں میں ہوئی تھیں!۔ اور پھر بولی "روحی! اگر تم نے سچ مچ کوئی حماقت ہی کی ہے تو اب بھی وقت ہے۔ سنبھل جاؤ۔ تم نہیں جانتیں کہ یہ سب لوگ تمہارے بارے میں کیا مشورے کر رہے ہیں! تمہیں کل سے کہیں جانے نہ دیا جائے گا اور غالباً چچی جان کہہ رہی تھیں کہ۔ وہ۔ جو۔ مطلب یہ کہ جن صاحب کو تم نے ابھی ٹی وی کے پاس کھڑے دیکھا تھا۔ وہ کیا نام۔ مصطفٰے صاحب۔ جو ہیں۔ ان سے تمہارا بیاہ کر دیا جائے گا!۔ تم سب کے لیے خطرہ بنی جا رہی ہو!"
"کیا تم سچ کہہ رہی ہو جولی؟" روحی کے چہرے پر ہوائیاں اڑ گئیں!۔
"بالکل سچ کہہ رہی ہوں روحی!" جویریہ نے سنجیدگی سے کہا "میں یوں بھی جھوٹ نہیں بولتی۔ اور تم یہ تو اندازہ کرو کہ ان سب باتوں کا بھلا مجھے کیا پتہ لگتا؟۔ اب تم مجھ سے تو کم از کم سچ سچ کہہ دو!"
روحی نے گہری سانس لی "کیا کہہ دوں تم سے۔ جولی۔ کون سے جرم کا اقرار کر لوں کون سے گناہ کا اعتراف کر لوں۔ اپنی کون سی غلطی کو تسلیم کر لوں۔ کیا کیا ہے میں نے۔ جولی میں تو اس وقت خود کو مظلوم سمجھ رہی ہوں۔ کیا حشر ہو گا میرا اگر مجھ پر میری خوشیوں کے دروازے بند کر دیے جائیں گے!۔ نہیں!۔ میں تو شاید اس طرح زندہ نہ رہ سکوں!"
"اگر تم سچ مچ کچھ چاہتی ہو تو پھر چچی جان سے صاف صاف کہہ کیوں نہیں دیتیں" جویریہ نے مشورہ دیا "وہ تو چچا جان سے کہہ رہی تھیں کہ مصطفٰے صاحب بہت اچھے آدمی ہیں اور ان سے ——!"

مصطفٰے صاحب بہت اچھے آدمی ہوں گے اپنی جگہ۔" روحی نے کہا "مگر مجھ سے کیا؟"

"پاگل ہو رہی ہو کیا۔" جویریہ نے اس کے بے تکے جواب سے پریشان ہو کر کہا۔

"ارے میں کہہ رہی ہوں کہ ان سے تمہارا بیاہ ہونا قرار پایا ہے۔ اب شاید ان کے بڑوں کو بلا کر بات چیت کی جائے گی!"

"اگر ایسا ہو گا تو ڈیڈی ممی پچھتائیں گے!" روحی نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔ "وہ یہ سمجھتے ہیں کہ میں چپ چاپ سر جھکائے مصطفٰے صاحب کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ مگر۔ ہاں۔ شاید۔ چلی بھی جاتی۔ میں نے اگر۔۔!"

"روحی یہ کیا اگر مگر کر رہی ہو؟" جویریہ بولی "کیا خدانخواستہ تمہارا جی کچھ خراب ہے؟ تم آرام کرو روحی۔ ہم رات کو سکون سے باتیں کریں گے۔ اچھا؟"

"میرے ہوش درست ہیں کیا تم کو پتہ ہے ... (illegible)" "میرے ہوش نہ ہوا اس پر جو بجلی تم نے گرائی ہے جویریہ۔ وہ۔ تو سچ مچ۔ مجھے دیوانہ سا کر رہی ہے۔ نہیں۔ یہ ناممکن ہے۔ ان مصطفٰے صاحب کو یہاں کس نے بلایا ہے؟"

"وہ اور نوید چچا بہت پرانے دوست ہیں شاید انہی نے بلایا ہے۔ اب ان کے یہاں قیام تک وہ بھی یہیں رہیں گے!" جویریہ بہت مدھم آواز میں بولی۔

"اُف!" روحی نے سر تھام لیا۔

عبید بھلاوے کی طرح کمرے میں آیا "چلئے۔ پپا بلا رہے ہیں!"

بادل ناخواستہ روحی سب کے ساتھ گئی تھی۔ نوید اور سلمٰی جانے کیا خرید نے پھر رہے تھے۔ روحی کی نظریں مصطفٰے پر تھیں۔ اور جب بھی وہ ادھر متوجہ ہوتی۔ مصطفٰے کو اپنی طرف دیکھتا ہوا محسوس کرتی۔ رہ رہ کر غصے اور بےبسی کی لہر اس کے جسم میں پھر جاتی۔!

واپسی پر نوید نے اسے اپنا لایا ہوا سامان دیا تھا۔ کھانے کے بعد اسے سکون سے اپنے کمرے میں آنا نصیب ہوا۔ اور وہ تب بھی سن رہی تھی کہ باہر برآمدے میں مصطفےٰ اور عبید بیٹھے باتیں کر رہے اور ہنس رہے تھے!۔

دالان میں سعید صاحب آمنہ بیگم، نوید اور سلمیٰ کی کانفرنس ہو رہی تھی!!

محبت ہمیشہ ایک رازدار کی متمنی رہی ہے!۔ محبت وہ بھاری راز ہے جو تنہا محبت کرنے والے کے سینے میں نہیں سما سکتا! وہ اپنے گوناگوں محسوسات، اجنبی سے جذبات اور دل پر گزرنے والی کیفیات کو کسی پر عیاں (ظاہر کرنا چاہتا ہے!۔ محبت ایک ساغم ہے۔ اور یہ غم بٹانے پر زیادہ وزنی ہو جاتا ہے لیکن پھر بھی اس کے لیے ایک مددگار کی ضرورت ختم نہیں ہو جاتی!۔ ویسے روحی جو بڑی پریشان ہوتی رہی تھی!۔ اس نے جویریہ کی ذرا سی تحریک پر اپنے دل کا سارا لاوا اس کے سامنے نکال پھینکا۔! رات کا کوئی سا پہر تھا۔ آسمان گھنے بادلوں سے تاریک ہو رہا تھا۔ دریچے کے نیچے پائپ سے پانی ٹپکنے کی مدھم آواز۔ جلترنگ سا بجا رہی تھی۔ دیوار کے سہارے کھڑے سفیدے اور پھلوں کے درختوں میں تیز ہوا گونجتی ڈراونی لگ رہی تھی!۔ رات کے سناٹے کو مہیب موسم نے زیادہ بھیانک کر رکھا تھا!۔

سب کی خوابگاہیں بند تھیں!۔ دالان میں ایک مدھم سا بلب بیمار زرد روشنی پھیلا رہا تھا! صحن میں چھوٹے چھوٹے گرد باد ردی کاغذوں کے ٹکڑے اپنی آغوش میں لیے چکرا رہے تھے!۔ پھر کہیں دیوار گیر بڑے کلاک نے بلند آواز میں

تین گھنٹے بجائے اور ہلکی ہلکی پھوار کا ترنم گونجنے لگا!۔

ٹیرس برآمدے کے ایک تاریک گوشے میں ایزی چیئر پر نیم دراز مصطفیٰ سگریٹ کے کش لگا رہے تھے۔ نیند ان کی آنکھوں سے دور تھی!۔ روحی کے متاثرانہ سلوک نے ان کی دل شکنی کی تھی!۔ اور انھیں سعید صاحب کا حکم ملا تھا کہ وہ سویرے کمشنر صاحب اور ان کی بیگم کو ان کے ہاں مختصر سے لنچ پر لے آئیں!۔

"آپ خود ہی کیوں نہ تشریف لے چلیئے انکل!" انھوں نے کہا تھا۔

"بیٹا وہ کچھ بات یہ ہے کہ میں دن بھر گھر پر رہنا چاہتا ہوں!" کچھ گڑبڑا کر سعید صاحب نے جواب دیا تھا اور تب مصطفیٰ نے اندازہ قائم کیا تھا کہ وہ روحی کی نگرانی کرنا چاہتے تھے۔ مصطفیٰ کی سوچ کا محور یہی تھا۔ جو کچھ سعید صاحب چاہ رہے تھے۔ کیا وہ روحی بھی چاہ سکتی تھی؟۔ اس نے کبھی ان سے سیدھے منھ بات نہ کی تھی۔ ان سے کتراتی تھی۔ اور شاید انھیں پسند بھی نہ کرتی تھی۔ تب پھر کیا ان کا دائمی ساتھ انھیں سچی مسرت اور خالص اطمینان قلب دے سکے گا!۔ روحی پر وہ اعتماد کر سکیں گے۔ یہ جبر یہ خوشی انھیں کچھ مہنگی تو نہ پڑے گی؟۔

تب پھر کیا ہوگا!۔ اگر سعید صاحب نے کمشنر صاحب سے مل کر کوئی ناقابل تلافی فیصلہ کر لیا۔؟!"

کیا ایسا ناممکن ہے کہ وہ ایک بار روحی سے اس مسئلہ پر گفتگو کر سکیں۔ لیکن کس طرح۔ کیونکر۔ وہ بھلا راضی بھی ہوگی؟۔ مصطفیٰ نے دل میں سوچ لیا تھا اگر روحی نے ان کا ساتھ قبول نہ کیا تو پھر وہ کسی بہانے سے اپنے بزرگوں کو منع کر دیں گے اور ان کا جانا تو تقریباً طے ہی ہے!۔ وہ چلے جائیں گے۔ بے شک یہ پھیکے بےجان لبِ بے مصرف شب و روز کچھ عرصہ تک نیش زنی کرتے رہیں گے۔ اور یاد دلاتے رہیں گے۔ ان مردہ شب و روز میں تھوڑی ہی دیر کے لیے ہی محبت نے روح پھونکی تھی!۔

رات گزرتی رہی اور وہ بجھا ہوا سگریٹ انگلیوں میں دابے سوچوں کے تانے بانے میں اُلجھے رہے!۔

جویریہ نے چپکے سے برآمدے میں جھانکا اور جلدی سے کمرے میں پلٹ گئی "ابھی وہ سوئے نہیں۔ بیٹھے سگریٹ پی رہے ہیں۔ توبہ۔ کیا انھیں نیند نہیں آتی! کیسی اچھی ہوائیں چل رہی ہیں۔ میں تو ایسے موسموں میں پاگل ہو جاتی ہوں اگر وہ برآمدے میں بیٹھے نہ ہوتے تو ہم چل کے موسم کا لطف اٹھاتے!"

کہہ دوں ان سے کہ آپ براہ کرم یہاں سے جائیے!" روحی بولی۔

"توبہ!" جویریہ نے کہا۔

"تو پھر آؤ۔ سو جاؤ تم بھی! کیوں میری خاطر اپنی میٹھی نیند قربان کرتی ہو۔ میری قسمت میں اب سدا جاگنا ہے جولی!"

میری اتو پیاری روحی" جویریہ پاس آکر پھر صوفہ پر ٹک گئی!۔ یہ صاحب بڑے اچھے لگ رہے ہیں مجھے۔ اور مجھے پختہ یقین ہے کہ تمھارے بہترین ساتھی ثابت ہوں گے۔ تم انھیں اپنے شوہر کے طور پر قبول کر لو۔!"

میری زندگی تماشہ بن کر رہ گئی ہے۔ جولی۔!" روحی نے کہا" زندگی میری ہے مگر اس کے گزارنے کا مجھے حق نہیں!۔ یہ مجھ پر ظلم ہے۔ میں کسی کی خاطر اپنی تمناؤں کا خون نہیں کروں گی۔ تم دیکھ لینا۔ مجھے ہر ستم قبول ہے۔ صرف اسی صورت میں کہ میرے ماں باپ کو اپنے ستم کا تاوان بھگتنا پڑے!"

"کیا مطلب؟" جویریہ چونک کر بولی۔

مجھے سب مشرقی لڑکی کہتے ہیں۔ میں بے زبان بھی ہوں۔ اپنی کسی آرزو یا خواہش کے اظہار کا مجھے حق نہیں ہے۔ میرے سینے میں وہ دل نہیں ہے جو متاثر ہو سکے!۔ میں اپنے دماغ سے کچھ سوچ نہیں سکتی، مجھ پر کسی کی صورت شکل کا اثر نہیں ہوتا

کسی خوبصورت فطرت سے میں متاثر نہیں ہو سکتی! میں چٹان ہوں جولی۔ جو کسی کے نامناسب اور سخت ضرب سے ٹوٹ کر بکھر سکتی ہے۔ تم اب بھی نہیں سمجھیں؟ قسم لے لو!" جویریہ نے پلکیں جھپکائیں۔

میں جان پر کھیل جاؤں گی۔ جویریہ!" روحی نے بہت مضبوط لہجے میں کہا۔

"نہیں!۔ ایسا مت کہو" جویریہ نے حیرت سے اسے دیکھا!" ابھی تمھارا جذبہ نیا ہے۔ تم اتنی شدت سے اسے محسوس کر رہی ہو۔ لیکن روحی۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ ہر احساس ماند پڑتا جاتا ہے۔ تم صرف محبت کی خاطر جان پر کھیل جاؤ گی!۔ یہ انتہا ہے!"

محبت ہی کی خاطر جولی۔! روحی عجیب طرح مسکرائی۔" ورنہ دنیا کی کون سی چیز میرے لیے اتنی اہم اور عزیز ہو سکتی ہے جس کے لیے میں جان دے سکتی ہوں!" وہ دفعتہً اٹھی اور الماری کھولی۔ پھر ایک خفیہ خانے سے ایک تصویر نکال کر جویریہ کے ہاتھ میں تھما دی۔!

"جولی۔! سچ کہنا! کیا یہ چہرہ کبھی بھلایا جا سکتا ہے۔ سچ مانو جویریہ جیسا یہ چہرہ ہے۔ اسی قدر حسین اور پُر تاثیر مسحور کن اس آدمی کی سیرت بھی ہے! تم کہتی ہو کہ وقت محسوسات کو بھلا دیتا ہے۔ یہ ناممکن ہے جولی۔ اگر میں بار بار مروں اور جنم لوں تب بھی اپنی محبت سے دست کش نہیں ہو سکتی!۔ نہ میں شکیل کو کبھی فراموش کر سکتی ہوں!"

شکیل!" جویریہ جو تصویر کو گھور رہی تھی۔ بے ضبط سی ہو کر بڑبڑائی: "سچ کہتی ہو روحی۔ ایسا چہرہ عمر بھر بھلایا نہیں جا سکتا!۔ اُف! کتنا حسین چہرہ ہے میرے دل پر بھی نقش ہوا جا رہا ہے۔ کیسی خوب صورت آنکھیں ہیں۔ سچ مچ تم خوش قسمت ہو کہ تمھیں اتنے وجیہہ و شکیل انسان کی رفاقت و محبت

نصیب ہے۔ مم۔ مگر۔ روحی۔ کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا ہے مجھے۔ جیسے یہ چہرہ میں نے کہیں اور بھی دیکھا ہو ایسا ہی یا اس سے ملتا جلتا۔ یہ آنکھیں۔ یہ آنکھیں۔ اوہ“ وہ اچانک اچھل پڑی۔ ”ٹھیک! اب یاد آیا۔ تم نے کبھی غور کیا، مصطفیٰ صاحب کی آنکھیں ان آنکھوں سے کتنی مشابہ ہیں۔ اور یہ پیشانی۔ ہے نا مشابہت!؟“

”نہیں!“ روکھائی سے روحی نے کہا اور تصویر اس کے ہاتھ سے لے کر اپنے کپڑوں تلے رکھ کر الماری بند کر دی!“ کوئی شخص شکیل سے مشابہ نہیں ہو سکتا! وہ اپنے حسن میں یکتا ہیں! ان کا چہرہ دیکھنے کے بعد میں کسی اور کا چہرہ دیکھتی ہی نہیں۔ مجھے کیا پڑی ہے جو میں خواہ مخواہ ان کی مشابہت تلاش کرتی پھروں!“

سعید صاحب کے گھر میں روز کی سی خاموش صبح نہیں طلوع ہوئی۔ یہ صبح بہت پرشور تھی!۔ نوید اور آمنہ بیگم تیز آواز میں مصروف گفتگو تھے۔ سلمیٰ ملازمہ سے کہہ رہی تھیں کہ ناشتے اور کھانے میں کیا تیار ہو گا!۔ سعید صاحب ریڈیو کے پاس بیٹھے خبریں سن رہے تھے اور مصطفیٰ اور عبید دن بھر کا پروگرام بنا رہے تھے۔ کسی کو خبر نہ تھی کہ ساری رات مصطفیٰ نے برآمدے میں بیٹھے گزار دی تھی!۔ اور صبح ہونے پر چپکے سے اندر آ گئے تھے!۔

گھر بھر میں چہل پہل تھی۔ آوازیں تھیں۔ ہنسی قہقہے تھے۔ مگر ایک پوشیدہ سا تناؤ ماحول میں ایسا تھا کہ وہ ظاہر بھی ہو رہا تھا۔ جیسے سب ہنسنے بولنے خواہ مخواہ آوازیں نکالنے کی منافقت برت رہے ہوں!۔

جویریہ کو نجانے کس چپقلش کا خدشہ تھا وہ پچن میں جا گھسی اور روحی روزمرہ کی طرح کپڑے بدل کر ہاتھ میں فائل لیے باہر نکلی! اکثر متجسس اور مشکوک نظریں اس پر گڑ گئیں!۔ سعید صاحب نے تو ریڈیو بند کر دیا۔

”بس ہو چکی پڑھائی!“ ایک طرف سے آمنہ بیگم کی کڑک آواز سنائی دی۔

"گھر میں مہمان آئے ہیں۔ آج کہاں جارہی تو؟ میں پوچھتی ہوں روحی کہ تم یہ آٹھ دن سے کہاں رہی ہو کہ ۔!"

روحی! اب ہم نے سوچ لیا ہے کہ ۔!" سعید صاحب نے ہاتھ اٹھا کر بیوی کو روکا اور خود بولے "تم نے اتنی تعلیم حاصل کر لی ہے جتنی لڑکیوں کے لیے ضروری ہے۔ تمھارے شوق کو دیکھتے ہوئے ہم نے تمھیں آگے بڑھنے کی اجازت دے رکھی تھی لیکن اب بعض ایسی باتیں سامنے آئی ہیں کہ ہم سمجھتے ہیں! تمھارے لیے مزید تعلیم فائدہ مند نہیں بلکہ نقصان رساں ہے۔ لہٰذا آج سے تم ہرگز یونیورسٹی نہیں جا سکتیں! یہ میرا فیصلہ ہے اور اس میں کسی قسم کی ترمیم کی گنجائش نہیں! سمجھیں!!"

روحی کا سرخ سے سرخ تر ہوتا ہوا چہرہ دیکھ کر مصطفےٰ وہاں سے اٹھ کر بالکونی میں نکل گئے!۔

میں نہیں سمجھی ڈیڈی کہ یہ خواہ مخواہ کی پابندی آپ مجھ پر کیوں عاید کر رہے ہیں روحی نے جیں بجبیں ہو کر کہا "کیا کیا ہے میں نے۔ کون سی حرکت آپ نے میری ایسی دیکھی ہے۔ جس سے میری تعلیم بدنام ہو رہی ہے۔ دراصل آپ نے مجھ پر بھروسہ کرنا چھوڑ دیا ہے۔ ڈیڈی! یہ بھی میرا اٹل ارادہ ہے کہ میں کسی بھی طرح ایم۔ اے ضرور کروں گی!!"

بس بیٹھو جا کے اندر!" آمنہ بیگم نے تلخ لہجے میں کہا "یہ اتنی دھاندلی منحوس تعلیم نے سکھائی ہے کہ باپ سے زبان لڑا رہی ہو۔ آج تک کبھی انھیں پلٹ کے جواب نہ دیا تھا!۔

بھابی اور بھائی جان آپ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ "میں نے منع کیا تھا کہ اس قسم کی کوئی ناگوار گفتگو اس سے نہ کیجئے گا!" نوید نے ناخوشگوار لہجے میں کہا پھر روحی کے پاس آگئے۔ وہ اب رونے لگی تھی۔ آمنہ بیگم کے الفاظ نے اسے بہت

صدمہ پہونچایا تھا۔ وہ تو اس کی بہت چاہنے والی ماں تھیں۔ اس نے جس طرح آنسو بھری آنکھوں سے نوید کو دیکھا تھا وہ انداز انھیں بے چین کر گیا۔ انھوں نے اپنے ہاتھ سے اس کے آنسو پونچھے اور اسے سینے سے لگا لیا پھر مہربان لہجے میں بولے "بیٹی تم ضرور ایم اے کرو گی! پریشان مت ہو۔ روحی بیٹی۔ کچھ غلط فہمی بھائی صاحب اور بھابھی کو ہو گئی ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ وہ جلد از جلد دور ہو جائے پھر تم بدستور پڑھنے جایا کرنا۔ کوئی تم کو روکے گا نہیں بیٹی۔ مگر میرے کہنے سے اتنا مان جاؤ کہ صرف چار چھ روز اور نہ جاؤ۔ دیکھو تم تو مجھے اتنا چاہتی ہو۔ کیا میری بات بھی نہ مانو گی!"

وہ منھ سے کچھ نہ بولی۔ مگر سر جھکا کر آنسو اپنی ہتھیلیوں میں سمیٹے اور مڑ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی! نوید اپنے ہونٹ دانتوں میں دابے وہیں کھڑے رہے!

"اب نرمی سے کام نہ چلے گا!" سعید صاحب نے برہم ہو کر کہا۔

ہم نے نجانے کیا سوچا تھا۔ ہوا کیا!" آمنہ بیگم بولیں۔

"باجی کیوں نہ اس سے نرمی اور محبت سے پوچھا جائے کہ آخر وہ چاہتی کیا ہے؟" سلمیٰ نے کہا "نوجوان لڑکی پر زبردستی نہیں کی جا سکتی باجی۔ زمانہ باغی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جھکنا آپ ہی کو پڑے!"

سعید صاحب اور آمنہ بیگم کی نسبت نوید و سلمیٰ پھر بھی نیک دل، صلح پسند اور محبت کرنے والے لوگ تھے! وہ ایکسا دار اور کاری دار پر یقین نہیں رکھتے تھے!

چنانچہ ان کی بات سن کر سعید صاحب نے خشک لہجے میں کہا "ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے! تمھارا مشورہ یہی! پوچھ لو جا کے اس کی مرضی کیا ہے۔ لیکن اس کی مرضی پوچھنے کے بعد یہ مت سمجھ لینا کہ وہی مرضی میری بھی ہو گی!"

"بھائی جان ایسا دو ٹوک فیصلہ نہ کیجیے!" نوید بولے "میں نہیں سمجھ سکتا کہ آپ

کو اس قدر غصّہ کیوں آ رہا ہے۔ یہ تو انسانی نیچر ہے۔ دنیا کے سارے انسان اپنے الگ الگ دل و دماغ لے کر پیدا ہوئے ہیں۔ کیا ضروری ہے کہ سب کی سوچ اور فکر وہی ہو جو آپ کی ہے!۔

نوید! تم اسے دلیر کر رہے ہو!" سعید صاحب نے انھیں گھورا۔ "میں بات کو مزید بگڑنے سے بچانا چاہتا ہوں!" نوید بڑے بھائی کی تلخ ترین بات کو شربت کے گھونٹ کی طرح پی گئے! انھیں روحی سے سچ مچ محبت تھی اور وہ اس کی آرزو میں حق بجانب بھی سمجھ رہے تھے!۔

میری رائے بھی یہی ہے بھائی جان!" سلمیٰ نے ناشتے کی میز سجاتے ہوئے سعید صاحب سے کہا: آپ ابھی کمشنر صاحب اور ان کی بیگم کو مت بلائیے بات پختہ ہو جائے گی۔ پھنس جائے گی! کیا حرج ہے کہ ہم ایک نظر اس لڑکے کو پہلے دیکھ لیں! اگر وہ سچ مچ اس قابل ہے تو یہی سہی۔ روحی جو چاہتی ہے۔ وہ کر دیں۔ ناپسندیدہ شادیاں کبھی کامیاب نہیں ہوئیں! روحی آجکل کے زمانے کی ہے لیکن بے زبان ہے۔ اس کی بے زبانی سے فائدہ اٹھانا مجھے تو گوارہ نہیں!"

آمنہ بیگم تائید طلب انداز میں سعید صاحب کو دیکھنے لگیں اور سوچنے لگیں کہ خدا ہی ہے جو یہ مانیں۔ اپنی ہٹ پر آجاتے ہیں تو پھر ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے۔ نہیں مانتے! ویسے دل ان کا بھی چاہ رہا تھا کہ روحی پر بے جا سختی نہ کی جائے!۔ وہ اپنی تنبیہہ میں اتنی سخت نہ تھیں ان کا دل ماں کا دل تھا!۔

روحی اپنے کمرے میں آئی اور اپنے پسندیدہ دریچے میں آ بیٹھی۔ اسے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا جیسے زمین آسمان اپنے نہ رہے ہوں۔ ماں باپ بدل گئے ہوں۔ وہ غیروں کے نرغے میں گھری ہوا درد دل سننے والا عنقا ہو

گیا ہو۔! یہ ماحول، یہ فضا، یہ لوگ سب یک لخت اجنبی بن گئے تھے!۔ وہ ماؤف ہوتے ہوئے دماغ سے کچھ سوچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن سوچ نہ سکی!۔ اس کی آنکھوں میں رنگ برنگی لہریئے تلملا رہے تھے۔ اس کے ڈوبتے ہوئے دل میں بس ایک زہریلا اندیشہ کلبلا رہا تھا۔ کھنکھجورے کی مانند۔ اب وہ زندگی بھر شکیل سے نہ مل سکے گی۔ اسے دیکھ نہ سکے گی!۔ ہو سکتا ہے کہ یہ مفارقت دائمی ہو جائے! اس نے چکراتا ہوا سر تھام لیا!

پچھلے کل اسی وقت تک وہ کتنی خوش تھی۔ ناظمہ بیگم کی بصارت واپس آئی تھی اور وہ بھی اتنی خوش تھیں کہ بیک وقت ہنس رہی تھیں اور رونے بھی لگی تھیں۔ اس طرح ایک ایک شئے پر ان کی نظریں بھٹک رہی تھیں کہ جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہوں!۔ اس وقت روحی کو یوں لگ رہا تھا کہ جیسے ایک طویل مدت کے بعد خود اسے آنکھیں ملی ہوں!۔ وہ سب کے ساتھ شکیل کے گھر پہونچی تھی!۔ راستے بھر شکیل اپنی امی سے یہی بات بار بار کہتا رہا تھا!"

"امی یہ ساری برکت روحی کے وجود کی ہے نا۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ زندگی میں کبھی میں اتنا خوش ہوا ہوں۔ آج مجھے کوئی دفینہ مل جاتا تب بھی میں اتنا خوش نہ ہوتا۔ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں مجھے اپنی نظر نہ لگ جائے!"

"سچ ہے بیٹا۔ یہ روحی کی سی پیاری بچی کے قدم کی برکت ہے۔" ناظمہ بیگم نے ایک جھلک بھر روحی کی دیکھی تھی اور بس اس کے چہرے کے بوسے لیے تھے۔ وہ انھیں اتنی پیاری لگی تھی!۔

گھر پہونچنے کے بعد بھی کامیاب آپریشن کا تذکرہ ہوتا رہا تھا۔ اور ناظمہ بیگم اپنے نادیدہ چشمے سے بار بار روحی کو دیکھے جا رہی تھیں۔ وہ بھی بہت خوش تھیں!۔ ایک نو بیدے محروم آدمی کی طرح وہ بولی تھیں۔

"پندرہ سال بیت چکے۔ میں گرہستی سے الگ ہوں۔ نہ ڈھنگ سے کچھ پکایا ہو نہ گھر کی صفائی ہی کی ہے۔ جانے کون سی چیز کہاں پڑی ہے کہ اب تو مجھے یاد بھی نہیں بس خزانہ کارخانہ تھا! اب اللہ چاہے گا۔ سب درست کر دوں گی۔" وہ لمبے لمبے پروگرام بنا رہی تھیں۔ پھر وہاں سفینہ بھی آ گئی تھی۔ اس نے جب سُنا کہ ناظمہ بیگم دیکھنے لگی ہیں۔ تب وہ ناچنے لگی۔ شکیل نے مٹھائی منگوائی تھی۔" اور وہ سب بڑے خوش خوش بیٹھے ہنس بول رہے تھے۔ ناظمہ بیگم کی آنکھوں پر موٹے تاریک شیشے تھے وہ نسبتہً اندھیرے میں بیٹھی تھیں۔ ان سب گفتگو میں حصہ لے رہی تھیں۔ آج ان کی آواز میں مردنی اور مایوسی کا نہ تھی!۔

روحی نے دریچے کے پٹ سے سر ٹیک سا دیا۔ اور سوچنے لگی کہ ان لوگوں نے آج صبح بھی اس کا انتظار کیا ہوگا!۔ وہ ان سے وعدہ کر آئی تھی! کیا سوچا ہوگا۔؟

اور یہ حقیقت تھی کہ ناظمہ بیگم، شکیل اور سفینہ تک اس کی منتظر تھی۔ شکیل رہ رہ کے دروازے تک جاتا اور مایوس سا واپس آ جاتا۔ ہر آہٹ پر ناظمہ بیگم چونک کر دالان کی طرف تکنے لگتیں۔ شکیل مضطرب سا باہر دیوان خانے میں جا بیٹھا اور دروازہ کھول دیا۔ اب اس کے سامنے سڑک اپنی آخری حد تک دکھائی دے رہی تھی۔ جس پر روز کا سا ٹریفک تھا! ہر سواری اس کے دروازے کے سامنے سے گزر رہی تھی لیکن وہ سواری جو اس کے دروازے پر رک جاتی۔ وہ ابھی تک نہ آئی تھی!

متعدد اندیشے اسے پریشان کر رہے تھے! روحی نے اس سے اس قسم کی بات کی تھی کہ اس کے والدین اس کے مستقبل کے لیے کوشاں ہیں اور ایک میجر کا پرپوزل بالکل طے شدہ ہی ہے۔ تو کیا اچانک ان لوگوں نے روحی کی تقدیر کا فیصلہ کر دیا تھا کیا اسے پابند کر دیا گیا تھا روحی نے اس پورے عرصے میں کبھی وعدہ خلافی نہ کی تھی! اس نے اس کی الفت میں اپنی ضروری تعلیم تک کو پس پشت ڈال رکھا تھا!۔ مگر شکیل

حسن کا دارو مدار بھی اگلی ڈگری پر تھا۔ وہ بھی روحی کی محبت کے نشے میں ایسا سرشار تھا کہ اسے بھی ڈگری کی پرواہ نہ رہی تھی۔ وہ مرد تھا اسے اپنے بازوؤں پر بھروسہ تھا۔ وہ بہت کچھ کرنے کی طاقت رکھتا تھا۔ لیکن روحی کی اتنی سی غیر حاضری اس کے آہنی اعصاب اور پختہ قوت فیصلہ کو بڑی حد تک کمزور کر رہی تھی!۔ اسے اپنا دل ڈوبتا لگ رہا تھا۔ کیا ہوگا اس کا حشر۔ اگر روحی نہ مل سکی۔ اس نے خود کا جائزہ لیا۔ نہیں! اس نے چپکے سے نفی میں سر ہلایا۔

"تب میں زندہ نہ رہ سکوں گا!"

دن آہستہ آہستہ چڑھتا گیا پھر دوپہر ڈھلی اور شام کے سائے طویل ہو گئے!۔ روحی کا اب بھی کہیں پتہ نہ تھا!۔

"شکیل!" ناظمہ بیگم کی آواز میں دنیا بھر کی مایوسی اور بے صد درد تھا۔

"جی!" وہ اداس سا ان کے پاس آ بیٹھا۔

"روحی نہیں آئی بیٹا!۔"

"معلوم نہیں امی۔ میں بھی پریشان ہوں۔ اس نے تو آج آنے کا وعدہ کیا تھا وہ خوش بھی بہت تھی۔ آج ضرور آتی۔ اگر کسی ناگہانی افتاد اس پر نہ پڑی ہوتی۔"

"خدا اسے اپنی حفاظت میں رکھے۔ ناگہانی افتاد کیا؟"

"اس کے والدین نہیں جانتے کہ روحی ہم میں کتنی گھل مل گئی ہے اسے ہم سے کتنی محبت ہے۔ وہ ناواقف ہیں نا امی۔ اس لیے میں سوچتا ہوں کہ کہیں۔!" اور اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ ناظمہ بیگم بھی گہری سوچ میں غرق ہو گئیں!!

عبید نے سوچا تھا کہ بہت دنوں بعد وہ ماں باپ اور بہن کے پاس واپس آیا ہے۔ اب سب کے ساتھ خوب گھومے پھرے گا! مصطفےٰ کو یہاں دیکھ کر اسکی مسرتوں کا ٹھکانہ نہ رہا تھا۔ وہ ایک جہاز سے آدمی تھے۔ آج یہاں کل وہاں۔ اپنی فوجی زندگی میں وہ جانے کہاں کہاں گھومے پھرے تھے اور انھیں خانہ بدوشی ہی کی زندگی پسند بھی تھی۔ بہت پہلے انھوں نے عبید کو دل کھول کر تفریحیں کرادی تھیں۔ وہ ان کا بڑا دوست تھا! ان ہی سے جمسار رہتا۔ اب بھی وہ یہی سب کچھ چاہ رہا تھا۔ تفریح سیر پارٹی، ہنسی مذاق۔ مگر ابکی اس نے گھر کا ماحول عجیب سا کبیدہ دیکھا۔ اور اس کی سمجھ میں اپنی باجی کا رویہ بھی نہ آتا! کیا ہوگیا تھا انھیں۔ یہ خاموش احتجاج کس لیے تھا۔ یہ بے زبان فریاد کیوں تھی۔ یہ تیرہ تنہائی انھوں نے کیوں اختیار کرلی تھی!

تفریحیں ایک طرف رہیں وہ سب تو گھر ہی کے اندر ہنسنے بولنے سے احتراز کر رہے تھے ایک دفعہ اس کی ضد سے مجبور ہو کر مصطفےٰ نے کہیں پکنک کا پروگرام بنایا بھی تھا اور کسی نعلوت کے تحت سبھی افراد اس پر تیار بھی ہوگئے تھے۔ لیکن روحی نے صاف انکار کردیا۔

عبید خوشامدیں کرکے رہ گیا ایسا ہوگیا!۔

سلمیٰ نے اصرار کیا۔ حتیٰ کہ آمنہ بیگم نے بھی کہا تھا لیکن روحی نہ مانی۔ اس نے بڑی ڈھٹائی سے کہا۔

"میری کیا ضرورت ہے۔ کیا میرے بغیر پکنک نہیں ہوسکتی!۔ مجھے مجبور نہ کیجئے

یرا جی نہیں چاہ رہا!"
جویریہ نے ہاتھ پاؤں جوڑے۔ لیکن اس کی ایک نہیں۔ ہرگز ہاں سے نہ بدلی۔ پروگرام دھرا رہ گیا!۔
پھر لدجی کا دیوانگی کا شور بڑھ گیا۔ خاموشی کا شور۔ اس کے لبوں پر تالے لگ گئے!۔ اب وہ اپنے دماغ سے باتیں کرتی رہتی تھی۔ اور جب سوال جواب کرتے کرتے تھک جاتی۔ اندیشوں کی تردید کرتے کرتے نڈھال ہو جاتی۔ اپنی محبت کو یاد کرتی اور روتے روتے نیم جان ہو جاتی تو خاموش ہو جاتی!۔
اب وہ اپنے کمرے سے کم نکلتی تھی۔ سب کے ساتھ طعام خانے میں کھانا کھانے بھی نہ جاتی!۔ نہ اسے ماں باپ سے اُنسیت رہا تھا نہ بھائی کی محبت کی گرمی ہی باقی رہی تھی۔ نہ اسے اپنے مہمانوں سے دلچسپی تھی!۔ حتیٰ کہ اسے خود اپنی ذات سے بھی کوئی محبت باقی نہ رہ گئی تھی!" وہ اپنے دریچے میں بیٹھی رہتی!۔ اور پہروں سوچے جاتی! مسلسل سوچے جاتی! یا پھر تنہائیوں کی ساتھی وہ بیاض تھی۔ جو اسے جان سے زیادہ عزیز تھی!۔ بیاض اس کی آغوش میں کھلی رہتی!۔ اور وہ یک ٹک اسے دیکھے جاتی۔
اس میں آخر ہے کیا؟" جویریہ اس کا غم بٹانے سے باز نہ آتی تھی کیونکہ وہ اس کے درد سے بخوبی واقف تھی اسے اس پر ترس آتا تھا۔ آخر لدجی کو اپنی مرضی سے جینے کا حق کیوں نہیں دیا جاتا؟ ماں باپ اس کی خیر خواہی کیوں چاہتے ہیں۔ جبکہ وہ اس کے حق میں بدترین بدخواہی کی جا رہی ہے لیکن جویریہ کی سمجھ میں بڑوں کی مرضی و مصلحت آتی نہ تھی!۔
جویریہ نے ڈرتے ڈرتے اس کی گود سے بیاض لے لی۔ یوں وہ کسی کو بیاض میں ہاتھ نہ لگانے دیتی تھی۔ لیکن اب خالی خالی نظروں سے

جویریہ کو دیکھنے لگی۔ کچھ نہ بولا۔ جویریہ نے ورق الٹے۔ اور یونہی سرسری سی نظر یہاں وہاں دوڑائیں۔ پھر وہ سنبھل کر دلچسپی سے پڑھنے لگی! ایک سے عجیب اور حسین ترین اشعار اور مصرعے اس میں درج تھے۔

تو تو عنوان ہے میری زیست کے افسانے کا

مری رائیگاں زندگی کا یہاں نہ مقصد نہ مصرف نہ منشا کوئی

چاند کا زرد مرمریں بجرہ

قلزمِ نیلگوں میں ڈوب گیا

رات بھیگی گریز پا لمحے

منزلِ نور کو روانہ ہوئے

سیج سونی ہے خواب گہہ تنہا

وائے شب تار اے دلِ رسوا

کس کو نہیں کوتاہئی قسمت کی شکایت کس کو گلہ گردشِ ایام نہیں ہے

دنیا میں کون آدمی سکھی ہے۔ ہر کوئی اپنی تمناؤں کے مصلوب جگر گوشوں کو اپنے سینے سے لگائے پھرتا ہے

غم کی زیادہ آؤ بھگت نہ کرو

مایوسی مذہبِ دلِ زندہ میں کفر ہے۔

گوتم بدھ کسی مسرور آدمی کو دیکھنے کی حسرت ہی میں گھلتا رہا

چہرے سے متانت مترشح ہے مگر

باطن میں ہے آتشکدۂ عشق و جنوں

خمارِ لذتِ ماضی ہے سرخوشی کیا ہے

نشاطِ رفتہ کا ماتم ہے زندگی کیا ہے

راستہ پھولوں کا

جب سے دیکھا ہے تجھے اُڑ گئی نیند آنکھوں سے

قدرت نجانے اہل دل کا کیوں مسلسل امتحان لیتی رہتی ہے

میرا پیمان جواں میری وفا زندہ ہے

مجبور کا جینا بھی ہے کوئی جینا

تو میرے خندۂ مسرور و مطمئن پہ نہ جا
اک آرزو مرے پہلو میں سوگوار بھی ہے

صدا دیتا ہے بے آواز غم بھی
کہ خاموشی بھی آہنگ و نوا ہے

خوبصورت چاند کا دیوانہ چکور

نہ رات رات ہے میرے لیے نہ دن دن ہے
سکون قلب ہے اک بھاگتا ہوا سایہ
تھی اجنبی جو بظاہر وہ محرمانہ نظر
بغیر کچھ کہے سب حال کہہ گئی دل کا
مری غذا تری یادیں مری شراب آنسو
فغاں ہے میری غزل مرثیہ مرا نغمہ
ہے داستان مری ایک لمبی گہری آہ
بنے گا کتبہ مری قبر کا شہید وفا
برہ کی آگ میں جلتی ہوں کل نہیں پڑتی
غم فراق نے صبر و قرار لوٹ لیا
اب اشک و آہ مری زندگی کے ساتھی ہیں
ہے سوتے جاگتے ماتم نشاط رفتہ کا

خوشی حرام ہوئی مجھ پہ تیرے جانے کے بعد

قرار پھر نہ دلِ بے قرار کو آیا

دل اختیار سے باہر نگاہ بے قابو

نہیں ہے کھیل چھپانا کشش دل کا

میں چھپاتا ہوں مگر آنکھوں سے

مری رازِ دیدہ محبت ہے عیاں

یوں ہی بہتا آیا ہے دھارا سمے کا

یہ دنیا سدا سے یوں ہی غم زدہ ہے

خوں بہا کیا شکست پیماں کا — زخم دل کا حساب کس سے لوں

کیا کبھی سچ بھی نکلے ہیں ملن کے سپنے

سراپا فغاں ہے مری زندگی — تری یاد میں کس قدر تھک گئی ہوں

جز دیدۂ پرنم کوئی محرم نہ ملا

بیاض شروع سے آخر تک ایسے ہی موثر و مسحور کن اشعار، مصرعوں اور اقوال سے بھری ہوئی تھی! ۔ جویریہ نے صرف چند چیزیں پڑھیں اور اسے واپس کر دی۔

اچھے لگے؟" روحی نے پوچھا۔

بہت اچھے!"

جس نے انہیں انتخاب کیا؟

اس کا بھی جواب نہیں!"

جولی؟" روحی نے آواز میں آنسوؤں کو ڈبو کر مدھم لہجے میں کہا۔ جویریہ مستفسرانہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی!۔

جولی! میں مرتے دم تک تمہاری احسان مند رہوں گی!" روحی بولی۔ اگر

تم کسی طرح مجھے ایک دفعہ باہر جانے کی اجازت لے دو!۔ صرف ایک دفعہ! بس پھر۔ میں کبھی کوئی التجا کسی سے نہ کروں گی!۔

کیوں روحی؟ صرف ایک دفعہ!"

ہاں۔ جویریہ! میں شکیل صاحب سے کہہ آؤں اب وہ مجھ سے کوئی امید نہ لگائیں۔ بھول جائیں مجھے۔! اگر میں نے انھیں نا امیدی کا مژدہ نہ سنا دیا تو وہ مجھے بے وفا سنگدل کہیں گے، شاید وہ ناکامی کا انتقام اپنی ذات سے لیں۔ میری وجہ سے ان کا مستقبل کیوں برباد ہو۔ جونی۔ وہ اپنی مختصر سی مدت حیات میں ایک بار کے آئے باد سموم کے جھونکے کو بھول جائیں اور گلستان زندگی کی بہاروں میں حصہ بٹانے کہیں آگے چل دیں! بس یہی مژدہ سنانا ہے انھیں!"

مژدہ؟" جویریہ نے کہا۔ "یہ تو ان کے حق میں پیغام مرگ ہوگا۔ تم اسے مژدہ کہہ رہی ہو!۔

روحی ہنس دی۔ جویریہ کو اندازہ لگانے میں دیر نہ تھی کہ اس ہنسی میں زہر کی تلخی، حالات کا کتنا طنز، اپنی آرزوؤں کی محرومی کا کتنا شدید اثر گھلا ملا تھا۔ پھر اس نے زانوؤں میں سر دے لیا اور چپ ہو گئی!۔

نوید نے اپنے بڑے بھائی صاحب کو مخلصانہ مشورہ دیا تھا کہ ایک بار صرف مقابلہ و موازنے کی غرض سے کہ مصطفیٰ اور شکیل میں برتری کسے حاصل ہے۔ شکیل کو گھر پر بلایا جائے۔ اسے پہلے ہی اس غرض سے طلب کیا گیا تھا مگر تب بات بن نہ سکی تھی!۔ لہٰذا اب ایک بار پھر سہی! سعید صاحب کچھ جھنجھلائے سے رہنے لگے تھے انھیں یہ امید نہ تھی کہ نوید ان کی ہمنوائی کرنے کی بجائے ان کی بیٹی کی حماقتوں کی تائید کرنے لگیں گے!۔ بہر حال انھوں نے اپنی رائے دی اور بولے: "خیر! تمھاری یہی مرضی ہے تو یہی سہی! پہلے شکیل صاحب ہی کو

زحمت دی جائے گی بعد کو میں کلکٹر صاحب سے گفت و شنید کروں گا!"

"سنجیدگی اور صلاحیت سے ایک فیصلے پر پہونچنا بہت ضروری ہے!" نوید نے کہا کہ آپ کو آج کل غصہ بہت آنے لگا ہے۔ اور بھائی جان۔ غصہ بنتے ہوئے کام بگاڑ دیتا ہے۔ یہ تو سوچیے کہ روحی آپ کی ناز پروردہ ایک بچی ہے۔ آپ نے ہمیشہ اس کی مرضی اور پسند اپنی مرضی پر مقدم رکھی ہے۔ اب آپ اسے اپنے یکطرفہ فیصلے پر بھینٹ چڑھانا چاہتے ہیں۔ کیا یہ اقدام آپ کا مناسب ہے؟"

"یہ بھی تو دیکھو کہ وہ میرے مقابلہ پر ڈٹ گئی ہے!" سعید صاحب کی فطرت پوری طرح اجاگر ہو گئی۔ اب وہ غیظ و غضب کا پیکر نظر آر ہے تھے۔ چہرہ سرخ، آنکھیں لال، ہونٹ کانپتے ہوئے!" اور بھس لیے۔ ایک بے غیرت بے حیا آرزو کی خاطر کتنی نامناسب، کس قدر شرمناک بات ہے۔! لاحول ولاقوۃ۔ کیا میں نے کبھی ایسا سوچا بھی تھا۔ کہ۔ کہ۔ !"

بھائی جان! سلمیٰ نے دبی زبان سے کہا: کیا اس نے کوئی غیرانسانی حرکت کی ہے؟ انھیں مرضی نامرضی واضح کرنے کا حق تو اسے مذہب نے بھی دیا ہے!۔ اور آپ یہ دیکھیے کہ۔ !"

کیا دیکھوں۔؟" سعید صاحب کی گرجدار آواز اور بھاری ہو گئی: "تم لوگ کل کے بچے۔ مجھے سبق پڑھانے چلے ہو۔ مذہب کی باتیں سکھاتے ہو۔ میں خود کچھ بھی نہیں جانتا! مجھے بس یہی کرنا چاہیے کہ اگر میری لڑکی کسی غیر قوم کے بھنگی موچی، چمار کو پسند کر لے!۔ اور میں اس کی پسند و رائے پر سر جھکا دوں گا کہ اُسے مذہب نے اپنی مرضی کے پورا کرنے کا اختیار دیا ہے!۔ کیوں۔ تمھارا یہی مطلب ہے؟"

جی نہیں آپ سمجھے نہیں! میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ اسے صلاحیت، نرمی اور پیار سے سمجھایا جائے۔ آخر تعلیم یافتہ سمجھدار شریف بچی ہے۔ سمجھ جائے گی۔ کیا

اسے خاندان اور معاشرے کی انگشت نمائی اور اپنی عزت و نسائی وقار کا خیال نہ ہو
گا!" نوید نے کہا۔

"بھائی جان۔ مخلوط تعلیم کی یہی برکت ہے کہ ناپختہ مغز بچے بچیاں اس قسم کی
دلچسپیاں تلاش کر لیتے ہیں۔" سلمیٰ نے ہنس کر کہا۔ "لیکن ہوتا یہ ہے کہ ان کی دوسری
جگہ شادیاں ہو جاتی ہیں اور آگے چل کر وہ خود اپنی حماقتوں پر ہنستے ہیں۔ آپ اس
مسئلہ کو اتنی سنجیدگی سے نہ لیجئے! سب ٹھیک ہو جائے گا!"

"خدا کرے کہ تمہارا یہی خیال ٹھیک ہو" سعید صاحب نے شکست خوردہ سے
لہجے میں کہا۔ "میرا تو حال یہ ہے کہ۔ مجھ سے اس درمیان کچھ اصحاب نے اور بھی
کہا تھا کہ روحی کو انھوں نے یہاں وہاں ایک صاحبزادے کے ساتھ دیکھا ہے
میں تو عرق عرق ہو گیا۔!"

اور پھر بھی آپ نے اس کا کچھ تدارک نہ کیا۔!" اچانک آمنہ بیگم بولیں
اور بس جیسے بارود کے ڈھیر میں کسی نے آگ دکھا دی۔ سعید صاحب پھٹ
پڑے۔ نہ صرف ان کے دل و دماغ کے پرخچے اڑے تھے بلکہ انھوں نے آمنہ بیگم
کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیں۔ شاید اپنی ازدواجی زندگی کے پچیس برسوں میں
پہلی بار وہ اس طرح بیوی پر خفا ہوئے تھے۔ ان کی ناقص تربیت، بدسلیقہ پن
غفلت اور جانے کن کن خرابیوں کی نشاندہی کر کے روحی کی آزاد روی کی
ساری ذمہ داری بیوی پر رکھ دی۔ حد یہ کہ انھیں رلا کر چھوڑا۔ پھر خود نیم بیہوش
سے تخت پر گر پڑے!

یہ ساری تباہ کن جنگ زرگرسی روحی بھی دیکھ رہی تھی۔ اپنی ذات سے اٹھتے
یہ طوفان اسے حواس باختہ کر رہے تھے۔ اور وہ خود بیہوش سی ہو رہی تھی۔ اپنا
جرم الفت اسے ایک گناہ کبیرہ لگ رہا تھا! اور وہ سمجھ رہی تھی کہ اس کا کفارہ

جان دے کر ادا کیا جا سکتا ہے۔

سعید صاحب کے باہر چلے جانے کے بعد آمنہ بیگم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ اور نوید و سلمیٰ انھیں منانے سمجھانے میں لگ گئے!۔

نوید نے یہ کہہ کر ان کے آنسوؤں کی روانی روک دی: "خدا کے واسطے بھابی۔ یہ کیا کر رہی ہیں۔ ابھی مصطفیٰ اور عبید آتے ہوں گے۔ کیا روحی کے مسئلے کو آپ لوگ تماشہ بنانا چاہتے ہیں!۔

میں چلی جاؤں گی ماموں میاں کے ہاں" وہ سسک کر بولیں: "مجھ سے اب کوئی مطلب نہیں۔ گھر بار ان کا۔ اولاد ان کی۔ وہ جانیں ان کی بیٹی جانے!"

نوید کو ہنسی آ گئی!۔

رات کو سعید صاحب کھانے پر سب سے ملے۔ اب وہ نارمل تھے۔ انھوں نے کھانے کے بعد سلمیٰ سے کہا:

"تمھارا مشورہ مناسب تھا! میں نے آدمی بھیج کر انگریزی لٹریچر کے ڈین صاحب سے گزارش کر دی ہے کہ کل صبح گیارہ بجے اپنے ہونہار شاگرد شکیل صاحب کو غریب خانے پر بھجوا دیں۔ کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ انھوں نے وعدہ کر لیا ہے۔" انھوں نے گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ پھر پانی پی کر بات ختم کی: "کل وہ آ جائے گا! لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ اس کی نہیں بلکہ اپنی شان کے مطابق اس کی ضیافت کا سامان کیا جائے!" سعید صاحب کے لہجے سے حقارت برس رہی تھی۔ حالانکہ وہ امارت و غربت کے اعتبارات کو نہایت جہل اور سطحی سمجھتے تھے۔ لیکن اب خدا جانے کیوں ان کے خیالات میں انقلاب آ گیا تھا۔ یا پھر وہ مصطفیٰ پر شکیل کی ترجیح یا روحی سے ضد کی بنا پر اتنے سخت گیر بن گئے تھے!۔

آپ فکر نہ کیجیے!" سلمیٰ نے کہا۔ اس لڑکے کے شایان شان نہیں بلکہ آپ کی

پوزیشن کے مطابق ضیافت کا انتظام ہو جائے گا!"

سعید صاحب نے انھیں گھورا تھا۔ اور نوید نے بھی کھانس کر بیوی کو تنبیہ کی!۔

جب اسی وقت سے بڑا ڈرائنگ روم سنوارا جانے لگا اور بڑے پیمانے پر اس کا ڈیکوریشن شروع ہو گیا تو آمنہ بیگم کو یوں لگا جیسے ان کی ضدی اور خود سر بیٹی کی تقدیر پر مہر لگ گئی ہو۔ وہ سب سے چھپا کر بہت دنوں کے بعد روحی کے کمرے میں آئی تھیں!۔ روحی ایک کرسی پر بیٹھی کچھ لکھ رہی تھی!۔ اس نے ماں کو دیکھ کر کاغذ مروڑ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا اور اجنبی نظروں سے انھیں دیکھنے لگی!۔

بہر حال یہ بھی تھی وہ انھیں دیکھ کر چپکے سے اٹھی اور کمرے سے نکل کر چلی گئی آمنہ بیگم تھکی تھکی سانسیں لیتی پلنگ پر ٹک گئیں!۔ اور چونکہ ان کا دل بھرا آ رہا تھا لہٰذا وہ زور زور سے رونے بھی لگیں!۔ روحی نے اپنے والدین کی ساری جھڑپ سنی تھی! لہٰذا ماں کا نالہ و بکا اسے غیر قدرتی نہ لگا اس نے سوچا کہ ٹھیک ہے۔ دل کے غبار کا دھل جانا ہی اچھا ہے۔ لیکن اس کے سنگدلانہ سلوک کا اثر آمنہ بیگم پر جو باقی ہوا۔ انھوں نے ایک پر درد آہ بھری تھی۔ پھر آنسو پونچھے اور بولیں۔

"بیٹی تم نے اپنی یہ کیا حالت بنائی ہے۔ کب سے کمرہ سے باہر نہیں نکلیں۔ اتنی دور سے بھائی آیا ہے۔ تم اس سے بھی ہنستی بولتی نہیں۔ بڑا اداس اور مغموم پھرا کرتا ہے۔ بیٹی سنو! تم نے ہم سب کو اپنا دشمن اور مخالف سمجھ رکھا ہے۔ یہ تمھاری ناسمجھی اور نادانی ہے۔ میری بچی کیا ماں باپ بھی کبھی اولاد کے دشمن ہوتے ہیں تم ایک جانور پالتی ہو۔ اس کے کھانے پینے اس کے راحت و آرام کا اتنا خیال رکھتی ہو۔ اسے کوئی تکلیف ہوتی ہے تو تمھارا دل تڑپ اٹھتا ہے۔ پھر بیٹی تم تو ہماری اپنی اولاد ہو۔ کیا ہم تمھاری راحت و آرام سے غافل ہو سکتے ہیں!۔ تمھاری کسی خوشی کو اپنی خوشی اور مرضی پر مقدم سمجھنا ہی ہماری زندگی کا واحد مقصد

ہے روحی۔ ہم تمہارے ہی لیے تو جی رہے ہیں!۔ یہ تمہارے باپ کی محنت و مشقت یہ ساری جمع جوڑ، یہ گھر بار، میری ساری خدمت، یہ سب کس کے لیے ہے میری بچی!۔ صرف تمہی لوگوں کی بہتری کے لیے!۔ اتنا تم نہیں سوچتیں!۔ تم بجائے ہم سب سے کیوں خفا ہو؟۔ بیٹی ذرا انصاف سے سوچو کہ انسان معاشرے میں سب سے بے تعلق ہو کر نہیں جی سکتا!۔ اسے سب کے درمیان رہنا پڑتا ہے اور اپنی حیثیت کے مطابق شان سے رہنا پڑتا ہے۔ انسان کو عزت، وقار، نیکنامی، شرافت اور تہذیب و تعلیم اسے صحیح معنوں میں انسانیت کی تصویر بناتی ہیں۔ جینے کو تو بدمعاش، چور، ڈاکو خونی اور قاتل بھی جی لیتے ہیں۔ لیکن کیا کسی کی نگاہوں میں ان کی کچھ عزت و وقعت بھی ہوتی ہے۔ وہ سب کی لعنتوں کے مستحق ہوتے ہیں!۔ ان کے برخلاف، شریف تہذیب یافتہ، نیک نام انسانوں کی ہر جگہ عزت ہوتی ہے۔ لوگ انہیں سر آنکھوں پر جگہ دیتے ہیں۔ اور بیٹی۔ اب یہ کہنے کی بات نہیں کہ زمانے میں ہمیشہ مرد اور عورت کی پوزیشن مختلف ہوا کرتی ہے۔ مرد اگر کچھ کرتا بھی ہے تو اس کے عیب اس کی مردانگی ڈھانک لیتی ہے۔ لیکن عورت کی عزت و آبرو موتی کی آب، کانچ کے آبگینے کی مانند ہوتی ہے۔ اگر کسی آئینے پر ذرک پڑ جائے تو پھر اس کی قیمت کچھ بھی نہیں رہتی!۔ عورت ہمیشہ آبرو کے نازک اور خطرناک پل صراط پر چلتی ہے بیٹی۔ اسے معاشرے میں پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ روحی تم سمجھدار ہو۔ تم نے تعلیم حاصل کی ہے۔ تم اپنا بھلا برا سمجھتی ہو!۔ تم خود غور کرو کہ اپنی کسی نادانی کے ہاتھوں تمام میں رسوا و بدنام ہونا کتنا خوفناک خیال ہے!۔ بیٹی تم سے اگر ہنگامی چوک ہو گئی ہو تو اسے بھلا دو۔ زندگی میں آنے والے نشیب و فراز میں سے ایک یہ بھی سہی!۔ اور نہایت سعادت مندی اور شرافت کے ساتھ اپنے باپ کے فیصلے پر سر جھکا دو!۔ میں تمہیں بتاتی ہوں کہ مصطفیٰ!

بہت اچھے آدمی ہیں! مخلص ہیں۔ شریف ہیں۔ ہنس مکھ اور خوش مزاج ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ تمہیں وہ اور ان کے بزرگ پسند بھی کرتے ہیں! تم ان کے ساتھ ہمیشہ خوش رہو گی! وہ خاندان ہمارا برسوں کا جانا بوجھا ہے کسی بھی غلط فہمی کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ لیکن اور کوئی خاندان اگر ہوا تو سب سے بڑی بات اس کی چھان بین کی ہو گی۔ لوگ آج کل معصومیت کے پردے میں دھوکے دینے لگے ہیں۔ خدانخواستہ تم نے کوئی دھوکا کھایا تو ہم کس سے فریاد کریں گے بیٹی تم سمجھ رہی ہو نا میری بات۔ اب مجھے جواب دو میری بچی! ماں کو ماں سمجھ کر۔ دشمن اور مخالف سمجھ کر نہیں!"

روحی نے تمام باتیں غور سے سنی تھیں! اور پھر بولی تھی! "امی مجھے آپ میری ماں ہیں۔ آپ یہ کیوں چاہیں گی کہ میں ساری زندگی کسی جہنم میں سلگتی رہوں!! یہ ایسا جواب تھا کہ سوال کی تردید میں بھی تھا تائید میں بھی!۔

پھر آمنہ بیگم نے کچھ نہیں پوچھا!۔

جویریہ سے روحی کو پتہ لگ گیا تھا کہ شکیل کو بلایا گیا ہے!۔ جویریہ نے پوری تفصیل سنا دی تھی! کس طرح بڑا دیوان خانہ آراستہ کیا گیا ہے۔ کرسٹل کے گلدان نکلے ہیں۔ عمدہ کشن رکھے گئے ہیں!۔ اور رنگین ٹی وی بھی باہر ہی کے ایک گوشہ میں رکھوا دیا گیا ہے۔ وہ دبیز قالین جو توشک خانہ میں لپٹا رکھا تھا۔ جس پر چلتے ہوئے گٹوں تک پاؤں دھنستے ہیں۔ فرش پر بچھایا گیا ہے اور وہ بڑا جھاڑ جو پچھلی میلاد شریف پر لگایا گیا تھا وہ بھی مستری کو بلا کر چھت سے لگایا گیا ہے۔ پھر جویریہ نے حیرت سے آنکھیں پھیلا کر مزید اضافہ کیا۔

اور جانے کیا کچھ اعلیٰ اقسام کی چیزیں تیار کرنے کا حکم خانساماں کو ملا ہے۔ میں تو حیران ہوں۔ ایک آدمی کے لیے ایسا شاہانہ انتظام!!"

روحی ہنس پڑی۔ کھلکھلا کر ہنسی اور دیر تک ہنستی رہی۔!

کیا بات ہے۔ کیوں ہنس رہی ہو!" جویریہ کو تعجب ہوا۔

"یہ ڈرانہ دام شکار کو مرعوب کرنے کے لیے نہیں بچھایا گیا۔ بلکہ اس لیے بچھایا گیا ہے کہ وہ ان کے قریب کبھی نہ آئے۔ دور ہی سے بھاگ نکلے! سمجھیں!"

اُف!" جویریہ نے دل تھام لیا " مطلب یہ کہ شکیل صاحب تمھارے گھر کا یہ ٹھاٹ باٹ دیکھ کر تمھارا ہاتھ طلب کرنے کی جرأت ہی نہ کرسکیں!"

"اور پھر اس اہتمام کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔ یہ ظاہر ہے، یہ بناوٹ اور دکھاوا ڈیڈی کی فطرت سے بعید چیز ہے۔ وہ امارت کے اظہار کو حد درجہ بچھورا پن اور کمینگی سمجھتے ہیں۔ پھر یہ طبیعت سے بعید انتظام کیوں ہے!۔

ہُنھ!۔ ارے! وہ بے چارے ایک معمولی سے طالب علم ہیں۔ انھیں اس طرح مرعوب زدہ متاثر کرنا کیا۔؟ صاف صاف کہنے میں جھجک کیسی ہے۔ یہ بڑے لوگ ہیں۔ اپنے در سے دھتکار کر پشیمان تو نہیں ہوں گے!"

عین عالم اضطراب میں شکیل کو وہ مژدۂ جانفزا ملا جس نے سوکھے دھانوں میں پانی ڈالنے کی بجائے رہے سہے دھانوں کو بھی خشک کر دیا۔ اسے روحی نے پہلے ہی بتا رکھا تھا کہ شاید پھر اسے بلایا جائے گا مگر اتنی جلدی مقدر کے بیدار ہو جانے کی امید اسے نہ تھی!۔ ڈین صاحب نے بھی بڑی شفقت سے سعید صاحب ڈائریکٹر آف گارڈنٹس ڈیپارٹمنٹ کی ٹیلی فون کال کی خبر اسے دیتے ہوئے اسے کلاس سے جانے کی اجازت دے دی تھی!۔

اپنے دل میں امید وبیم کے بپھرتے طوفان چھپائے وہ گھر گیا تھا!۔ اور ناظمہ بیگم کو اطلاع دیے بغیر سعید صاحب کے دولت کدے پر جا پہونچا!۔ ناظمہ بیگم کو خبر کر کے کسی بھی خوش فہمی میں مبتلا کرنا اسے گوارہ نہ تھا!۔

بوڑھوں کے خواب ٹوٹتے ہیں تو بہت تکلیف پہونچاتے ہیں!۔

راستہ کاٹنا اس سے دوبھر ہو گیا!۔

یہ ایک آتشیں سوال تھا جو اس کے دماغ کو جلا رہا تھا!۔

اس خاص اخصاص طلبی کا مقصد کیا ہے؟۔

دل و دماغ میں گوناگوں اندیشوں کے محشر چھپائے وہ ان کے عالیشان گیٹ پر پہونچ ہی گیا!۔

چوکیدار کو اس کی آمد کی خبر پہلے ہی دے دی گئی تھی!۔ وہ اس کے پہونچتے ہی اپنے اسٹول سے کھڑا ہو گیا!۔ اور بڑی رسنگی سے پوچھا۔

"آپ ہی شکیل صاحب ہیں!؟"

سب سے پہلے وہ سانولا آدمی اس کے حسن و خوبروئی سے متاثر ہو گیا تھا!۔

"ہاں!" شکیل نے بڑی سنجیدگی سے کہا "مہربانی کر کے میرے آنے کی خبر پہنچا دیجئے۔"

پھر چپراسی اندر سے آ پہونچا! اور اسے اپنے ساتھ لے گیا!۔

برآمدے میں اس کے استقبال کے لیے اور اسے مرعوب کرنے کی خاطر سب اکٹھا تھے۔ سعید صاحب، نوید، اور عبید! تاکہ وہ دل ہی دل میں شرمندہ ہو جائے کہ اس کے سے بے حقیقت طالب علم کا استقبال اتنے معزز حضرات نے کیا ہے۔ لیکن ان سب کی توقع کے خلاف مرعوبیت کی کوئی علامت اس کے چہرے پر نظر نہ آسکی!۔ بلکہ وہاں اس کے بر خلاف ایک دوسرا ہی تماشہ ہوا کہ نوید اور عبید خود

اسی سے متاثر ہو گئے! سعید صاحب نے بھی ایک تحیر خیز نگاہ اس پر ڈالی تھی! ان کے وہم و گمان میں بھی اس شکل و صورت کا آدمی نہ تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ایک مفلوک الحال پریشان سا ہونق لڑکا ان کے سامنے آ کے بیٹھ جائے گا! لیکن اس کی شان اور وقار انھیں مرعوب کر رہا تھا! گہرے کاہی رنگ کے پتلون اور جھاگ کے سے سفید قمیص میں وہ بہت پر کشش اور دلفریب ہو رہا تھا! اس کی گہری سیاہ آنکھوں کا افسوں ان پر اثر کر رہا تھا۔ اس کے حسین خط و خال، ہلکے ہلکے گھنگھریالے ہوئے بال۔ قدرتی سرخی لیے ہوئے خوشنما لب، اونچی پیشانی، مضبوط گردن، چوڑے شانے، اور چہرے پر متانت کی اور شرافت کی عجیب سی شان! وہ وقار و سنجیدگی کا دلکش پیکر لگ رہا تھا۔ جس طرح سر جھکا کر اور ادب سے اس نے سعید صاحب اور نوید کو سلام کیا اور کسی قدر جھک کر مصافحہ کیا تھا اس خوبصورت ادا نے کم سے کم نوید کا دل موہ لیا تھا سعید صاحب خاموش اپنے لب چبا رہے تھے!

"بیٹھئے!" نوید نے مسکرا کر سامنے صوفہ کی طرف اشارہ کیا لیکن وہ تب تک نہ بیٹھا جب تک کہ سعید صاحب اور خود نوید نے اپنی نشست نہ لے لی۔

سعید صاحب کا خیال تھا کہ وہ ان کے وسیع و عریض خوبصورت اور شاندار سجے سجائے ڈرائنگ روم سے سخت متاثر ہو جائے گا! پلکیں جھپکائے بغیر گھور گھور کر قیمتی ڈیکوریشن پیس کو دیکھے گا! مرعوب ہو جائے گا۔ ہکلائے گا مگر اس نے نظر اٹھا کر کسی طرف دیکھا تک نہیں! اور سعید صاحب نے یوں محسوس کیا کہ ڈرائنگ روم کی بیش قیمت چیزیں ان کی زبوں حالت پر چپکے چپکے مسکرانے لگی ہوں۔ وہ کھانسے اور نوید کو بات کرنے کا سرا مل گیا۔ بڑی اپنائیت سے مسکرا کر انھوں نے پوچھا۔

"شکیل صاحب! آپ سے مل کر مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میں اس سے

پہلے بھی آپ کو کہیں دیکھ چکا ہوں! کیا آپ کو کچھ یاد آتا ہے کہ ہم کہیں ملے تھے؟"
میں کچھ عرض نہیں کر سکتا جناب عالی۔!" شکیل نے جواب دیا۔" ہو سکتا ہے کہ
کہ سرِ راہ کہیں آپ نے مجھے دیکھا ہو۔!"

اس کی بھاری دلکش اور ہموار آواز بھی نوید کو بہت اچھی لگی!۔
"ہاں شاید۔ راستے میں آپ کو دیکھا ہے۔" انھوں نے کہا۔ پھر وہ کھل کر مسکرائے"
بات یہ ہے شکیل میاں کہ آپ ماشاء اللہ بہت خوبصورت ہیں اور میں نہیں
سمجھتا کہ اگر کوئی ایک دفعہ آپ کو کہیں دیکھ لے تو پھر بھول سکے!۔
وہ مسکرایا اور لمحہ بھر کے لیے اس کے خوشنما دانت چمکے۔ وہ پھر فرش کو
تکنے لگا۔ خاموشی بے تکی ہونے لگی تھی کہ عبید نے پوچھ لیا۔
"شکیل بھائی۔ اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ آپ میرے دوست بن جایئے
تو آپ بن جائیں گے؟"
جی ہاں۔ کیوں نہیں۔ میں آپ کا دوست ہی تو ہوں۔!" اس نے اپنی مخمور
آنکھیں اس کی طرف اٹھائیں۔
عبید ہنسنے لگا!" میں نے آپ کی اجازت اس لیے لی کہ آپ بڑی جماعت
میں پڑھتے ہیں اور چیا کہ پاپا نے کہا ہے آپ حسین بھی اتنے ہیں۔ میں بھلا آپ
کا سا کہاں ہوں۔"
"نہیں نہیں!۔ آپ بڑے خوبصورت ہیں؟" شکیل نے جواب دیا۔" اور میرے
دوست! دوستی میں خوبصورتی بدصورتی اور کالے گورے کی کوئی اہمیت نہیں
دوستی ان اعتبارات سے بالاتر ہوتی ہے۔"
نوید نے کھنکھار کر پھر گفتگو کا سلسلہ جوڑا!" شکیل میاں۔ آپ سے مل کر اور
آپ کو دیکھ کر واقعی بڑی خوشی ہوئی۔ بھئی بات یہ تھی کہ کچھ دنوں قبل ہم نے آپ

سے اور آپ کے سارے ساتھیوں سے تعارف حاصل کرنے کی غرض سے غریب خانے پر مدعو کیا تھا لیکن ان میں آپ شامل نہیں تھے۔ کچھ تشنگی سی آپ سے نہ ملنے کی تھی۔ اسی لیے آج آپ کو تکلیف دی ہے۔ اور ہاں۔ سنا تھا کہ آپ کی والدہ محترمہ کی آنکھوں کا آپریشن تھا۔!"

"جی ہاں!" شکیل نے کہا: "اور خدا کا شکر ہے جناب عالی کہ آپریشن کامیاب رہا ہے۔ ان کی بصارت واپس آ گئی۔ تقریباً بارہ پندرہ سال ایک تاریک زندگی گزار کر اب انھوں نے سورج کی روشنی دیکھی ہے! لیکن ابھی انھیں ڈاکٹر صاحب نے مکمل احتیاط کرنے کی ہدایت دی ہے!۔ روشنی میں زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتیں۔"

"ہاں یہ تو ضروری ہے" سعید صاحب جو دیر سے خاموش بیٹھے تھے۔ بول پڑے۔

"اچھا بھئی میں یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ" نوید صاحب نے کہا: "آپ کے والد محترم کا اسم گرامی کیا ہے وہ کیا کام کرتے ہیں۔ آپ اتنے اچھے دوست ہمارے ہو گئے ہیں تو میں چاہتا ہوں کہ آپ سے تعلقات اور بڑھیں۔ استوار ہوں۔ ہمارا ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا ہو۔ ہے نا۔ آپ اس سلسلہ میں کیا کہتے ہیں؟"

"زہے نصیب!۔ یہ تو میری عزت افزائی ہے جناب!" شکیل نے جواب دیا۔ "آپ اس سلسلہ میں میری رائے دریافت فرما کر مجھے شرمندہ کر رہے ہیں!۔ میں امی سے کہوں گا۔ وہ کچھ ٹھیک ہو جائیں گی تو ضرور آئیں گی۔ لیکن۔ والد صاحب وہ۔ ان کا مدتوں پہلے انتقال ہو چکا ہے۔ جب شاید میں بہت چھوٹا تھا۔ مجھے بس خواب کی طرح وہ یاد ہیں!"

"او ہو۔ اچھا! کچھ خیال نہ کیجئے گا میاں۔ مجھے معلوم نہیں تھا!" نوید نے کہا۔ "اب تعلیم کے ختم پر آپ نے اپنے مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے؟" سعید صاحب

نے پوچھا۔ کچھ مجھے بھی بتائیے!"

"جی!" خشک لبوں پر زبان پھیر کر اس نے جواب دیا۔ "ابھی تو میں زیر تعلیم ہوں۔ ویسے میں نے شارٹ ہینڈ کا امتحان پاس کر لیا ہے۔ عربی ڈپلومہ کورس کر چکا ہوں۔ ریفریجریشن کورس پاس کیا ہے۔ میں چاہتا تو کہیں ملازمت کر لیتا لیکن مجھے اپنی تعلیم کی فکر تھی۔ میں ڈاکٹریٹ کرنا چاہتا ہوں۔ مستقبل تو خدا کے ہاتھ میں ہے جناب! کچھ نہ کچھ تو کر ہی لوں گا!"

"خیر!" ناخوشگوار لہجے میں سعید صاحب نے بات کاٹ دی۔ "وہ ٹھیک ہے۔ مستقبل کی کوئی ضمانت نہیں دے سکتا! ہاں۔ آپ کے اور کون اعزہ یہاں ہیں؟ کوئی قریبی عزیز، رشتے دار۔؟ کیوں۔!"

"عزیز قریب!" شکیل حیران تھا۔ آخر اس زبردستی کے انٹرویو کی کیا ضرورت تھی۔ اور ان صاحب کا لہجہ کیوں اس قدر غصیلا تھا۔ یوں اس سے پیش آ رہے تھے۔ جیسے وہ ان کا زر خرید ہو یا ان کا کوئی بھاری نقصان کیا ہو۔! پھر بھی اس نے اپنے لب و لہجہ کو امکان بھر نرم اور سعادت مندی کا رکھا۔ "رشتے داروں میں ایک چچا ہیں ان کا پورا کنبہ ہے۔ وہ یہاں نہیں بھوپال میں رہتے ہیں۔ اور یہاں تو کوئی قریبی عزیز نہیں ہے۔ بس میں ہوں امی ہیں۔ اور جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا۔ والد صاحب کا برسوں قبل انتقال ہو چکا ہے!"

"اچھا!" سعید صاحب نے کہا۔ کچھ سوچ رہے تھے!۔

پھر وہاں بے معنی سی خاموشی چھا گئی!۔ شکیل نے بھی چپ سادھ لی تھی۔ پردے کے پیچھے آمنہ بیگم، سلمیٰ اور جویریہ موجود تھیں!۔ شکیل کو اس رخ پر نوید نے بٹھا دیا تھا کہ اسے خواتین بھی اچھی طرح دیکھ سکیں!۔ چنانچہ وہ ان کے سامنے ایک خوبصورت تصویر کی طرح بیٹھا تھا!۔

اسے دیکھ کر آمنہ بیگم کو چپ سی لگ گئی تھی۔ انھوں نے سوچا تھا کہ اگر اس پہ حیرے پر روحی فدا ہے تو ٹھیک ہے۔ خود انھیں بھی وہ بے حد پسند آیا تھا۔ خوبرو وجیہہ و دلفریب، اس کے ظاہری اطوار بھی پسندیدہ ہی لگ رہے تھے!۔ لیکن وہ بالکل خاموش تھیں۔ اپنے دل کی بات سلمیٰ پر بھی ظاہر نہ کی!۔ البتہ سلمیٰ... چہک کر بول اٹھی تھیں۔

"باجی بہت ہینڈسم لڑکا ہے۔ سچ پوچھیے اپنی روحی کے لائق۔ مگر میں کچھ نہیں بولوں گی۔ بھائی جان کو شروع ہی سے یہ پسند نہیں۔ میں کچھ کہہ دوں گی تو وہ سمجھیں گے کہ روحی کی تائید کر رہی ہوں اسے شہ دے رہی ہوں؟"۔

آپ نے ایک بات پر غور کیا چھوٹی چچی!" جویریہ نے سرگوشی کی "ان میں اور مصطفیٰ صاحب میں کتنی مشابہت ہے۔ یہ بات میں نے روحی سے بھی کہی تھی۔ اس نے جواب دیا کہ اس نے مصطفیٰ صاحب کی شکل اچھی طرح دیکھی ہی نہیں ہے۔ مگر آپ محسوس کر رہی ہیں نا۔ کچھ نہ کچھ شباہت ان دونوں میں ہے کہ نہیں؟"

ہاں" بے پرواہی سے سلمیٰ نے کہا "دونوں نوجوان ہیں۔ پرکشش ہیں پر میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ ان میں مشابہت ہے کہ نہیں!" پھر انھوں نے آمنہ بیگم کے کان میں کہا "باجی، امارت و غربت سب منجانب اللہ ہے۔ آخر بھائی جان کو اس بیچارے سے کیا بیر ہو گیا ہے۔ اسی کو کیوں نہیں داماد کے طور پر منتخب کر لیتے؟ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ مجھے یہ لڑکا بہت پسند آیا ہے!"

خاموشی سے تماشہ دیکھو سلمیٰ" آمنہ بیگم نے کہا "دیکھا نہیں مجھے ذرا سی بات پر کتنا ڈلایا ہے۔ تم چند روز کے لیے آئی ہو۔ کچھ ادھر ادھر کی کہہ کے بری نہ بنو۔ میں نوید کو بھی یہی سکھا دوں گی۔ جو ہونا ہے وہ تو ہو کر رہے گا۔ روحی کی تقدیر میں جو لکھا ہے وہ بہر حال بھگتے گی۔ وہ بھی بھائی سے زبان لڑا کر برے کیوں بنیں؟

وہاں جاتی آئی "اماں صاحب نے بلوایا ہے کہ باہر جلدی سے چائے وغیرہ بھجوا دی جائے۔"

"اے ہاں۔ میں چلوں" یہ کہہ کر سلمیٰ کچن کی طرف ہولیں۔ جلدی جلدی کئی کشتیاں جو پہلے سے بجانے کن کن لوازمات سے لبریز تھیں۔ ملازموں کے ہاتھ باہر بھجوا دیں پھر بھاگ کر پردے کے پیچھے آکھڑی ہوئیں!۔

پندرہ بیس منٹ بعد سعید صاحب اور نوید اندر آئے!۔ نوید کے چہرے سے عجیب سے جذبات ہویدا تھے۔ مگر سعید صاحب جیسے کہ آگ بگولہ بھرے ہوئے۔ اور آمنہ بیگم، سلمیٰ، وغیرہ ان کشتیوں کو حیرت سے دیکھ رہی تھیں جو بھری ہوئی جیسی کی تیسی ملازم لاکر بڑی میز پر رکھ گئے تھے!۔

"یہ کیا؟ نوید میاں!" آمنہ بیگم نے دزدیدہ نظروں سے شوہر کو دیکھ کر نوید سے بولیں "کچھ کھایا پیا نہیں انھوں نے؟"

"جی ممی ایک بسکٹ کھا کے صرف چائے پی انھوں نے!" عبید بول پڑا پھر چہک کر کہا "ارے ممی کیا آدمی ہیں وہ بھی۔ آپ دیکھتیں میں تو حیران ہوں۔ دنیا میں اتنے خوبصورت انسان بھی اللہ میاں نے پیدا کیے ہیں۔ جب تک وہ بیٹھے رہے میں انھیں دیکھتا رہا۔ میں نے انھیں اپنا دوست بنا لیا ہے اب میں ان کے گھر جاؤں گا! انھیں ایک بار پھر یہاں بلاؤں گا!۔ ممی وہ بہت اچھے ہیں!"

"خاموش رہو!" سعید صاحب گرجے! "کوئی ضرورت نہیں ہے کہ کسی غیر شخص سے مراسم بڑھائے جائیں!۔ اور۔ یہ تم پوچھتی ہو کہ انھوں نے کچھ کھایا پیا نہیں۔ ہنھ! میں کہتا ہوں کبھی زندگی بھر ایسی چیزیں کھائی ہوتیں تو قدر بھی ہوتی۔ عجیب ناک چڑھا مغرور لڑکا تھا! نہ تو کسی طرف اس نے توجہ کی نہ ضیافت ہی سے مرعوب ہوا۔ کشتیاں بھری رکھی رہیں۔ بڑے اصرار پر ایک بسکٹ اٹھایا۔ بڑے تکلف سے چائے نوش فرمائی اور صاحبزادے اٹھ کھڑے ہوئے!۔ خود کو سمجھتے کیا ہیں؟"

سب چپ رہے۔

سعید صاحب کو جو کچھ بھی بغض شکیل سے ہو گیا تھا وہ صرف روحی کی ضد، خود سری اور ان کے مقابل آنے کے ردعمل کے طور پر تھا!۔ ان کے بے زبان، حیا پرور اور شریف ترین لڑکی کو بہکانے والا وہی تو تھا!۔ سعید صاحب بہرحال بہر کیف خواہ مخواہ کے انتقام پر اُتر آئے تھے!۔

اپنی عادت و فطرت کے خلاف انھوں نے جتنی باتیں کی تھیں وہ سب کو سخت حیران کر رہی تھیں!۔ تھوڑی دیر تک شکیل کو برا بھلا کہنے کے بعد انھوں نے باآواز بلند کہا۔

"شاید تم لوگوں کو اس کا علم نہیں ہے کہ میں نے آج ہی شام کو ہاشم بھائی اور ان کی بیگم کو مدعو کیا ہے۔ نوید! میں چاہتا ہوں کہ تمھارے یہاں زمانہ قیام میں روحی کے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں!۔ یہ تو مجھے قدرتی مدد ملی کہ تم اور سلمیٰ بھی آئے ہوئے ہو۔ اگر کوئی اعتراض ہو تو ابھی کہہ دو!"

"اعتراض ہو بھی تو آپ کے سامنے کوئی کیا منھ کھول سکتا ہے؟" آمنہ بیگم نے جل کر کہا۔

"میں تم سے نہیں پوچھ رہا ہوں۔ سعید صاحب کو ان کا یہ کہنا سخت ناگوار گزرا۔

"ہاں۔ میں آپ کی لڑکی کی ہوتی کون ہوں!" آمنہ بیگم بولیں۔

"جب کوئی نہیں ہوتی ہو تو خاموش رہو!"

"بھائی جان۔ جو آپ مناسب سمجھیں!" جلدی سے نوید نے کہا: "ظاہر ہے کہ جب آپ نے کوئی فیصلہ کر ہی لیا ہے تو اب اس میں ہماری مداخلت بیکار ہی ہے!۔

"معلوم ہوتا ہے کہ اس خوبصورت بھوت کا سایہ سب پر ہو گیا ہے" سعید صاحب نے کہا اور پھر نفس مطلب پر آ گئے!: "سنو بھئی! تم لوگ مجھے ناانصاف اور بے حس

سمجھ رہے ہو۔ کہ میں کسی کی ظاہری باطنی خوبیوں سے متاثر نہیں ہوتا۔ نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ تم لوگ خود سمجھدار ہو۔ سوچ سکتے ہو کہ شادی بیاہ زندگی بھر کا سمجھوتہ، زندگی بھر کا معاملہ ہوتا ہے۔ اس معاملہ میں جذباتیت کو دخل دینا دانشمندی نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم سب کو شکیل بہت اچھا لگا ہے۔ یقیناً وہ مجھے بھی بہت پسند آیا ہے۔ بس اسی قدر کہ ایک حسین وجمیل بُت پر ایک جیتی جاگتی دوشیزہ بھینٹ چڑھا دی جائے!۔ جو عمر بھر اپنی ساری ضرورتوں کو پس پشت ڈال کر صرف اپنے شوہر کے بے مثال حُسن ہی کو سراہتی رہے۔! ہے نا یہی بات!۔ نوید تم جانتے ہو میں نے روحی کو کتنے ناز ونعم سے پالا ہے۔ وہ ایک آرام دہ زندگی کی عادی ہے۔ اور اسے یہ آرام شکیل کے گھر نہیں مل سکتا! وہ ابھی زیر تعلیم ہے۔ اس کا مستقبل غیر یقینی ہے اس نے کتنی باتیں گنوادی تھیں۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں میں نے یہ پوچھا ہے مگر وہ سب چیزیں بے سود بے فائدہ اور بے ثمر ہیں۔ ابھی وہ پڑھ رہا ہے اور تعلیم ادھوری چھوڑ کر صرف شادی کی خاطر ملازمت نہیں کرے گا۔ اسکے اوپر اپنی معذور ماں کی ذمہ داری بھی ہے۔ اس صورت میں روحی کا ہاتھ اس ہاتھ میں دے دینا نہ صرف روحی پر ظلم ہے بلکہ شکیل کے ساتھ بھی زیادتی ہے اس کی ساری زندگی کشمکش، جدوجہد، ملازمت کی دوڑ دھوپ کی نذر ہو کر رہ جائے گی۔ پھر معاملہ ان ہی تین نفوس پر رکا نہیں رہے گا! افراد خاندان میں اضافہ نہ ہوگا!۔ کیا ایک فرد کی بھی ضروریات زندگی کچھ کم ہوتی ہیں۔؟!۔ جب یکے بعد دیگرے نئی نئی مصیبتیں سر پر پڑتی ہیں تو پھر ازدواجی زندگی کی کچھ تلخیاں بھی بڑھنے لگتی ہیں۔ میاں بیوی ایک دوسرے کو الزام دینے لگتے ہیں جھگڑے بڑھتے ہیں۔ کبھی کبھار نوبت علیحدگی تک پہونچ جاتی ہے!۔ اور اس کے بعد کسی بھی فریق کو عمر بھر سکون کی سانس لینی نصیب نہیں ہوتی!۔ ماں باپ

کا دبائو بچوں پر ماں پر اور لڑکی کے میکے والوں پر بھی پڑتا ہے۔ میکہ کب تک سلامت رہ سکتا ہے۔ لڑکی کو بری بھلی ملازمت کر کے اپنے بچوں کی زندگی کی گاڑی کھینچنی پڑتی ہے!۔ اور اسی میں زندگی تمام ہو جاتی ہے۔ اگر تم لوگ راضی ہو کہ روحی اسی نہج کی زندگی گزارے تو میں بھی راضی ہوں۔ بخدا پھر کچھ نہ کہوں گا!۔ ابھی پھر بلاؤ شکیل کو۔ اور نکاح کر کے روحی کو اس کے ساتھ کر دو"

سعید صاحب نے تلخ و ناگوار حقیقتوں کی مکمل تصویر کھینچ کر رکھ دی تھی!۔ سب ایک بار پھر چپ ہو گئے! ان کے سامنے ایسی ناکام زندگیوں کی کئی مثالیں تھیں!۔

سعید صاحب چند لمحوں تک خود بھی خاموش رہے۔ پھر بولے: "اور اس کے برعکس ہاشم صاحب کا خاندان ہے!۔ بس اس سے زیادہ میں اور کیا کہہ سکتا ہوں!

یہی بہت کافی ہے!" نوید نے زیرلب کہا!۔ بڑے بھائی صاحب کی زیادتی سخت گیری اور خودرائی سخت ناگوار ہو رہی تھی۔ جب کسی کی سنتے نہیں تو پھر رائے کیوں پوچھتے ہیں! وہ جھنجھلائے ہوئے سے بیٹھے پاؤں ہلاتے رہے اور اپنا غصہ بہلاتے رہے!۔

پھر ان کے باہر جاتے ہی دالان میں شور سا مچ گیا!۔

"کیا سچ مچ وہ لڑکا مغرور اور خودسر تھا؟" آمنہ بیگم نے تعجب سے پوچھا۔ "تمہارے بھائی کو تو بہت غصہ آ رہا ہے اس پر؟"

"بات یہ ہے بھائی جان نے اپنی عمارت کا رعب اس پر جمانا چاہا تھا وہ ان کی کسی چیز سے مرعوب نہ ہو سکا۔ یہ بھائی جان کی توہین ہی تو تھی!" جل کر نوید نے کہا۔

"خیر اللہ سے دعا ہے کہ ایک پر مسرت زندگی کے حصول کے بعد روحی

پچھلی ساری باتیں خود بخود بھول جائے!۔ سلمیٰ نے کہا پھر پوچھا: باجی اب یہ مصطفےٰ اور ہاشم بھائی وغیرہ آئیں گے تو ان کی خاطرداری کے لیے کیا کیا جائے گا!؟

مجھے انھوں نے کوئی ہدایت نہیں دی: ان سے زیادہ جل کر آمنہ بیگم نے جواب دیا:۔ اب وہ سب گھر کے لوگ ہیں۔ ان کی خاطرداری کے لیے خاص کر کے کیا کیا جائے گا!؟

پھر یہ عجیب بات ہوئی کہ کمشنر صاحب اور ان کی بیگم کی پذیرائی کے لیے گھر میں ایک دفعہ پھر پہل شروع ہوگئی!۔

روحی سب کچھ دیکھ رہی تھی اور بالکل خاموش تھی۔ اس کا سرد سلوک کہہ رہا تھا۔

ہم نے اپنے جی میں ٹھانی اور ہے

لیکن وہ اب بیماروں کی طرح کمرے میں بند نہیں تھی۔ یوں لگتا تھا کہ راضی برضا ہو چکی ہو!۔ اس کے یوں سنبھل جانے سے سب نے یہی سوچ لیا کہ وہ سچ مچ اپنی ناسمجھی کی ساری باتیں بھول چکی تھی!!

کمشنر صاحب اور ان کی بیگم کو روحی بہت پسند تھی۔ لیکن سعید صاحب اور آمنہ بیگم کو حیرت اس بات پر تھی کہ وہ مصطفےٰ کے بارے میں زبان کیوں نہیں کھولتے۔ ان کی عمر تیس کے لگ بھگ تھی! وہ ایک عہدے دار تھے۔ اچھے خاندان کے فرد تھے۔ ان کے لیے لڑکیوں کی کیا کمی تھی۔ مگر ابھی تک کہیں ان کا رشتہ

بھیجا نہ گیا تھا! آخر کس لیے۔ بیگم ہاشم یہ تساہل اور بے پروائی کیوں برت رہی تھیں!۔

سعید صاحب کے مدعو کیے ہوئے کمشنر صاحب اور ان کی بیوی معہ مصطفےٰ کے آ چکے تھے۔ اور اسی بڑے سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے مصطفےٰ صاحب نمول فویدے باتیں کر رہے تھے۔ عبید کے ساتھ ہنس رہے تھے!۔ انھیں کچھ کچھ اندازہ ہو چلا تھا کہ خاص کر سعید انکل کا ان لوگوں کو گھر پر مدعو کرنا کسی خاص سبب ہی کی بنا پر ہے۔ اور وہ دل کی گہرائیوں سے دعا مانگ رہے تھے کہ بیگم ہاشم کے منھ سے نکل جائے۔ وہ روحی کی طلبگار ہیں!۔

جب ادھر ادھر کی یونہی سی بات چیت ہو چکی تو سعید صاحب نے کہا: مصطفےٰ بھئی تم اور عبید برآمدے میں جا کر اپنے پروگرام ترتیب دو۔ ہمیں کیوں ڈسٹرب کرتے ہو۔! میں ہاشم بھائی سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں!"

"ٹھیک ہے انکل!" وہ اٹھ کھڑے ہوئے!۔ اور عبید کا ہاتھ تھامے برآمدے میں چلے گئے!۔

یہاں اکیلے میں عبید نے دیدے نچا کر کہا: "مجو بھائی! کچھ آپ کو پتہ ہے کہ تایا ابا کو ڈیڈی نے کیوں بلایا ہے؟"۔

"تم بتاؤ! میں کیا جانوں؟" مصطفےٰ نے کہا۔

"ابھی گرمیوں کی چھٹیوں میں کشمیر کی سیر کرانے کا وعدہ کیجیے تو بتا دوں! عبید بولا۔

"ارے بیا پکا وعدہ۔!" مصطفےٰ نے اس کا ہاتھ تھام کر زور سے ہلایا:

خوشخبری سنانے کی بھلا یہ بھی کوئی رشوت ہے۔ ہاتم نے اگر چاند کی سیر کی رشوت طلب کی ہوتی تو میں وہ بھی منظور کر لیتا۔ اب بتا دو!"

"اچھا تو سنئے۔!" عبید نے کہا: "ابھی کچھ دیر پہلے ڈیڈی بہت چپکے چپکے ممی اور پاپا سے کہہ رہے تھے کہ آپ کو منگنی کی انگوٹھی پہنائی جائے گی اور پھر ہمارے یہاں رہتے تک باجی کی شادی بھی ہو جائے گی!"

"ارے یار، ہانک رہے ہو، بس!" مصطفےٰ نے بوکھلا کر کہا: "نہیں! سچ کہو۔ کیا واقعی؟"

"اتنی بڑی بات میں بھلا جھوٹ موٹ کیونکر کہہ سکتا ہوں!" عبید بولا: "اب وہ سب بڑے لوگ یہی گفتگو کر رہے ہوں گے۔ تبھی تو آپ کو وہاں سے چلتا کر دیا ہے۔ ہونے والے دولہا کے سامنے اس کی شادی کی بات چیت کیسے کر سکتے ہیں۔

"اچھا!" وہ ہنسنے لگے! اور ذہن میں ایک ننھا سا زہر بھرا سپنولیا رینگا!"

لیکن کوئی اور بھی تو ہے۔ روحی کا مرکز محبت۔ اگرچہ کہ انھوں نے اس سے پوچھنے کی ہمت نہ کی تھی۔ لیکن انھیں تو یقین تھا! روحی کی محبت، الفت اور توجہ ان کے لیے ہرگز نہیں ہو سکتی! یوں بڑوں کے دباؤ میں آ کر وہ سر تسلیم خم کر سکتی ہے۔ مگر کیا یہ انھیں گوارہ ہو سکے گا! روحی ساری زندگی ان سے منافقت برتتی رہے؟۔

محبت پر کسی کا بس نہیں!۔ محبت غیر اختیاری جذبہ ہوتا ہے۔ وہ روحی کو قصوروار نہیں سمجھتے تھے!۔ وہ صرف یہ جاننا چاہتے تھے کہ یہ فیصلہ جو بڑے کر رہے ہیں!۔ یکطرفہ تو نہیں تھا۔ لیکن یہ سوال کرنے کی ہمت بھی اس شخص میں نہ تھی جو ہلاکت ہتھیاروں کے درمیان اپنی جان کی بازی لگاتا تھا!۔ وہ گہری سوچ میں ڈوب گئے!۔ اور عبید بھی نجانے کیا سوچنے لگا تھا!۔

سعید صاحب نے اپنے دل کی بات کمشنر صاحب سے کہہ دی تھی!۔ انھیں مصطفےٰ بہت پسند تھے اور وہ چاہتے تھے کہ ان کو اپنے مختصر سے کنبہ میں مستقل طور پر شامل کر لیں! کمشنر صاحب اور ان کی بیگم کی نظریں آپس میں ملیں۔ وہ ایسی معنی خیز اور پُراسرار

سی بھیس کر سعید صاحب نے تعجب سے پوچھا۔

آپ لوگ ایک دم سے پریشان کیوں ہو گئے؟ میرا اس طرح کہنا کچھ ناگوار گزرا ہے کیا۔؟"

"میرا خیال ہے کہ میں تم سے سب کچھ کہہ ہی دوں!" کمشنر صاحب نے کہا" تکلیف تو ہوگی۔ مگر اٹھ کر ذرا دروازہ بند کر دو!"

بیگم ہاشم نے چوروں کی طرح سر جھکا لیا۔ نہایت تعجب سے نوید نے انھیں دیکھا اور لپک کر دروازہ بولٹ کر دیا۔

سناٹے میں ان کے دل بری طرح دھڑک رہے تھے! جیسے کہ دھڑکن کانوں میں بجنے لگی تھی!۔ کیا کہنے والے تھے کمشنر صاحب۔ وہ لوگ حیران تھے

نہایت مدھم گونجتے ہوئے لہجے میں کمشنر صاحب نے کہا: "بھئی بات یہ ہے کہ انسان اتفاقی واقعات کے شکنجے میں جکڑا ہوا وہ مجبور چیز ہے کہ اگر کبھی کوئی غلطی زبان کی بے ساختگی میں سرزد ہو جائے تو اسے عمر بھر چھپانا پڑتا ہے۔ ہم لوگ بھی اسی قسم کے ایک سانحے سے دوچار ہو چکے ہیں۔ جسے اب تک چھپا رہے ہیں! اور اگر اس رشتے کی بات چیت نہ ہوئی ہوتی تو میں نے سوچ لیا تھا کہ ہمیشہ اس راز کو راز ہی رکھوں گا!" پھر انھوں نے نجانے کیا بکواس کر کے بیگم کی طرف رخ کر کے پوچھا۔

"کیا رائے ہے تمھاری۔ سعید میاں سے کہہ دینے میں کیا حرج ہے؟"

"ہاں۔ اب کیا چھپایئے گا!" بیگم ہاشم نے بھی بہت مدھم لہجے میں جواب دیا" سعید میاں اور آمنہ کو لاعلم رکھنا میں مناسب نہیں سمجھتی!۔ کہہ دیجیے!"

"کیا بات ہے۔ آپ لوگ تو جناب عجیب سے پراسرار ہو گئے ہیں!" سعید صاحب نے حیرت سے آنکھیں پھیلا کر ایک ایک کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"سعید میاں۔ بات دراصل یہ ہے بھائی کہ تم لوگ جو آج تک مصطفےٰ کو ہمارا بیٹا سمجھ

سمجھے ہوئے ہو تو ایسا نہیں ہے " کمشنر صاحب نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے پشیمان لہجے میں کہا: وہ نہ میرا بھانجہ ہے، نہ بیگم کا!"

"تو پھر۔!" چاروں کی زبان سے ایک ساتھ نکلا!۔

"وہ ہمیں بھوپال ریلوے اسٹیشن پر روتا ہوا ملا تھا!" کمشنر صاحب نے بتایا:" میں اپنے والد کی موت کے بعد جائیداد کے بٹوارے سے نپٹ کر حیدر آباد آرہا تھا! بھوپال اسٹیشن پر ٹرین رکی تھی!۔ اور پھر جب وہ چلی گئی تب ہم نے تین ساڑھے تین سال کے بچے کو بری طرح روتے ہوئے اور پاگلوں کی طرح اسٹیشن کی پٹریوں پر پھرتے دیکھا! وہ اپنی ماں کو پکار رہا تھا اور پٹریوں پر یوں دوڑ رہا تھا جیسے ریل کے پیچھے بھاگ کر ماں کے پاس پہونچ جانا چاہتا ہو! پلیٹ فارم تقریباً خالی ہو چکا تھا! اور کوئی اس کا پرسان حال نظر نہیں آرہا تھا۔ تب صاف ظاہر ہوا کہ یہ کسی مسافر کا بچہ تھا جو غلطی سے چھوٹ گیا۔ ہم کو اس معصوم پر بہت ترس آیا۔ ہم جانتے بوجھتے اسے اس بے بسی کے عالم میں کیسے چھوڑ سکتے تھے۔ لہٰذا اپنے ساتھ لے آئے!۔ یقین مانو کہ تقریباً ڈیڑھ تین چار ماہ تک ہم سے مانوس نہ ہو سکا! ماں کو ڈھونڈتا رہا۔ بیمار پڑ گیا تھا!۔ اور تب۔!"

رکی ہوئی سانس چھوڑ کر فرید نے پوچھا: "آپ لوگوں کو اس نے ماں باپ نہیں سمجھا تھا؟"

"اسی طرف آرہا ہوں!" کمشنر صاحب نے کہا: "جب بھی وہ اپنی ماں کو پکارتا ہم اسے یہی کہہ کر بہلا دیتے تھے کہ بیٹا تمہاری امی ابھی آتی ہیں۔ وہ ماں کو آواز دیتا تھا ہم جواب دیتے ابھی آئی جاتی ہیں۔ یہی جواب بے ساختگی میں ہماری زبان سے نکلا اور مستقل یہی جواب یہی تسلی ہم اسے دیا کیے!۔ اور وہ اتنا ناسمجھ بھی نہ تھا کہ ہمیں ماں باپ کے روپ میں قبول کر لیتا!۔ بہرحال میاں ہوا یہ کہ زمانہ گزرتا رہا۔ وہ جب سات آٹھ سال کا ہو گیا اسے کچھ سمجھ آئی۔ ماں باپ کی مفارقت کا اثر کچھ دھیما پڑا تب ہم نے اس سے کہہ دیا کہ تمہارے ماں باپ ایک ہوائی حادثے

میں ختم ہو چکے ہیں!۔ کیا کرتے!۔ بات نبھانی تو تھی!۔ بے چارہ بہت رو رہا تھا! اور پھر اپنی محرومی پر قانع ہو گیا!۔ اب تک اسے یہی معلوم ہے کہ وہ بیگم کی مرحوم بہن بہنوئی کا بیٹا ہے!۔

آپ اس سے کہہ دیتے کہ آپ ہی اس کے ماں باپ ہیں!" آمنہ بیگم نے کہا۔

"ابھی میں نے کہا تھا کہ وہ اتنا ناسمجھ بھی نہ تھا کہ اپنے ماں باپ کے روپ میں ہمیں ماں باپ سمجھ لیتا۔ اسے اپنی ماں اپنا باپ بخوبی یاد تھے" کمشنر صاحب نے جواب دیا۔ "اور میں سمجھتا ہوں کہ اب بھی یاد ہو گا!۔ کبھی اتفاقاً تذکرہ نکل آتا ہے تو بیگم سے کہتا ہے کہ آپ کی مرحوم بہن میری ماں بہت اچھی تھیں۔ مجھے یاد ہے گوری گوری تھیں۔ بیا اور نہ۔ مطلب یہ کہ بچپن کی یادداشت دھندلی ضرور ہو گئی ہے مگر مٹی نہیں ہے!۔

"جی۔!" سید صاحب نے خالی الذہنی کے انداز میں کہا

ہاشم بھائی! میں نہیں سمجھا کہ اس بات سے رشتے ناطے پر کیا اثر پڑ سکتا ہے" نوید نے پوچھا۔

وہ مسلمان تو ہے نا؟" سلمیٰ نے پوچھا۔

ہاں مسلمان تو ہے۔ لیکن میں نہیں جانتا کہ اس کا اصلی نام کیا ہے" کمشنر صاحب نے کہا: ہم نے پوچھا تھا کہ بیٹا تمہارا نام کیا ہے۔ وہ بتا نہ سکا!۔ نہ اپنا نام نہ اپنے والدین کے نام اسے معلوم تھے۔ یہ مصطفےٰ تو اسے ہم نے کہنا شروع کیا ہے!۔ اور نوید یہ جو تم نے پوچھا ہے کہ رشتے ناطے پر کیا اثر پڑ سکتا ہے تو میاں۔ اثر تو کچھ نہیں پڑے گا! یہ خلش تو میرے ضمیر کی تھی! ایسا نہ ہو کہ اس راز کو تم سب سے پوشیدہ رکھ کر میں خدا کی نظروں میں گنہگار ٹھہروں!۔ سچ تو یہ کہ اس کی شادی بیاہ کی ہیں بات چیت کرتے بیگم اسی لیے گریز کرتی رہیں کہ نکاح کے وقت بحیثیت باپ کے میرا

نام درج کرائے کچھ غیر شرعی بات تو نہ ہو جائے گی! عجیب معاملہ ہے! عقل چکر میں ہے!۔ مجھے اس کے باپ کا نام معلوم نہیں! نکاح نامہ پر اپنا نام لکھواؤں گا تو نہ ضرور پوچھے گا کہ اس کے مرحوم والد کا نام کیوں نہ لکھا دیا؟ میں کیا جواب دوں گا!۔ اسے باپ کا نام یاد نہ ہو۔ لیکن وہ کیسے باور کرے گا کہ میں بھی ان کا نام بھول گیا ہوں! تم میری یہ دشواری سمجھ رہے ہو نا!"

"جی ہاں!" سعید صاحب نے مردہ آواز میں کہا۔

"میں نے یہ ساری کہانی ایک مفتی صاحب کو کسی اور کے قصے کے طور پر سنا کر ان کا جواب مانگا تھا! انھوں نے کہا کہ اگر مقصد راز کو راز ہی رکھنا ہے تو آپ کسی فرضی شخص کا نام نوشہ کے والد کے نام کی جگہ درج کرا سکتے ہیں!" کمشنر صاحب نے جواب دیا۔

"لیکن میرا مشورہ یہ ہے کہ یہ سارے واقعات ہمت کر کے مصطفیٰ سے کہہ ہی کیوں نہ دیے جائیں!" آمنہ بیگم نے کہا۔

"آمنہ! پھر ہماری کیا صورت رہ جائے گی جو ہم اسے دکھائیں گے!" اکبی بیگم ہانپ کر بولیں۔ "ہم نے کہا ہم مسلسل پچیس چھبیس سال سے بس ایک ہی بات کہتے چلے آئے ہیں!۔ اب ہم اس بات سے ہرگز نہیں پھر سکتے!۔ اور۔۔!"

"ٹھیک ہے۔ آپ کیسے پھر سکتی ہیں!" نوید نے کہا: "اس صورت میں مصطفیٰ کا پہلا اعتراض یہی ہو گا کہ آپ نے میرے ماں باپ کو خواہ مخواہ مار ڈالنے کی بجائے سارے واقعات سچ سچ کہہ دیے ہوتے تو میں شاید انھیں کہیں سے ڈھونڈ ہی نکالتا آپ نے مجھے دھوکے میں کیوں رکھا؟ نہیں نہیں!۔ یہ تو واقعی بڑا جرم بڑا گناہ ہو جائے گا۔ مصطفیٰ سے کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں ہے! بس آپ نے ایک اہم بات ہم سے کہہ دی ہے۔ آپ نے اچھا کیا۔ اب اس راز کو ہم بھی اسی وقت تک

پوشیدہ رکھیں گے۔ جب تک کہ خدا کی قدرت کاملہ کے طفیل یہ خود بخود افشار نہیں ہو جاتا!۔ آپ دونوں مطمئن رہیں!۔ اور۔ جیسا کہ۔ ہاشم بھائی نے کہا۔ مفتی صاحب کے فتوے کے مطابق نکاح نامہ پر کوئی فرضی سنجیدہ سا نام والد مرحوم کی جگہ لکھوا دیا جائے۔ بس!"

"خدا کا شکر ہے کہ آج بڑا بوجھ دل پر سے ہٹ گیا!۔ اُف نوہ۔!" مکمشنر صاحب ایک کھکھلی سی ہنسی ہنسے "اس فکر میں میں نے راتوں کی نیندیں حرام کی ہیں اپنے کام خراب کیے ہیں اس پریشانی میں اپنا سکون چین کھویا ہے کہ اس اہم مسئلہ پر کس کی رائے لوں۔ کس سے پوچھوں۔ اب تم لوگوں نے بھی اطمینان دلا دیا ہے۔ واقعی بڑا سکون ہو گیا!"

"میں تو اس غم میں گھلتی ہوں کہ اگر خدا نہ کرے کبھی اس کے والدین کا پتہ چلے"۔ بیگم نے گلوگیر لہجے میں کہا "شادی کے سالہا سال بعد تک اولاد کو ترسی ہوں۔ وہ آسمانی تحفے کی طرح مجھے ملا ہے تب میں نے اولاد کی طرح اسے پالا پوسا۔ اس سے محبت کی ہے۔ وہ اب بھی میرا ہی بیٹا ہے۔ یہ کہو کہ وہ ضد کر کے فوج میں چلا گیا ہے!۔ جب تک اس کے خط نہیں آ جاتے۔ اس کی خیریت نہیں معلوم ہو جاتی۔ میرا کوئی پل آرام وسکون سے نہیں گزرتا! کبھی خیال آتا ہے کہ اگر قدرت نے اسے اس کے ماں باپ سے ملا دیا تو پھر میرے زندہ رہنے کی کون سی صورت ہو گی!"

"ایک زمانہ گزر گیا بھابھی" سعید صاحب نے کہا "انھیں ملنا ہوتا تو زندگی کے ان گنت راستوں پر کبھی تو ملتے۔ اب نجانے وہ کہاں ہوں گے۔ ہوں گے بھی کہ واقعی ختم ہو چکے ہیں۔ آپ اطمینان رکھیے۔ وہ آپ سے کبھی جدا نہ ہو گا!۔"

"تم لوگوں نے یہ قصہ سن کر اپنی رائے تو نہیں بدل دی۔؟" بیگم ہاشم نے

پوچھا: پہلے میں کہہ نہ سکتی تھی کہ روحی کو مجھے دے دو۔ کیونکہ صورت حال کچھ ٹھیک نہ تھی حالانکہ جب بھی روحی کو دیکھتی تھی، دل سے ہوک سی نکلتی تھی کہ خدایا کیا یہ پیاری سی بچی مجھے نہ مل سکے گی! اب اللہ نے میری سن لی ہے۔ وہ میرے دل کا سکون میری آنکھوں کی ٹھنڈک بن کر میرے گھر آجائے گی!۔ میری برسوں کی مراد پوری ہو جائے گی!"

تو پھر کیا خیال ہے۔ سعید میاں۔! "کمشنر صاحب کے بھاری بھرکم چہرے پر اب تازگی نظر آئی!: رات کو کھانے کے بعد منگنی کی رسم ادا کر دی جائے!۔ اور انشاء اللہ ہفتہ دو ہفتے بعد شادی ہو جائے!۔ ابھی موقع اچھا ہے۔ نوید اور سلمٰی بھی یہیں ہیں! مصطفےٰ کو بھی طویل مدتی چھٹی ہے۔ مطلب یہ کہ شادی کے بعد بھی تھوڑے دنوں سب ساتھ ساتھ رہیں! خیال ہے؟"

جی بہت بہتر! جیسی آپ کی رائے ہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں" سعید صاحب بے حد خوش ہو کر بولے۔

ایک جیتی جاگتی لاش کو آخری منزل پر پہونچانے کا فیصلہ کر کے انھوں نے دوسری باتیں شروع کر دیں۔ نوید نے جھک کر دروازہ کھولا اور سلمٰی چائے وغیرہ کے انتظام میں اٹھ کر چلی گئیں!۔

روحی کو ہمارے پاس لاؤ" کمشنر صاحب نے کہا: کیا وہ ہم سے پردہ کرے گی؟ شرماتی بہت ہے ہاشم بھائی۔ شاید ہی آئے!" آمنہ بیگم نے کہا۔

پھر سلمٰی چائے اور لوازمات لے آئیں ساتھ میں مصطفےٰ اور عبید بھی آگئے!۔

اب سعید صاحب اور ان کے بھائی بھاوج وغیرہ بے حد تعجب سے مصطفےٰ کو دیکھ رہے تھے جیسے وہ کوئی عجیب الخلقت چیز ہوں! کمشنر صاحب نے ان سب کی نظریں بھانپ لیں اور اس ڈر سے کہ خود مصطفےٰ بھی مارک نہ کرلیں۔ ہنس کر بولے۔

"میاں تمہاری عمر قید کا وقت آگیا۔ آج غلامی کا کڑا تمہارے یہ انکل تمہاری انگلی میں پہنا دیں گے۔ سمجھے۔ اب یہ خسر محترم ہیں۔ اٹھ کر کورنشات بجا لاؤ" یہ مصطفےٰ کا خوب صورت چہرہ لالہ فام ہوگیا! بہر حال وہ اٹھے اور سب کے سامنے جھک گئے۔ سید صاحب نے سر پر ہاتھ رکھ کر اول جلول سی دعا دیتے ہوئے سوچا! خدا جانے کس کے گھر کا چراغ تھا! قسمت نے کسی اور کی آغوش میں لا کے ڈال دیا۔ اور اب کہاں ہیں اس غریب کے اصلی ماں باپ۔ ابھی تک بے چارہ اپنی زندگی کے اس بڑے راز سے بے خبر ہے۔ یہی سمجھ رہا ہے کہ اس کے والدین مر کھپ چکے! نجانے چھوٹی سی عمر میں یہ اتنا بڑا غم کیسے سہا ہوگا کتنا رویا ہوگا اور اب کیا سوچتا ہوگا؟۔ مگر وہ بھی کیسے بے پرواہ اور غافل لوگ تھے کہ اسٹیشن کی بھیڑ میں چھوٹے سے بچے کو چھوڑ دیا! اور پھر ساری عمر اس کی خبر نہ لی۔ اسے کہیں تلاش نہ کیا؟ عجیب لوگ تھے۔ عجیب دنیا ہے!۔

رات کے کھانے کے بعد منگنی کی رسم تھی!۔ بھاگ دوڑ کر کے سعید صاحب نے ہار پھول اور مٹھائی منگوائی۔ زبیدہ اور سلمیٰ جا کر قیمتی انگشتری اور خوب صورت سی رسٹ واچ خرید لائے۔ کشور صاحب کی بیگم ایک عمدہ اور نہایت قیمتی ہیرے کی انگوٹھی پہنے تھیں وہ انھوں نے روحی کو پہنانے کے لیے منتخب کر لی تھی!۔

اسی گھر میں لڑکے اور لڑکی کی ایک جگہ رسم رکھی گئی تھی!۔ خاموش سی گھماگھمی تھی جیسے کہ سب غیر شعوری طور پر سوچ رہے تھے کہ جو کچھ ہو رہا ہے۔ اسے نہیں ہونا چاہیے تھا اور آپ ہی آپ خوب پچھتا رہے تھے!۔

جویریہ نے ساری خبریں روحی کو دے دی تھیں!۔ اور حیرت سے بولی تھی "روحی! تم تو کہتی تھیں کہ تم شکیل صاحب کی محبت میں خود کو بھول گئی ہو مگر یہ کیا۔ جب شکیل صاحب آئے تھے تم نے ان سے ملنے کی کوئی خواہش ظاہر

نہ کی۔ تم نے ایک نظر بھی ان پر نہ ڈالی۔ اب وہ بے چارے۔ کیا وہ تمہیں بے وفا عہد شکن نہ کہیں گے؟۔ تم نے ان سے کچھ کہا بھی نہیں۔ روحی! کم سے کم انھیں ایک آدھ سطر کا خط تو لکھ دیتیں۔ وہ تمہیں بھول جائیں!؟

جویریہ!؟ روحی نے عجیب سے بے حس لہجے میں کہا؛ لوگوں نے جذبۂ محبت کو اتنا روندا ہے۔ اسے اتنا استعمال کیا ہے کہ محبت کے اصلی خط وخال مسخ ہو گئے ہیں مگر وہ بنیادی طور پر فنا تو نہیں ہو گئی!۔ محبت بڑا مستحکم جذبہ ہے جو لی۔ وہ کبھی مرنے نہیں سکتا! اور میری محبت ایسی ہی ہے!۔ میں اب اس کا ڈھنڈورہ نہیں پیٹوں گی! لوگ آخرکار دیکھ ہی لیں گے۔ محبت مرتی ہے کہ محبت کرنے والے؟"

"کیا مطلب؟" جویریہ نے اسے بڑی وحشت سے دیکھا۔

"میں کہہ رہی تھی جولی کہ لڑکیاں ہمیشہ بڑی مظلوم جنس رہی ہیں۔ لڑکی کے ماں باپ ہمیشہ بڑے ظالم رہے ہیں۔ جہالت کے زمانہ میں یہ بے چاری زندہ دفن کردی جاتی تھی۔ زمین کے اندر۔ آج بھی زندہ ہی دفن کی جاتی ہے۔ زمین کے اوپر۔" یہ کہہ کر وہ جویریہ کی حیران سی شکل دیکھ کر ہنس پڑی۔

"بہرحال تم کچھ فکر نہ کرو۔ تم یہاں مدتوں بعد آئی ہو۔ مدتوں کے لئے چلی بھی جاؤ گی تمہاری دلچسپی کے لیے یہ بڑا خوشی کا موقعہ آیا ہے۔ جولی! تم ہنسو بولو گاؤ بجاؤ! مجھے اپنے ہاتھوں سے دلہن بناؤ اور کون ہے میرا ساتھی یہاں۔ ایک بے چاری نینا تھی۔ وہ بہت زمانہ پہلے زندہ دفنا دی گئی ورنہ آج وہ ہوتی تو اپنی سہیلی کو اتنی بڑی خوشی میں کتنا ناچتی گاتی خوش ہوتی! نجانے کہاں ہے۔ وہ مجھ سے خفا ہے۔ میں اس زندہ شہید کی تجہیز وتکفین میں جا نہ سکی تھی!۔ وہ بچی اور وہ یہ نہ سمجھ سکی کہ روحی بد نصیب مجبور کردی گئی تھی۔

وہ بھی مجھ سے روٹھ گئی۔ بڑی پیاری تینا۔!" اور پھر نجانے روحی کو کیا یاد آیا

وہ اچانک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی!

جویریہ سمجھ گئی تھی کہ اسے تینا کے پردے میں کس کی یاد ستا رہی تھی!۔

وہ چپ چاپ کمرے سے نکل گئی!۔

روحی نے تکیے کے نیچے سے شکیل کی تصویر نکالی اور آنسو بھری آنکھوں سے

تکنے لگی!۔ پھر وہ دیوانوں کی طرح بڑبڑائی۔

" برسوں گزر گئے، نہیں دیکھا۔ آواز نہ سنی۔ اب بھی کیا یونہی کلاسوں میں سب اکٹھا ہوتے ہیں۔ اب بھی سب مل کے ہنستے بولتے ہیں۔ تب کیا روحی کسی کو یاد نہیں آتی۔ وہ بھی یہیں بیٹھا کرتی تھی! آپ کو بھی نہیں!۔ ایک بار تو خبر لیتے۔ شکیل!۔ ایک دفعہ تو یہاں تک آ کر دیکھتے۔ کیا محبت کی بے چینی اسی وقت تک تھی جب تک روحی کی شکل سامنے تھی۔ اب کچھ بھی نہیں ہے!۔ نہ یاد نہ خیال۔ مگر۔ میں کیا جانوں۔ آپ کا دل اب بھی تڑپ رہا ہوگا! کسی مجبوری کا پہاڑ راستے میں آگیا ہے۔! یہی ٹھیک ہے۔ یہی ہوا ہے۔ ورنہ میں یہ بات کبھی نہیں مان سکتی کہ شکیل نے روحی کو فراموش کر دیا ہے؟۔ نہیں نہیں کبھی نہیں!۔

پھر وہ بڑے پیار سے تصویر سے باتیں کرنے لگی!۔

کیا آپ یہ سوچ سکتے ہیں کہ میں کسی اور کی ہو کر زندہ بھی رہ سکتی ہوں!۔ آہ دیوانے آدمی۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا!۔ میں جو خاموش ہوں۔ مٹی کی مورت بنی ہوں تو صرف اس لیے کہ۔ اپنے چاہنے والوں کو بھی اتنی ہی سزا دے سکوں۔ جتنی انھوں نے محبت کرنے کے جرم میں مجھے دی ہے۔ میں انھیں بھی اتنا ہی رلا سکوں۔ جتنا انھوں نے مجھے رلایا ہے۔

مگر تم نہ رونا۔ اور یہ بھی یاد رکھنا۔

پھولوں سے میری تربت ہرگز نہ تم سجانا!
راتوں کو چھپکے چھپکے رونا نہ آہ بھرنا
جاتے ہوئے یہاں سے تم سے ہے بس یہ کہنا
مجھ کو نہ یاد کرنا، مجھ کو نہ یاد کرنا

ہاں۔ تم اپنی زندگی کی روشن اور چمکیلی شاہراہ پر چلے جانا تمہیں کوئی نہ کوئی دوسری روحی مل ہی جائے گی!۔ مگر اتنا کرم مجھ پر کرنا کہ مجھے بے وفا نہ کہنا!"
کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور اس نے تصویر جلدی سے چھپا کر آنسو پونچھ لیے۔ آمنہ بیگم اور سلمیٰ تھیں!۔

روحی کے آنسو دیکھ کر آمنہ بیگم بھی پھوٹ پڑیں۔ اور اسے سینے سے لگا کر اس کے چہرے پر بوسے دینے لگیں!۔ مگر روحی اب خشک چٹان بن گئی تھی۔ ماں کی گریہ وزاری کے جواب میں بالکل خاموش رہی!۔

سلمیٰ دونوں کو سمجھانے لگیں!۔ بے معنی بے جان مردہ الفاظ میں۔ گھسے پٹے پرانے انداز میں۔ روحی نے تب بھی کچھ نہ کہا۔ بت بنی۔ بیٹھی رہی!۔

پھر جویریہ اس کا لباس لائی۔ بیگم ہاشم نے فی الفور خرید کر بھیجا تھا!۔ قیمتی زرکار گلابی ساڑی، چمکیلا بلاؤز، مارے ڈلارے کے وہ ایک قیمتی اور بہت عمدہ ساڈائمنڈ کٹ گلوبند کا سٹ بھی لے آئی تھیں!۔ ساتھ میں بہت سے ہار پھول تھے!۔

سلمیٰ نے جھجکتے ہوئے جویریہ سے کہا!۔

"جوبی! اب یہ تمہارا کام ہے کہ تم اپنی بہن کو یہ سب کچھ پہنا کر دلہن بنا دو!۔ اور پھر بڑے ہال میں لے آؤ!۔ ہاشم بھائی نے کہلوایا ہے کہ پہلے رسم ہو لے تو پھر کھانا ہوگا!۔ انہیں کسی جگہ جانا ہے!۔ جلدی کرو!"

آمنہ بیگم اور سلمیٰ اسے مڑ مڑ کر دیکھتی ہوئی کمرے سے چلی گئیں!۔ تب جویریہ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"یہ۔ یہ لباس پہن لو۔ روحی!۔ پھر۔ پھر میں تمہارے بال بنا دوں! شام کے سات بج چکے ہیں!۔ ایسا نہ ہو کہ دیر ہو جائے!"

"ہاں جونی۔ اب دیر بالکل نہیں ہونی چاہیئے۔!" روحی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ارے۔ تمہارا چہرہ کیوں سفید ہوا جا رہا ہے۔ تم کیا سوچ رہی ہو۔ لاؤ۔ کمشنر صاحب کے بھیجے ہوئے کپڑے اور گہنے کہاں ہیں!؟"

جویریہ کانپ سی گئی "روحی! یہ کیا۔ تم کچھ حواس تو نہیں کھو رہی ہو؟۔ تمہاری یہ ہنسی۔ تمہارا لہجہ۔ کیا میں چچی جان کو بلا دوں؟"

روحی نے مسکرا کر اس کے گال پر نازک سا تھپڑ رسید کر دیا "واہ۔ حواس کیوں کھوؤں گی۔ اتنا بڑا موقعہ خوشی کا میری زندگی میں آیا ہے۔"

باہر سے کسی نے آواز دی "دلہن کو جلدی باہر لاؤ۔ جویریہ! کیا کر رہی ہو تم" روحی جب گلابی زرکار لباس اور قیمتی گہنے میں دلہن بنی باہر آئی۔ تب کتنی نگاہیں اس پر لگ گئیں۔ وہ اتنی ہی حسین اور جاذب نظر لگ رہی تھی!۔

دالان میں بہت سے لوگ جمع تھے!۔ سامنے مصطفےٰ بھی عروسی لباس میں ملبوس بیٹھے تھے۔ خاصی شیروانی میں ان کا خوبصورت جسم کتنا بھرا بھرا اور پرکشش ہو رہا تھا۔

مہمانوں میں آمنہ بیگم کے بھائی بھاوج بھی تھے۔ بھاوج نے بڑا بھاری لباس پہن رکھا تھا۔ زیوروں میں غرق تھیں اور قہر آلود نظروں سے مصطفےٰ کو گھور رہی تھیں! ان کی زبان کی قینچی بھی چل رہی تھی۔ اور آمنہ بیگم کی ساری خوبیوں کو کترنی چلی جا رہی تھی۔ آمنہ بیگم کی خود رائی انھیں ذرہ برابر پسند نہ آئی۔ نہ ان سے مشورہ لیا نہ تذکرہ کیا۔ اور بیٹی کو غیروں میں بٹھانے بیٹھ گئیں!۔ روحی کو اس

طرح بنا سجا دیکھ کر ان کے سینے پر اژدہے لوٹ رہے تھے۔ اگر روپے پیسے کا لالچ کیا ہوتا تو یہ پیاری سی لڑکی ان کی بہو بنتی! اب تو چڑیاں چگ گئیں کھیت والا معاملہ تھا۔ لڑکی غیروں میں بیٹی گئی اور ان کے ناصر یونہی رہ گئے تھے۔ میجر مصطفےٰ ایران کی نظریں یوں پڑ رہی تھیں کہ جیسے ان بیچارے کو نظروں ہی سے چبا جائیں گی۔ ان کا مرعوب کن چہرہ، انکا اونچا عہدہ، انکا خاندان سب کچھ ایسا تھا جو انھیں سلگا رہا تھا!"

ناصر نے بالآخر ماں سے کہہ ہی دیا: "آپ اس قدر جہیز کا شور نہ مچاتیں تو آج ان میجر صاحب کی جگہ میں ہوتا! آخر آپ کی عزیز بھانجی دوسروں کی ہو گئی نا۔"

"ابھی وقت ہے۔!" بھاوج نے مستعدی سے کہا: "تم اشارہ کر دو تو آن کی آن میں زمین آسمان ایک کر دوں! پتہ چل جائے آمنہ اور اس کے میاں کو!۔ دیکھوں لڑکی کس طرح غیروں میں جاتی ہے!"

"ہرگز نہیں!" ناصر نے کہا: "اب آپ خبردار کسی سے کچھ نہ کہئے گا!۔ اپنی بےعزتی کرانے کا شوق ہے آپ کو! رسم ہو لے تو آپ فوراً گھر چلئے!"

کچھ شام گہری ہو چلی تھی تب بڑی سادگی سے منگنی کی رسم ادا کی گئی! بیگم ہاشم نے اپنی ننھی منی بہو کو ہیرے کی انگوٹھی پہنائی تھی۔ سعید صاحب نے مصطفےٰ کو انگشتری اور گھڑی عطا کی۔ آج انھوں نے اپنے بزرگ ہونے کا زعم پورا کر دکھایا تھا۔ مقابلہ بیٹی سے تھا۔ وہ ہار گئی تھی! سعید صاحب روحی کا غرور اس کی ضد توڑ کر بہت خوش تھے!۔ اسے بدنامی، رسوائی اور انگشت نمائی۔ سے محفوظ کر دیا تھا!۔

اب وہ بار بار اسے اور مصطفےٰ کو دیکھ رہے تھے۔ جو تخت پر بچھی زرنگار چادر پر پاس پاس بیٹھے انھیں بہت خوب صورت لگ رہے تھے۔ لوگوں نے

انھیں ہار پھول سے لاد دیا!۔ روحی کا سر جھکا ہوا تھا۔ مصطفےٰ ابھی دانستہ مسکرا رہے تھے۔ اور دل میں سوچ رہے تھے کہ آج جبکہ ان کی دلی آرزو پوری ہو رہی ہے وہ خوش نہیں ہیں۔ سینے پر ایک بوجھ سا دھرا معلوم ہوتا ہے۔ ذہن میں سناٹے سے چھا رہے ہیں۔ یہ خوشی بہ صحیح معنوں میں خوشی لگ رہی ہے تب یہ معصوم سی لڑکی اپنے دل میں کیا سوچ رہی ہوگی۔ جس کے خواب چکنا چور ہو چکے ہیں۔ جس کی آمنگیں پامال کی گئی ہیں۔ جس کی معصوم رنگین بہاروں میں آگ لگا دی گئی ہے۔ اُف! مجبوری بڑی بری چیز ہے!۔

جب بیگم ہاشم کے حکم پر انھوں نے اس کا ننھا سا مومی ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تھا!۔ تب وہ برف ہو رہا تھا! انگوٹھی پہنانے سے پہلے وہ دیر تک سوچا کیے تھے!۔ اور اس ہاتھ کی سردی مصطفےٰ کے بھاری بھرکم بدن میں آہستہ آہستہ اترتی چلی گئی تھی!۔

ڈنر کے بعد مہمان رخصت ہوئے! کمشنر صاحب اور بیگم بھی روحی کو سینے سے لگا کر اسے خوب سے پیار کر گئے اور جلد اپنے گھر آنے کی دعا دے کر سدھارے لیکن عبید نے مصطفےٰ کو روک لیا۔ دونوں باہر برآمدے میں چلے گئے!۔

عبید ڈھولک کے گیتوں کے کیسٹ اٹھا لایا۔ اور گیت سن سن کے قہقہے لگانے لگا! مصطفےٰ اس کی خاطر بیدلی سے ہنس رہے تھے۔

اب گیت جاری تھا۔

دولھا گاؤں کا گنوار دلھن بولتی بھی نہیں۔

"کیا لغویت ہے!" عبید بولا اور ٹیپ ریکارڈر آف کر دیا۔ "کہیں آپ ناراض نہ ہو جائیں!۔ حالانکہ آپ گاؤں کے نہیں ہیں!۔

پھر وہاں نوید آ گئے! اور ان میں دوسری گفتگو ہونے لگی!۔

"مصطفٰے کیا تم جلدی چلے جاؤ گے؟" نوید نے پوچھا۔ جب سے ان لوگوں کو ان کی ذات سے وابستہ ٹریجڈی کا علم ہوا تھا۔ جس کا علم خود مصطفٰے کو نہیں تھا۔ ان سب کی محبت اور ہمدردی ان سے بہت بڑھ گئی تھی۔ وہ انھیں محروم القسمت اور بدنصیب سمجھتے تھے!۔ انجان بے خبر معصوم سا آدمی۔ با مروت، شرافت کا پیکر ہنس مکھ خوش مزاج، مصطفٰے چاہے جانے کے قابل انسان تھے!۔

اب میں نے ارادہ بدل دیا ہے نوید بھائی!" مصطفٰے نے ان کا نفس مطلب سمجھ کر جواب دیا "ابھی میں بہت دنوں تک یہیں رہوں گا!۔

یہی میں چاہتا بھائی کہ ہدوجی یکبارگی۔ دور نہ چلی جائے!" نوید کچھ خجل سے ہوکر بولے۔

نہیں نہیں! آپ اطمینان رکھیے۔ مجھے خود بھی تو خیال ہے۔ انھیں ہم سب سے اور نئے ماحول سے مانوس ہونے کے لیے کچھ وقت ضرور ملنا چاہیے!۔" مصطفٰے کے اس جواب نے ان کا درجہ نوید کی نظر دل میں بہت بلند کر دیا تھا۔

عبید باتیں کرتے کرتے اکتا گیا تو اٹھ کر سونے چلا گیا!۔ مصطفٰے نے سگریٹ سلگایا اور اٹھ کر منڈیر کے قریب آئے۔ نیچے باغ کا منظر بہت دلفریب ہو رہا تھا!۔ گرما کی یہ رات بہت خوبصورت تھی۔ آسمان کی شفاف نیلاہٹوں میں چاند پوری آب و تاب سے جگمگا رہا تھا!۔ مصطفٰے ادھر ہی سے باغ میں اتر گئے!۔ ملول اور مغموم سے ناسمجھ دل کو بہلانے کی خاطر!۔ انھوں نے بڑے حوض کے پیچھے بیٹھ کر خنک دیوار سے پیٹھ ٹیک دی! اور معطر ہوائیں ان کے آس پاس گنگنانے لگیں!۔ کہیں قریب ہی موتیے کے جھنڈ پر مکمل بہار چھائی ہوئی تھی۔ خوب پھولا تھا! اور اس کی تیز مہک عجیب عجیب سے ہیجان خیز جذبوں کو ابھار رہی تھی!۔

مصطفٰے سگریٹ لبوں تک لائے اور تیز چاندنی نے ان کی نئی گھڑی اور انگوٹھی

کو چمکا دیا۔ ان کے ہاتھ خلا میں رک گیا!۔ اور آنکھیں گھڑی اور انگشتری پر گڑ گئیں۔!

پھر یکبارگی۔ مصطفےٰ کا دل غم و مسرت، تشکیک و یقین، اور ہاں یا نہیں کے بحر عمیق میں ڈوبنے ابھرنے لگا!۔ ان کے دماغ میں گوناگوں اندیشوں کا طوفان آیا ہوا تھا۔ ایک خوبصورت مستقبل ایک حسین زندگی کا تصور اگر انھیں آمادہ بہ تبسم کر رہا تھا تو دوسری طرف اندیشہ ہائے دور دراز کی مسلسل نیش زنی۔!

اگر روحی اس وابستگی کو دل سے قبول نہیں کرتی تو پھر۔؟ اور اس کے آگے تاریکی میں بڑا سا سوالیہ نشان ناچ رہا تھا!۔

"تو کیا۔ زندگی کا یہ سودا کچھ گراں پڑا تھا؟"

دفعتہً انھیں حوض کی دوسری طرف سے دو آوازیں سنائی دیں۔ انھوں نے فوراً پہچان لیا۔ ایک آواز جویریہ کی تھی دوسری روحی کی!۔ شاید وہ بھی اندر کی گھٹی ہوئی فضا سے گھبرا کر چاندنی کا لطف اٹھانے آئی تھیں مگر نہیں۔ مصطفےٰ کا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ جویریہ کہہ رہی تھی۔

"اب یہاں تو تمھیں ذرا سکون ملے گا! کیا تو انگوٹھی پہنتے ہی پاگلوں کی طرح ہنسنے لگی تھیں۔ کیا اب رو رو کر بے حال ہو رہی ہو۔ روحی! تمھیں میری قسم چپ ہو جاؤ۔ دیکھو تمھارا ہاتھ گرم ہو رہا ہے۔ تمھاری پیشانی تپ رہی ہے تمھیں بخار معلوم ہو رہا ہے۔ روحی۔ اتنی پریشان کیوں ہو میری بہن۔ کیا ہو رہا ہے تمھیں۔ مجھ سے تو کہو۔ کیا تمھیں مجھ پر بھی بھروسہ نہیں ہے؟"

جواب میں سسکیاں سنائی دیں "یہ خیالوں کا بخار ہے۔ جولی میں تمھیں کیا بتاؤں۔ میں بہت کچھ سوچنا چاہتی ہوں۔ مگر کسی سوچ کا سرا میری گرفت میں نہیں آتا۔ میں سچ مچ پاگل ہو جاؤں گی۔ جولی۔ دیکھو۔ میرا ہاتھ اور میری پیشانی ہی نہیں تپ رہی ہے۔ میرا دل بھی تپ رہا ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے... میں اپنے آپ کو کیونکر تسلی دے سکوں گی۔ ہائے!
یہ تو میں نے سوچا ہی نہ تھا!"

روحی! اب بچپنے کی باتیں مت کرو۔!" جویریہ نے کہا۔ "تم پڑھی لکھی سمجھدار ہو۔ اپنی
الجھنوں کا حل خود بھی تلاش کر سکتی ہو۔ اور یہ تو سوچو کہ تم ایک شریف معزز
اونچے گھرانے کی فرد ہو۔ تمھاری بھی ایک پوزیشن ہے۔ کیا ان سب باتوں کا خیال
کرنا اور خود پر قابو پانا تمھارا فرض نہیں ہے!۔ تم جاہل لڑکیوں کی طرح
آنسو بہاتی اچھی نہیں لگتیں!۔ اگر تمھارا حال یہی رہا تو کیا سوچیں گے۔ سب
لوگ، اب تم ایک نئی شخصیت ہو روحی۔ نئی لڑکی!"

ہاں جوئی!۔ یہ سب سچ ہے۔! میں خود کو بدلنا چاہتی ہوں!" روحی کی
بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔! "لیکن میں نے تم سے کہا تھا کہ میں شاید شکیل
کو زندگی بھر نہیں بھول سکتی! جویریہ! کیا تم نے انھیں نہیں دیکھا۔ سچ بتا!
کیا وہ بھلائی جانے والی شخصیت ہے؟ نہیں!۔ میں چاہے ساری عمر مسکراہٹوں
کا جھوٹا نقاب چہرے پر ڈالے رکھوں مگر میرا دل ہمیشہ روتا رہے گا۔ شکیل کو
پکارتا رہے گا!۔ آہ۔ جوئی۔ زندگی کے راستے بہت پُر پیچ ہیں۔ اگر کبھی کسی موڑ
پر شکیل کا سامنا ہو گیا۔ تو کیا ہو گا! میں کیا صورت دکھاؤں گی انھیں اور وہ کن
نظروں سے مجھے دیکھیں گے؟۔ تب اپنی بد عہدی، بے وفائی اور رنگینگی پر ڈوب
نہ مروں گی میں!؟۔

"کیا تم نے شکیل صاحب سے وعدہ کیا تھا کسی بات کا؟" جویریہ نے خائف
ہو کر پوچھا۔

"وعدہ صرف زبان ہی سے تو نہیں کیا جاتا" روحی بولی "انسان جب کسی
سے محبت کرتا ہے تو اس کی ہر چیز محبت کا اظہار کرتی ہے۔ ہر ادا سے محبت

ظاہر ہوتی ہے۔ جوئی۔ کاش تم نے بھی کسی سے محبت کی ہوتی !"

ہوں !۔ تو پھر۔ اب کیا سوچا ہے تم نے ؟" جویریہ نے کہا۔

کیا سوچوں۔ اب سوچنے کو باقی کیا رہا ! اب تو میں خود کو اتنی سنگدل، اتنی بے حس اور اتنی ریاکار بنانے کی کوشش کروں گی کہ کسی کو دھوکا دے سکوں ساری زندگی کا طویل دھوکا۔ جنت کا پُر فریب کھیل۔ اس بے خبر انسان سے جو میری زندگی کا مالک بنا دیا گیا ہے۔ اس کا کیا قصور۔ لیکن میں اپنی منافقت کی سزا ساری عمر انجان اور بے خبر مصطفےٰ صاحب کو دیتی رہوں گی ! اور لمحہ لمحہ کی موت مرتی رہوں گی !" روحی نے کہا۔

ہاں روحی مصطفےٰ صاحب بہت اچھے آدمی ہیں !" جویریہ نے کہا۔ "مجھے وہ پسند ہیں۔ اب تم سے میری بھی التجا ہے روحی کہ اس خبط کو دل سے نکال دو۔ شکیل کی یاد کو اگلی زندگی کا عذاب نہ بناؤ اور کوشش کرو کہ تم مصطفےٰ صاحب کے ساتھ خوش رہ سکو"

جویریہ ؟ !"

ہاں۔ !"

تمہیں مصطفےٰ صاحب پسند ہیں۔ !

اچھے آدمی سب کو اچھے لگتے ہیں !۔

"تو جویریہ تم نے پہلے ہی انھیں اپنی زندگی کا ساتھی کیوں نہ بنا لیا ؟ "

روحی تم سچ مچ پاگل ہو گئی ہو" جویریہ کی آواز تیز ہو گئی "بے حد عجیب الٹی پلٹی باتیں کر رہی ہو۔ اب اٹھو۔ یہاں ہوا میں خنکی آ چلی ہے۔ تمہیں بخار ہے کہیں بڑھ نہ جائے !۔ اندر چلو اور آرام کرو !"

جویریہ ؟۔

ارے کیا ہو رہا ہے تمہیں روحی۔ ! کیوں دیوانی بنی جا رہی ہو۔ یہ آنسو یہ

ہچکیاں یہ بخار۔ آخر تمھارا حشر کیا ہوگا!" جویریہ نے اسے ڈانٹ دیا۔
"حشر؟" روحی کی جلی ہوئی ہنسی سنائی دی۔ "پاگل! بڑی بقراط بنتی ہو! ارے پھر یہ ہیرے کی انگوٹھی آخر کس مرض کی دوا ہے۔ جب دکھوں کا بوجھ مجھ سے سنبھالا نہ جائے گا تو پھر۔؟"

روحی۔ خدا کے واسطے ہوش میں آؤ" جویریہ نے اسے جھنجوڑا۔ "تم حد سے گزری جا رہی ہو۔ یہ بات اچھی نہیں!"

ارے ابھی نہیں مروں گی جولی۔ تم اطمینان رکھو!"

اچھا اب اٹھو چلو۔ شاید ساڑھے بارہ بج چکے ہیں!

"تم جاؤ آرام سے سو رہو! مجھے ٹھنڈی ہوا اچھی لگ رہی ہے۔ میں کچھ ٹھہر کے آؤں گی۔ خدا کے واسطے جولی۔ جاؤ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ جاؤ!"

مصطفیٰ کے لیے اب وہاں بیٹھنا دوبھر ہوگیا! یہ عجیب بات تھی کہ کچھ دیر پہلے کے بکھرتے ہوئے ان کے دماغی طوفان اب بالکل معدوم ہو چکے تھے۔ ذہن کی تمام الجھنیں اور خلشیں مٹ چکی تھیں۔ اور اب وہ حیرت انگیز حد تک پرسکون تھے! پھر بھی انھوں نے ضروری سمجھا تھا کہ اس تنہائی میں روحی سے کچھ باتیں کرلیں اپنی طمانیت اپنا سکون تھوڑا سا اسے بھی بخش دیں! آخر وہ ان کی منگیتر ہے بھی تھوڑی سی دیر کے لیے سہی! ان سے منسوب تو ہوئی تھی! وہ اٹھے اور یکبارگی اس کے سامنے بیدھڑک چلے جانے کی بجائے پچھلی طرف سے چکر کاٹ کر یوں سامنے کی روش پر نمودار ہوئے جیسے اپنے کمرے کا زینہ اتر کے آرہے ہوں! وہ آگے بڑھتے رہے

اور روجی کے فرار کی راہیں مسدود ہوتی رہیں!۔ وہ حیران حیران آنکھیں کھولے اُنھیں دیکھ رہی تھی اور اسکے دل کی دھڑکنیں آہستہ آہستہ تیز سے تیز تر ہوتی چلی جا رہی تھی کہ وہ بالکل پاس آگئے! اور بڑی حیرت سے بولے۔ اس لہجے میں جس میں تصنع اور بناوٹ کا شائبہ نہ تھا!۔

"اوہو! روجی! تم ہو! غالباً یہ حسین چاندنی تمھیں یہاں تک لے آئی ہے! وہ ہنسنے لگے! ایسی مخمور کن نسیم مجھے بھی اپنے کمرے سے نکال لایا ہے۔ کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟"

روجی کو موہوم سا شبہ بھی نہ ہوا کہ انھوں نے اس کی ساری باتیں سن لی تھیں۔ وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ ابھی ابھی اپنے کمرے سے چلے آرہے ہیں! پھر بھی شرم و خوف کے جذبوں سے وہ پوری طرح مغلوب ہو چکی تھی!۔ اس کا دل سینے کی وسعتوں میں ٹکراتا پھر رہا تھا اور ہاتھ پیر برف ہو رہے تھے۔ اپنے خشک لبوں کو تر کر کے وہ بڑی آہستگی سے بولی تھی!۔

"جی!" اور بدن چرانے لگی۔

"مطلب یہ کہ یہاں بیٹھ سکتا ہوں!" وہ چپکے سے ہنس کر بولے۔ اور لباس سمیٹ کر روش پر بیٹھ گئے!۔

جی ہاں!" روجی نے پسینہ پسینہ ہو کر کہا اور آنچل اپنے سر پر اوڑھ لیا۔ اس کی یہ ادا اتنی مسحور کن اور پیاری تھی کہ عسکی اسے تکتے رہ گئے اور اپنا وہ سبق جو اتنی دیر میں وہ رٹ کے آئے تھے۔ سب بھول گئے! تیز چاندنی میں روجی بڑی ہوشربا اور دلفریب ہو رہی تھی!۔ اس کا گورا گورا حسین چہرہ چاند کی کرنوں میں اس طرح چمک رہا تھا کہ لگتا تھا کہ چاندنی اس کے عارضوں سے پھوٹ رہی تھی۔ اس کے یاقوتی لب نیم وا تھے۔ اس کے ڈھیر سیاہ معطر بال ڈوپٹے کی حد سے بغاوت کر کے کچھ پیشانی پر کچھ گالوں پر اور بہت سے کندھوں پر آگرے

تھے۔ سیاہ بالوں کے ہالے میں اس کا چہرہ زیادہ قیامت آفریں اور من موہنا لگ رہا تھا!۔

یہ حسن۔ یہ حسن آفریں پیکر۔ شاید اب میرا نہیں رہ گیا مصطفےٰ کے ذہن میں روحی کی باتوں کی بازگشت گونجی۔ انھوں نے بڑی تکلیف سے سوچا کہ اس کے ننھے سے دماغ اور کمزور سے دل میں کتنی آندھیاں چل رہی ہیں۔ کتنے بڑے غموں کو وہ بڑی ہمت سے پوشیدہ رکھے ہوئے ہے۔ اس نے اپنی زندگی کا نصب العین کچھ اور بنا رکھا ہے تاکہ وہ ان کے ساتھ حیات کی سنگلاخ راہوں پر شانہ بشانہ چل سکے!۔ وہ اپنی گمنام دنیا تمام محبت کا مزار بنا چکی ہے!۔

لیکن وہ خود۔ کیا وہ اتنے کم ظرف، کم بیں، سطحی اور خود غرض انسان تھے کہ ایک مجبور محبت کے مزار پر اپنی زندگی کا خوب صورت محل تعمیر کرتے!۔ نہیں!۔ محبت ہمیشہ قربانی مانگتی ہے۔ روح و جسم کی، تو پھر ایک قربانی ان کی خوشیوں کی سہی! کسی سے کچھ لینے میں وہ مسرت حاصل نہیں ہوتی۔ جو کسی کو کچھ دے کر محسوس ہوتی ہے!۔

مصطفےٰ کی روح بڑی ہلکی پھلکی ہوگئی!۔

انھوں نے سادگی سے پوچھا: "اتنی چپ چاپ کیوں ہو۔ روحی؟ کچھ باتیں کرو۔ میں تو تم سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن کبھی ایسا موقعہ ہی نہیں آیا۔ تم نے کبھی موقعہ دیا بھی نہیں! لیکن۔ اس وقت۔ دیکھو روحی موسم اتنا حسین پرکشش ہو رہا ہے کہ اب زیادہ دیر تک خاموش بیٹھنا ممکن نہیں معلوم ہوتا کچھ تو کہو۔ کیا تم مجھ سے شرما رہی ہو؟۔ ارے:: وہ پھر ہنسنے لگے! "کیا تم مجھے کوئی نیا آدمی سمجھ رہی ہو؟"۔

مصطفےٰ کی سمجھ میں خود نہیں آرہا تھا کہ ان کے منھ سے بے ربط سا کیا نکل رہا تھا

رضی چپ رہی!۔

مصطفٰے نے گڑبڑا کر پوچھا: میں سگریٹ سلگا لوں۔ اس کی بو اور دھواں تمھیں گراں تو نہیں گزرے گا؟۔

جی نہیں!" رضی نے کہا اور آہستہ آہستہ خود پر قابو حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگی!۔ انھوں نے سگریٹ سلگا کر ایک گہرا کش لیا اور دھوئیں کا بادل سا فضا میں چھوڑ دیا۔

رضی۔؟

جی!"

اگر اجازت دو تم سے ایک بات پوچھوں؟۔

جی!۔

جی کیا؟۔

"پوچھیے!"

"رضی! دیکھو موسم تو دعوت یہ دے رہا ہے کہ یہاں تنہائی میں پیار بھری باتیں ہوں۔ آگے کے لیے عہد وپیمان کیے جائیں۔ کچھ ناز برداریاں ہوں۔ کچھ پرستاریاں ہوں۔ لیکن۔۔ دل کی یہ طفلانہ ضد یں دماغ نہیں مان رہا ہے وہ کہہ رہا ہے کہ۔ حقیقتوں کا اظہار کرو۔ اور حقیقتوں کو قبول کرو۔ رضی۔ سچ تو یہ ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں تم سے کیا کہنا چاہتا ہوں۔ دراصل میں ایک خرچی ان گھڑ سا آدمی ہوں۔ ادبیت سے مجھے کچھ لگاؤ نہیں۔ تم ادبی لڑکی ہو۔ شاید تمھیں میرا انداز گفتگو بھی اچھا نہ لگے! لیکن پھر بھی۔ میں کوشش تو کرتا ہوں کہ اپنا مطمح نظر اور نفس مطلب تم پر واضح کر سکوں! مگر ایک بات کا وعدہ پہلے کرو کہ۔ سب کچھ سن کر تم کچھ برا تو نہیں مانو گی؟"

اب ردحی بڑی حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی! اس کی کالی کالی متوالی آنکھیں، مصطفےٰ کا صبر ذرا ذرا چھین رہی تھیں۔ لیکن انھوں نے رخ پھیر لیا اور دیر بناوٹی سی کھانسی کھانس کر بولے۔

کہا نہیں تم نے؟ سب کچھ سن کر تم مجھے برا بھلا تو نہیں کہو گی۔ مجھے نکما، بزدل اور ڈرپوک تو نہیں سمجھو گی؟"

آپ۔ آپ ایک فوجی میجر ہیں۔ بھلا آپ بزدل اور ڈرپوک کیسے ہو سکتے ہیں! ردحی نے بہت سوچ سوچ کر اپنی دانست میں بڑی معقول بات کہی۔

بعض جذبے اتنے بہادر ہوتے ہیں کہ وہ سپاہیوں کو بھی پچھاڑ دیتے ہیں!" مصطفےٰ نے ہنس کر کہا۔

تو پھر کہیے!" ردحی نے کہا۔

"یہ جو سانحہ ہم پر تم پر سر شام گزرا ہے۔ تمھیں کیسا محسوس ہوا؟" مصطفےٰ نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ردحی نے پلکیں جھکا لیں اور سوالیہ لہجے میں بولی۔

"سانحہ۔؟"

ہاں ناگوار بات کو سانحہ کہیں گے اور خوشگوار بات کو تقریب!" مصطفےٰ نے کہا۔ "اب میری بات کا جواب دو! میں تو اسے سانحہ کہوں گا کیونکہ یہ جو کچھ ہنگامہ ہوا تھا۔ اس میں میری پسند، مرضی اور ذاتی سی رائے کا بھی تعلق نہ تھا!"

تو کیا آپ۔!" ردحی بوکھلا گئی۔

معاف کرنا۔ ردحی۔ تم بے شک بہت اچھی ہو۔ بہت پیاری ہو۔ کوئی انسان تم سے دائمی وابستگی پر خود کو دنیا کا خوش قسمت انسان سمجھ سکتا ہے۔ لیکن۔ ردحی۔ جہاں۔ کچھ دل کا۔ مطلب یہ کہ۔ ذاتی پسند کی بات آجاتی

ہے وہاں بڑوں کی مداخلت اور مرضی، سانحے، حادثے کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ اور اگلی زندگی کا رخ ہی بدل جاتا ہے تو پیاری روحی۔ مجھے یہ سب کچھ کہنے کے لیے معاف کر دینا کہ۔ میری پسند۔ تم نہیں۔ کوئی اور ہے۔!" ان کے دل میں ایک چبھن سی ہوئی۔ وہ رک گئے!۔

روحی ہکا بکا سی دم بخود انھیں تکے جا رہی تھی!۔

تم پوچھو گی کہ پھر میں نے پہلے ہی کیوں نہ کہا؟" انھوں نے لاتعلقی سے سر جھٹکا کر ایک سگریٹ سے دوسرا سلگایا اور بے پروائی سے سلسلہ مکمل کیا "تو میں کس سے کہتا۔ تمھارے بزرگوں سے کہنے کی ہمت نہیں۔ باجی اماں سے اس لیے نہیں کہہ سکا کہ انھوں نے بچپن سے مجھے اپنے بیٹے کی طرح پالا پوسا ہے۔ ان گنت تمنائیں مجھ سے وابستہ کر رکھی ہیں۔ میں ان کی خواہش کو ٹھکرانے کا گناہ نہیں کر سکتا!۔ اب یہ اہم ذمہ داری تمھاری ہے کہ میری طرف سے یہ بات سب سے تم کہو گی!"

نہیں نہیں!۔ خدا کے لیے اتنی لرزہ خیز ذمہ داری مجھے نہ سونپئے!۔ میں کسی سے ایک لفظ نہیں کہہ سکتی!۔ آپ مجھے اتنا بہادر کیوں سمجھتے ہیں؟" روحی اپنی تقدیر کے اس انقلاب پر ششدر رہ گئی تھی!۔ یہ تو اس نے خواب میں بھی گمان نہ کیا تھا کہ اس طرح راہ خود بخود ہموار ہو جائے گی!۔

مصطفےٰ نے آنکھیں نیم باز کر کے ایک گہرا کش لیا جیسے کچھ سوچنے لگے ہوں پھر زیر لب بڑبڑائے۔

"یوں بھی ایک فوجی کی زندگی غیر یقینی ہوتی ہے۔ ابھی ہے ابھی نہیں آج خوش و خرم گھر میں موجود ہے۔ کل کسی محاذ پر پہونچ گیا۔ اس پر بم گرا اور اس کے چیتھڑے اڑ گئے!۔ باجی اماں یہ سب کچھ سن کر خود آگ

رونے لگتی ہیں۔ ماں کا دل۔ اُف توبہ۔ اچھا تو روحی۔ معاف کرنا۔ اگر میں نے تمھارا دل دکھایا ہو۔ چونکہ میں خود کو اور تمھیں دھوکے میں رکھنا پسند نہیں کرتا۔ اس لیے۔ یہ سب کچھ کہنے پر میں مجبور تھا!" وہ اٹھ گئے۔ ساتھ میں خیالات کے بھنور میں چکراتی نیم بے ہوش نیم جان سی روحی بھی اُٹھ کھڑی ہوئی!

"ہاں وہ۔!" مصطفٰے نے چند قدم آگے جاکر پھر واپس آتے ہوئے جیسے کچھ یاد کر کے کہا "تمھارے پاس وہ انگوٹھی ہو گی جو باجی اماں نے تمھیں پہنائی ہے روحی؟"

"ذرا دنیا۔ میں نے اچھی طرح دیکھی نہیں تھی۔!"

روحی نے سوچے سمجھے بغیر انگشتری اتار کر ان کی طرف بڑھادی۔! مصطفٰے نے انگوٹھی لی اسے یونہی الٹ پلٹ کر دیکھا اور جیب میں رکھ لی؟ وہ ان کی بارہا کی دیکھی ہوئی تھی! لیکن کسی طرح روحی کے قبضہ سے انگشتری حاصل کرنا تھا!۔

"معمولی سی ہے۔ تمھارے پاس تو ہیرے کی کئی انگوٹھیاں اور ہوں گی" انھوں نے کہا۔

"جی نہیں!" روحی سادگی سے بولی۔ "میرے پاس کوئی انگوٹھی ہیرے کی نہیں ہے"

"یہ میں رکھے لیتا ہوں۔!" انھوں نے کہا "میں تمھیں بہت خوبصورت انگوٹھی لا دوں گا۔ لیکن بحیثیت ایک دوست کے۔ اس کا مقصد معنی خیز نہیں ہوگا!۔ اچھا روحی۔ اب میں چلتا ہوں۔ چاند نے اپنا سفر پورا کرلیا۔ اب یہاں کوئی دلکشی نہیں رہی۔ تم بھی جاکے سو رہو۔ شب بخیر!"

انھوں نے پیشانی تک ہاتھ اٹھا کر اسے سلام کیا اور ہنستے ہوئے چلے گئے!۔ مڑ کر بھی نہیں دیکھا کہ روحی کھڑی۔ ہے کہ چلی گئی!۔

وہ صبح بڑی ہنگامہ خیز تھی جو سعید صاحب کے بنگلے میں طلوع ہوئی تھی! روحی ساری رات سو نہ سکی تھی۔ اور صبح نماز کے وقت ہی اس نے ساری باتیں جویریہ سے کہہ دیں۔ جویریہ اتنی دہشت زدہ ہو گئی تھی کہ فوراً سلمیٰ کے پاس بھاگی گئی۔

وہ وضو کر رہی تھیں۔ جویریہ نے ان کے کان میں کہا "آپ نے سنا۔ چچی! مصطفےٰ صاحب نے منگنی توڑ دی۔ اور روحی سے اسے پہنائی ہوئی انگوٹھی بھی واپس لے لی ہے!"

"کیا۔؟" سلمیٰ کے ہاتھ سے لوٹا چھوٹ گیا۔

"جی۔ روحی تو ساری رات سو نہ سکی!۔ کہہ رہی تھی کہ مصطفےٰ صاحب کو یہ رشتہ پسند نہیں ہے!" جویریہ نے لمبی لمبی پلکیں جھپکائیں!۔

انھوں نے لوٹا چوکی پر پٹخا اور اندر بھاگیں!۔ جویریہ ان کے پیچھے بھاگ کھڑی ہوئی۔

"یا اللہ۔ خیر تو ہے۔ یہ ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں چہرے پر!" آمنہ بیگم نے پوچھا۔ نماز کے لیے سر پر دوپٹہ لپیٹ رہی تھیں! پاس ہی سعید صاحب کھڑے تھے۔ ہاتھ میں ٹوپی لیے مسجد جانے والے تھے!۔

"کیا ہوا۔ کیا بات ہے۔ آپ سب لوگ کیوں اس قدر سراسیمہ سے ہیں!" وہاں نوید بھی آ گئے!۔

"بولو۔ جویریہ!" سلمیٰ نے کہا۔

اب سب کے سب جویریہ کو دیکھنے لگے!۔ وہ سہم کر ہکلانے لگی!۔ اور بدقت بولی۔

"روحی۔ کہہ رہی تھی۔ کک کہ۔ رات۔ مصطفےٰ صاحب نے اس سے کچھ باتیں کہی تھیں۔ اور۔ انھوں نے۔ اپنی منگ۔ منگنی توڑ دی۔ اور۔ وہ انگوٹھی جو روحی

کو۔ پہنائی تھی۔ انگلی سے اتار کر لے گئے!"

کیا۔ کیا مطلب۔ ؟" سب کی زبان سے نکلا اور سب پر ردعمل بھی الگ الگ ہوا۔ آمنہ بیگم بھونچکا تھیں۔ سلمیٰ پریشان، سعید صاحب حیران، نوید کا چہرہ فق تھا۔ سب کی زبانیں گنگ ہو چکی تھیں۔

"تت۔ تم نے کچھ غلط تو نہیں سنا؟" پھر نوید ہی نے سنبھالا لیا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ رات۔ ہم لوگ دیر تک گفتگو کرتے رہے تھے۔ تب تو شائبہ تک نہیں ہوتا تھا کہ ان کا ارادہ اس قسم کا بھی ہو سکتا ہے!۔

"مصطفےٰ ہیں کہاں؟" سعید صاحب نے کہا۔

"عبید ہی کے کمرے میں سو رہے تھے!" نوید نے کہا۔

"لغویت کی انتہا ہے" سعید صاحب نے بگڑ کر کہا۔ "ان کا اس قسم کا کوئی بیہودہ ارادہ بھی تھا تو انھیں چاہیئے تھا کہ مجھ سے کہتے! ہفتہ بھر سے اس طرح کی ضروری گفتگو ان کے سامنے کی جا رہی تھی!۔ تب بھی انھوں نے اشارتاً بھی اپنی ناپسندیدگی واضح نہ کی تھی۔ اور اب۔ جبکہ رسم ہو چکی تھی۔ انھیں دلشکن یا ئیں بےچاری اردگی سے کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی تھی! کیا سوچا ہوگا اس نے۔ اتنا بھی خیال انھوں نے نہ کیا۔

جویریہ؟۔!"

"جی!" وہ ڈر کر بولی۔

"اب کیا کر رہی ہے وہ جی؟" انھوں نے نہایت غصے سے کہا "رو رہی ہے کیا؟"

"جی نہیں!۔ رو تو نہیں رہی ہے!" جویریہ بولی۔

"یہ بیٹھے بٹھائے مصطفےٰ کو کیا شیطان نے انگلی دکھائی ہے" آمنہ بیگم نے

کہا۔ "کل تو وہ بہت خوش تھے۔ ہنسی خوشی آپ سے گھڑی بندھوائی انگوٹھی پہنی تھی!"

"میں ہاشم بھائی سے کہوں گا!" سعید صاحب کے طیش و غضب کا پارہ چڑھتا ہی جا رہا تھا!۔ "لڑکی سے کہہ کر رسم توڑی ہے اور ایک بے حقیقت... انگوٹھی تک اتار لے گئے!۔ یہ فوجی کیا ایسے ہی بدتمیز، اجڈ اور بے حس ہوتے ہیں۔ کسی کے احساسات کا پاس و لحاظ نہیں کرتے!۔ نوید!۔ ابھی اور اسی وقت ہاشم صاحب کو ٹیلی فون کرو۔! جیسے بیٹھے ہوں۔ ویسے ہی چلے آئیں!"

نوید بھی بہت رنجیدہ تھے۔ ان کی دانست میں مصطفےٰ کا انگوٹھی اُتار لے جانا نہایت ناپسندیدہ فعل تھا۔ مصطفےٰ جس خاندان کے فرد تھے وہ لکھ پتی تھا۔ بھلا وہ ڈھائی ہزار کی انگوٹھی ان کے لیے اتنی اہم و قیمتی کیسے ہو سکتی تھی کہ ہاتھ سے اتروا کے لے گئے؟۔ کتنی ذلیل حرکت کی تھی انھوں نے۔ جو کسی طرح باور نہ کی جاتی تھی کہ مصطفےٰ سے سرزد ہوئی ہے!۔

اب نماز کس سے پڑھی جاتی۔ مسجد کون جاتا۔ سعید صاحب اور نوید تصویرِ حیرت بنے بیٹھے تھے۔! آمنہ بیگم کے آنسو نکل رہے تھے! سلمیٰ آہیں بھر رہی تھیں!۔ نوید فون کر کے آئے اور خبر سنائی! کمشنر صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ آ رہے ہیں! تب سعید صاحب نے کہا۔ "جا کے پوچھو اس بدبخت سے آخر تنہائی میں موقعہ تلاش کر کے مصطفےٰ نے اس سے کیا کہا تھا؟۔ مجھ سے وہ کچھ کہے گی نہیں ورنہ میں خود پوچھتا! تعجب ہے۔ یہ رکیک حرکت مصطفےٰ سے سرزد ہوئی ہے سچ ہی کہا ہے کہنے والوں نے۔ آدمی لاکھ برس میں بھی پہچانا نہیں جا سکتا!۔۔

مجھ سے کیا کہے گی میں کیا پوچھوں۔!" آمنہ بیگم نے کہا۔

سلمیٰ۔ "تم جاؤ!" جھلا کر سعید صاحب نے کہا۔ "ورنہ پھر وہ لوگ آ جائیں

گے! جاؤ مجھے واپس آکر ساری تفصیل سناؤ۔!

سلمٰی اور جویریہ روحی کے پاس پہونچی تھیں۔ وہ عجیب سی چور بنی اپنی مسہری کے پائنتی بیٹھی تھی!۔ دونوں خالی ہاتھ گود میں پڑے تھے۔ مانگ میں اب بھی افشاں کے تارے یہاں وہاں چمک رہے تھے۔ کچھ تارے گالوں پر چپک گئے تھے اور چہرے کی خفیف سی جنبش سے جگمگا اٹھتے تھے!۔

ہا۔ بے چاری۔ بدنصیب۔ سلمٰی نے بڑے قلق سے سوچا! پھر روحی کے پاس آ بیٹھیں۔ اپنی دانست میں اس کی دلداری اشک شوئی کر رہی تھیں! اسے سینے سے لپٹا کر بولیں۔

روحی۔ پیاری تم دل پر کوئی اثر نہ لو۔ اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی... مصلحت ہوتی ہے۔ اچھا ہوا کہ مصطفٰے نے اپنی فطرت کا نمونہ پہلے ہی دکھا دیا۔ فوجی آدمی ہیں۔ اکھڑ، اجڈ، گنوار، بات کرنے کا شعور نہیں ہے کس سے کیا کہنا چاہیئے!۔ بتاؤ روحی۔ بھائی جان نے پچھوایا ہے۔ انھوں نے تم سے کیا کہا تھا وہ یہاں آئے کب تھے؟ سب سچ سچ کہہ دو!۔

روحی کے سر مصطفٰے نے بڑی ذمہ داری ڈال تھی!۔ لہٰذا اس نے ادھر ادھر سے کاٹ چھانٹ کرکے ضروری باتیں سلمٰی کے گوش گزار کر دیں!۔

"انگوٹھی تم نے خود دی تھی؟" سلمٰی کو ہیرے کی انگوٹھی کا غم کھائے جا رہا تھا نسبت کے ٹوٹنے سے زیادہ انگوٹھی سے محرومی کا دکھ تھا!۔

"میں نے نہیں دی۔!"

انھوں نے خود لے لی!۔

"جی ہاں!"

توبہ۔ کیا ذلیل حرکت کی!" سلمٰی نے دانت پیس کر کہا "اچھا اب حضرت

کو چھٹی کا دودھ یاد آئے گا!۔ ان کے اماں باوا آرہے ہیں!" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئیں!۔

روحی چاہتی تھی کہ وہ تقدیر کے اچانک بدل جانے پر خوش ہو۔ مگر خوشی کے بجائے اس کے دل پر بڑے بھاری دکھ کی سنگین سِل رکھی تھی!۔ پہلے پہل وہ مصطفےٰ کو ایک عام سا فوجی پاہی سمجھتی تھی۔ کچھ سرد مہر، سنگدل بے حس، بے مروت سا سطحی آدمی۔ فوجیوں کے بارے میں اس کے خیالات بلند نہ تھے!۔ لیکن رات جس انداز اور پیرایہ میں مصطفےٰ نے اس سے گفتگو کی تھی! وہ اس کے دل پر نقش ہو گئی تھی۔! وہ انہیں اپنا محسن اعظم سمجھنے لگی تھی۔ جنہوں نے کسی ہنگامہ اور شور و شر کے بغیر اسے منگنی کی پابندی سے آزاد کر دیا تھا۔ اور اتنے کھرے انسان تھے کہ اپنی مرضی و پسند کا صاف صاف اظہار کر دیا تھا!۔ ورنہ اس کا حشر کیا ہوتا؟۔ وہ عمر بھر کی ریا کاری کے گناہ کبیرہ سے بچ گئی تھی!۔ اسے مصطفےٰ شرافت، انسانیت اور عظمت کی نامعلوم بلندیوں پر نظر آرہے تھے!۔

جویریہ بھی گم صم سی بیٹھی روحی کو گھور رہی تھی!۔

چند لمحوں بعد قدموں کی آوازوں کے ساتھ ساتھ کمشنر صاحب کی گھن گرج اور بیگم ہاشم کی مخصوص چنگھاڑ سنائی دی۔!

جویریہ اٹھ کر دروازے تک بھاگی اور روحی کا دل اچھل کر حلق میں آگیا! سب ابھی تک دالان ہی میں بیٹھے تھے۔ ناشتے پانی کا کسی کو ہوش نہ تھا!۔

"اوئی! یہ تم لوگ تصویر کھنچوانے بیٹھے ہو کیا؟" بیگم ہاشم نے اپنے قہقہے کے درمیان چلا کر کہا: "رات کو ایک بجے خدا خدا کر کے سوئے تھے۔ صبح صبح

ایسا کیا ضروری کام آپڑا کہ حکم دیا جیسے بیٹھے ہو ویسے ہی چلے آؤ۔ کیا ہوا۔ کیا بات ہے بہت پریشان لگ رہے ہو تم لوگ!؟

"سعید؟ کمشنر صاحب نے استفسار کیا۔" کیا قصہ ہے؟"

کیا بیان کروں بھائی صاحب کیا قصہ ہے۔" سعید صاحب نے برہم لہجے میں کہا "ہماری آپ کی عزت کو تماشہ بنا لیا ہے۔ آپ کے صاحبزادے نے!"

"صاحبزادے نے؟ کیا مطلب۔ کیا کیا ہے مصطفیٰ نے۔ خدا رحم کرے۔ کیا اس نے کوئی ایسی غلطی کر دی ہے جس نے تمہارے چہروں کا رنگ اڑا رکھا ہے۔" کمشنر صاحب خود بھی گھبرا گئے!۔

اے بیٹے جلدی کہو کہ ہوا کیا ہے۔ میرا مصطفیٰ ہے کہاں۔ وہ اچھا تو ہے نا۔" بیگم نے اپنا سینہ تھام لیا۔

"بھابی! قصہ یہ ہے کہ نہ معلوم کیوں۔ مصطفیٰ نے منگنی توڑ دی ہے اور آپ کی پہنائی ہوئی انگشتری لڑکی کے ہاتھ سے زبردستی اتروا لی۔!" سلمیٰ نے جان پر کھیل کر کہا۔ اور معاملہ کو زوردار بنانے کے لیے اپنی طرف سے لفظ "زبردستی" کا اضافہ کر دیا۔

کیا کہہ رہی ہو یہ!" بیگم نے اپنی آواز کا حجم اور بڑھا دیا: "مجھے یقین نہیں آ رہا ارے مصطفیٰ تو مہینوں سے میرے پیچھے پڑا تھا کہ باجی اماں کسی طرح انکل اور آنٹی کو راضی کر لیجئے۔ وہ روحی کو مجھ سے بیاہ دیں! میں ہی کسی اور وجہ سے اب تک آنا کانی کرتی رہی تھی۔ وہ وجہ بھی تم سے پوشیدہ نہیں رکھی میں نے۔ پھر بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ رات رات کے عرصے میں اس کے خیال بدل جائیں اور وہ منگنی ختم کر کے انگوٹھی تک لے لے۔ ناممکن! تم لوگوں کو کچھ دھوکا ہوا ہے۔ مصطفیٰ ایسا نہیں ہے۔ بلاؤ اسے کہاں ہے۔ میں تم سب کے سامنے پوچھوں گی!"

وہ شاید سو رہے ہیں!" سلمیٰ نے جواب کی ذمہ داری اب بھی خود پر لے لی اور بولیں"

آپ ان سے کیا پوچھیں گی۔ روحی سے پوچھیئے۔ جویریہ کہہ رہی ہے کہ وہ ساری رات سو نہ سکی۔ بس ایک پہلو پر بیٹھی سوچے جا رہی ہے!"

"اچھا تو اسی کو بلاؤ!" کمشنر صاحب نے دخل دیا۔ جویریہ سے بولے: "بیٹی جاؤ۔ اسے لے آؤ۔ میں سمجھتا ہوں کہ مصطفےٰ کی بہ نسبت وہی زیادہ تفصیل سے ساری بات بتا سکے گی!۔ اس سے کہو۔ کسی سے ڈرنے نہیں۔ فوراً آ جائے۔ اس غریب کا کیا قصور ہے؟"

روحی سر سے پاؤں تک برف کے متحرک مورتی ہو رہی تھی!۔ اس نے کمشنر صاحب کا حکم سنا اور دل تھام لیا۔ کیا وہ مصطفےٰ کی شکایت کر سکتی ہے۔ نہیں! پھر وہاں ایک تماشہ اور ہوا۔ ادھر روحی نے دالان میں قدم رکھے تھے کہ مردانہ کمرے سے مصطفےٰ بھی نکل کر صحن میں آ گئے!۔ اور کمشنر صاحب اور اپنی باجی اماں کو صبح صبح یہاں موجود پا کر ٹھٹھک گئے!۔

"آؤ آؤ برخوردار، رک کیوں گئے؟" بیگم نے ہاتھ نچا کر کہا: "اچھی ناک تم نے کٹا دی کہ اب چھوٹوں کو عمر بھر دکھانے کی صورت نہیں رکھی!۔ آ۔ ادھر آ۔ وہاں بت بنا کیوں کھڑا ہو گیا؟"

مصطفےٰ کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ وہ پاس آئے اور بیگم کے پہلو میں سر جھکا کر بیٹھ گئے!۔ ادھر روحی کو کمشنر صاحب نے اپنے بازو میں لے کر پہلو سے چپکا لیا۔

"یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ مصطفےٰ؟" کمشنر صاحب نے کہا: "سلمیٰ کہہ رہی ہے کہ تم نے کوئی نامناسب قدم اٹھایا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟"

وہ چپ رہے!۔

"اگر واقعی تم نے کوئی ایسا مذموم فعل کیا بھی ہے تو اس کا جواز بتاؤ!" وہ پھر بولے:

کیا تم یہ بھی نہیں جانتے کہ لڑکی کی منگنی کا اس طرح ٹوٹ جانا۔ خاندان، معاشرے اور ملنے جلنے والوں میں کون کون سے افسانوں کو جنم دینے کا باعث بن جاتا ہے۔ مجھے جواب دو۔ سر اٹھاؤ!"

مصطفےٰ نے سر اٹھایا۔ بیگم ہاشم ان کا چہرہ دیکھ کر دھک سے رہ گئیں۔ وہ برسوں کے بیمار کا چہرہ تھا۔ اداس، مضطرب، پریشان، خجل و شرمندہ کئی جذبے اس چہرے پر محیط تھے!۔ ان کی ممتا تڑپنے لگی!۔ نجانے کیوں اتنا مجبور ہو گیا کہ اپنی پسند اپنی واحد آرزو سے دستبردار ہونا پڑا۔

"ڈیڈی۔!" بالآخر انھوں نے گلا صاف کر کے کہا "میں آپ کو کیا جواب دوں! کوئی ایسی ہی بات تھی کہ۔۔!"

بات کاٹ کر کمشنر صاحب نے غصیلے لہجے میں کہا "وہی تو میں پوچھ رہا ہوں۔ کیا بات ہے۔ اس کی وضاحت تمھیں ابھی کرنی ہے۔ ورنہ تم نہیں جانتے کہ تمھاری اس حرکت کا اثر ہمارے خاندانوں پر کتنا ناگوار پڑے گا!۔ یوں بھی لڑکی کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے۔ تمھیں اس کا احساس نہیں ہے؟"

"ڈیڈی۔!" سب کی گھورتی ہوئی نظروں سے پریشان ہو کر اور کمشنر صاحب کے غصے سے ڈر کر مصطفےٰ نے کہا "بات یہ ہے ڈیڈی کہ کل رات دس بجے جب میں باہر ٹہلنے نکلا تھا تو میرا ایک دوست مجھے مل گیا۔ اس نے مجھے خبر سنائی کہ مجھے ہفتہ بھر کے اندر محاذ پر پہونچنا ہے۔ آرڈرز بھیج دیے گئے ہیں۔ اب آپ بتائیے ڈیڈی کہ جب مجھے ارجنٹ آرڈر پر ہفتہ بھر کے اندر اندر محاذ پر پہونچنا ہے تو میں کیا کروں منگنی کر کے۔ مجھے تو شادی بھی نہیں کرنی ہے! میں آپ سب سے یہ بات چھپانا چاہتا تھا۔ میرا منشا تھا کہ آرڈر کے ملتے ہی چپ چاپ چلا جاؤں گا!۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا!"

"محاذ پر جانا ہے تمھیں ؟" ان سب کے چہرے فق ہو گئے۔ آن کی آن میں ماحول بدل گیا۔ ایک سوگواری سی فضا طاری ہو گئی۔ اب کسی کو مصطفےٰ سے دشمنی نہ تھی۔ سب انھیں غمگین نظروں سے دیکھ رہے تھے!۔

"لیکن تم نے یہ کیوں سوچ لیا بیٹا کہ خدانخواستہ محاذ پر جانا کسی حادثے ہی کا پیش خیمہ ہوتا ہے" اب سعید صاحب اپنے غصے پر پچھتا رہے تھے "تم شادی کر سکتے ہو انشاءاللہ تھوڑے دنوں بعد صحیح سلامت واپس آجاؤ گے۔ تم نے رسم کیوں ختم کردی!

فوجی آدمی کی زندگی غیر یقینی ہوتی ہے انکل!" مصطفےٰ نے جواب دیا "ابھی کسی جگہ کھڑا ہے اور ابھی کسی جانب سے بے آواز گولی آئی اور دل کو چیرتی ہوئی گزر گئی!۔ ابھی روحی کی عمر کیا ہے انکل۔ کیا میں اس کی زندگی میں بیوگی کے دکھ بکھیر سکتا ہوں۔ اسے ابھی خوش رہنا ہے۔ زندگی کی خوشرنگ بہاروں میں اس کا حصہ ہے۔ اسے جانتے بوجھتے غموں کے حوالے کرنا بڑا ظلم ہے۔ اور۔ وہ انگوٹھی میں نے اس لیے واپس لے لی کہ آپ لوگ رسم کو ختم سمجھیے اور شادی کے انتظامات مت کیجیے بس ڈیڈی۔ ساری بات یہی ہے!"

مصطفےٰ نے یہ کہہ کر پھر سر جھکا لیا۔ دالان میں تکلیف دہ سناٹا چھا گیا!!

اور پھر یکایک ماحول اتنا ماتمی ہو گیا کہ لگتا تھا ان لوگوں کے درمیان کسی بہت پیارے رفیق کی لاش رکھی ہے!۔ ایک طرف کمشنر صاحب پیشانی تھامے بیٹھے تھے۔ دوسری طرف سعید صاحب اور نوید خاموش بیٹھے سوچ رہے تھے۔ ان سب کے دل صاف ہو چکے تھے۔ اب مخالفت اور عناد کی بجائے دلوں میں

مصطفےٰ کی بے پایاں محبت بھری ہوئی تھی !۔

دفعتہً گہرے سناٹے کو بیگم ہاشم کی بے اختیار گریہ وزاری نے درہم برہم کر دیا۔ وہ بہت بھاری بھرکم بہت شاندار اور باوقار بارعب خاتون تھیں۔ ان سے بے ساختہ آہ و فغاں کرنے کی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔ مگر اس وقت جہاں مصطفےٰ کی رحم طلب شکل و صورت نے ان کے دل پر دھکا سا لگایا تھا وہاں ان کی جگر پاش مجبور باتوں سے بیگم صاحبہ کا ضبط بالکل رخصت ہو گیا !۔

انھوں نے اپنا آنچل آنکھوں پر رکھ لیا تھا۔ اور زار و قطار رو رہی تھیں !۔

ان ناگفتہ بہ کیفیت نے کم و بیش سب کو رُلا دیا تھا۔ حتیٰ کہ مضبوط دل کمشنر صاحب تک سا متاثر نظر آ رہے تھے۔

"اسی لیے تو پلکوں چھاؤں پالا تھا۔ اسی لیے چھاتی پر سُلایا تھا۔ ہر قدم پر اللہ آمین کہا تھا۔ سال کے سال عمر کے ناڑے میں گرہ لگتی تو قرآن چھاؤں گزارتی تھی کہ میرے لال پر اللہ کی کتاب کا سایہ رہے۔ اسی لیے۔ اسی لیے کہ ایک دن انجانی جگہ کٹ جائے !"۔

ان کے بین تھے تو روائتی ماں کے بین۔ مگر سب کے دل ہلا رہے تھے۔ چنانچہ اب وہاں ایسا کوئی نہ تھا جس کی آنکھ پرنم نہ ہو۔ مصطفےٰ گھبرا کر ان کے پاس جا بیٹھے اور گلوگیر آواز میں کچھ کہتے ہوئے ان کے آنسو پونچھنے لگے مگر وہاں تو ایک دریا تھا کہ اُمڈا چلا آ رہا تھا۔

"باجی اماں نہ روئیے۔ خدا کے لیے نہ روئیے۔ میں ابھی کہاں جا رہا ہوں" مصطفےٰ نے کہا۔ ان کا چہرہ بیگم کے سامنے تھا۔ انھوں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں ان کا چہرہ تھام کر جھکایا اور پھر دیوانہ وار آنکھیں پیشانی اور لب و رخسار چومنے لگیں ! اپنے آنسوؤں سے ان کا چہرہ بھگو دیا اور جب وہ کسی طرح خود پر قابو نہ پا سکیں تو مصطفےٰ نے

ان کے سینے میں منھ چھپایا اور خود بھی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے!۔

نوید ایک ایسے آدمی تھے جنھوں نے خود پر قابو رکھا تھا چنانچہ سیل گریہ کا یہ طوفان انکی کوششوں سے تھما! وہ سب کو پیار سے منا کر سمجھا کر خاموش کرانے میں کامیاب ہوئے۔ تب کمشنر صاحب اور سعید صاحب جیسے سنجیدہ لوگوں نے بھی آنسو پونچھ لیے کمشنر صاحب نے کہا۔

"بس اسی لیے اس سے کہا تھا کہ بٹیا۔ ان کا دل بہت کمزور ہے۔ یہیں کہیں اپنا کوئی مشغلہ ڈھونڈ لو۔ صرف دل بہلائی کی خاطر۔ ورنہ خدا کا دیا اتنا کچھ ہے کہ تمھیں کسی محنت کی بھی ضرورت نہیں۔ آخر یہ سب ہے کس کا۔ مگر اس نا سمجھ کو فوجی وردی پہننے کے شوق نے یہ دن دکھایا۔ میں کہتا ہوں۔ سعید کہ ہر انسان کے لیے بہانہ موت بیماری آزادی کی شکل میں موجود ہے۔ مگر ان کے لیے بہانہ موت مصطفےٰ کی جدائی ہی بنے گا۔ لکھ لو۔ میرا کہا۔ ان کا جانا برحق۔ اور اگر خدا نخواستہ کہیں سے کچھ ایسی ویسی خبر آگئی تب لمحہ بھر میں یہ ختم ہو جائیں گی!۔ اللہ اللہ خیر صلاّ"

مصطفےٰ پر وحشت طاری تھی یہ منظر انھوں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ انھیں ابھی تک اندازہ نہ تھا کہ بیگم ہاشم کی محبت اس نازک درجہ پر آ پہونچی تھی۔ انھوں نے کہا۔

اچھا ڈیڈی۔ اب میں کوشش کروں گا کہ وہاں سے ریزائن ہو جاؤں باجی اماں آپ کو میری جان کی قسم اب آپ نہ روئیے! میں آپ کے آنسو برداشت نہیں کر سکتا!۔ اس طرح تو آپ مجھے مار ڈالیں گی!"

"دور پار مدعی۔ تمھیں میری عمر لگ جائے!" بیگم ہاشم نے کہا اور پیار سے ان کے بکھرے بال سنوارنے لگیں!۔

پال کی آگ اتنی تیز ہوتی ہے؟ آمنہ بیگم دنگ تھیں! مصطفےٰ ایک اجنبی خون تھے

ان سے کہیں سے کوئی رشتہ نہ ملتا تھا۔ لیکن بیگم ہاشم کی ان سے محبت مثالی تھی!۔

بہت دیر بعد جب ماحول کچھ نارمل ہوا تو مصطفےٰ نے کہا: "آپ لوگوں کو بھوک نہیں لگ رہی۔؟ میں تو اب مارے بھوک کے چکرا رہا ہوں۔ آنٹی۔ بیٹیئے! صرف چائے اور دلیہ وغیرہ مجھ سے نہ چلے گا۔ رات کا پلاؤ، قورمہ، شیرمال اور کباب اگر رکھے ہوں تو وہ منگوائیے۔"

جویریہ اور سلمیٰ اٹھ کر چلی گئیں! کمشنر صاحب صحن میں ٹہلنے اور سگار پینے لگے! سعید صاحب بھی کسی کام سے اٹھ گئے! روحی موقعہ دیکھ کر اپنے کمرے میں بھاگ گئی تھی آمنہ بیگم طعام خانے میں کھانے کی میز کی درستگی کے لیے چلی گئیں!۔ دالان میں صرف بیگم ہاشم، نوید رہ گئے!۔ پھر نوید بھی اٹھ ہی رہے تھے کہ مصطفےٰ نے کہا۔

"نوید بھائی! ذرا ٹھہر جایئے۔ میں آپ سے اور باجی اماں ایک نہایت اہم اور ضروری بات کہنا چاہتا ہوں۔ جس کی خفیف سی بھنک بھی کسی کو نہیں ملنی چاہیئے میں سمجھتا ہوں۔ ہمارے آپ کے دونوں خاندانوں میں سب سے زیادہ سمجھدار، صلح جو، اور معاملہ فہم ایک تو باجی اماں ہیں اور دوسرے آپ! بس مجھے آپ ہی دونوں پر پورا بھروسہ ہے!"

"کہو کہو۔ کیا بات ہے؟" نوید نے جلدی سے پوچھا۔

"اے بیٹے! اتنی لمبی تمہید کیوں اٹھائی ہے۔ تیری بات میں کسی کے سامنے بھلا کہنے بیٹھوں گی؟۔ بول۔ کیا بات ہے؟" پیار سے ان کے گال چھو کر بیگم نے کہا۔

"ابھی نہیں!" مصطفےٰ نے کہا: "بات کچھ لمبی اور بحث طلب ہے۔ ناشتے کے بعد آپ دونوں۔ انکسی میں۔ عبید کے کمرے میں آجایئے گا!۔ یہ کہہ کر وہ واش بیسن کی طرف چلے گئے!۔

پھر ناشتے کے بعد کسی بہانے بیگم ہاشم اور نوید عبید کے کمرے میں آئے۔ مصطفےٰ

بھی آگئے تھے۔ جنید صحن میں ننھے عاصم کے ساتھ گیند کھیل رہا تھا۔ مصطفےٰ نے دروازے پر پردہ برابر کر دیا اور دونوں کے سامنے چھوٹی تپائی پر ٹک گئے!۔ اس کے بعد بے حد دھیمی آواز جو سرگوشی سے آگے نہ تھی۔ بولے۔

" پہلے وعدہ کیجئے کہ جو کچھ اس وقت میں آپ سے کہوں گا وہ آپ لوگ عمر بھر کسی سے نہ کہیں گے!"

"یقین کرو۔ جب تم نے ہم پر اس قدر اعتماد کیا ہے تو۔۔!" نوید نے کہا۔

" نوید بھائی۔! سچ مانیے کہ اگر کبھی آپ کے منہ سے بھولے سے بھی کچھ نکل گیا تو میں اور روحی بہت شرمندہ ہوں گے!" مصطفےٰ بولے۔

کیا بات ہے؟" نوید کا دل دھڑک اٹھا۔

بیٹے اب زیادہ پریشان نہ کرو۔ جلدی سے کہہ دو۔!" بیگم ہاشم نجانے کیا سمجھ گئیں!۔

" باجی اماں۔ میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا" مصطفےٰ نے کہا۔ "میں تو ابھی کہیں نہیں جا رہا ہوں۔ نہ مجھے کوئی آرڈر وغیرہ ملا ہے۔ یہ تو کوئی ایسی بات تھی کہ میں نے آپ سے اتنا بڑا جھوٹ بول دیا۔ مجھے افسوس ہے!"

دونوں نے جلدی سے کہا "سچ مچ۔ نہیں۔ جھوٹا دلاسہ دے رہے ہو!"

نہیں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔! دراصل بات یہ ہے باجی اماں کہ" مصطفےٰ نے کہا اور پھر بہت چپکے چپکے وہ ساری باتیں بتا دیں۔ جو انھوں نے روحی اور جویریہ کو کرتے سنی تھیں!۔ کوئی بات نہیں چھپائی۔! پھر انھوں نے آخر میں کہا باجی اماں۔ آپ سمجھتی ہیں کہ ایسی مجبوری کی شادی کامیاب نہیں ہو سکتی!۔ اگر میں روحی کی دلی کیفیات سے بے خبر رہتا تو شاید اسے خوش رکھ سکتا۔ مگر اب نہیں!۔ میں اس منافقت اور ریاکاری پر نہ روحی کو مجبور کر سکتا ہوں اور

نہ مجھے کبھی سکون نصیب ہو سکتا ہے۔! لہٰذا میں نے ایک موثر بہانہ گڑھ لیا تھا۔ جو کامیاب رہا ہے!۔اب آگے آپ کے سوچنے کی بات ہے کہ کیا کرنا چاہیئے۔ لیکن ایک بار پھر میں آپ دونوں سے التجا کرتا ہوں کہ خدا کا واسطہ آپ کو کبھی ہرگز کسی کو اس بات کی ہوا بھی نہ لگے!۔ دراصل انکل سعید مغلوب الغضب آدمی ہیں۔ اور ڈیڈی کو بھی جلدی غصہ آجاتا ہے۔ آنٹی اور سلمیٰ باجی سے یہ سب کہنے کی بات نہیں کیونکہ وہ بہرحال ماں اور خالہ ہیں۔ مجھ سے شرمندہ ہوں گی۔ اور میں ان بے چاری عورتوں کو شرمندہ کرنا گوارہ نہیں کر سکتا!"

خیر۔ یہ عام بات ہے۔ لڑکی لڑکے آپس میں پڑھتے ہیں۔ ایک دوسرے سے دلچسپی ہو ہی جاتی ہے۔ کوئی پریشانی کی بات نہیں" بیگم ہاشم بولیں "میں لڑکی کو پیار سے سمجھا دوں گی!۔ اب تم۔!"

"نہیں اماں۔ میں خدا کی قسم آپ کی قسم۔ اب روحی سے شادی نہیں کر سکتا۔" مصطفےٰ نے بے حد سنجیدہ اور مستقل لہجے میں کہا "آپ اس سے کچھ مت کہیئے۔ یہ آپ کے شایان شان نہیں ہے۔ میرے لیے پھر سوچیں گی۔ ابھی کوئی جلدی نہیں ہے۔ فی الحال میں ان شکیل صاحب کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ جنھوں نے روحی پر اتنا گہرا اثر ڈالا ہے۔ دیکھوں تو آخر۔ صاحبزادے ہیں کس نوعیت کے" وہ ہنس دیے!۔ "اگر واقعی اس قابل ہوئے کہ روحی سے منسوب ہو سکتے۔ ہیں تو پھر کیا حرج ہے۔ روحی کی مرضی ہی سہی۔!"

"مگر یہ تم نے بہت برا کیا کہ دو کوڑی کی نگوڑی انگوٹھی زبردستی لڑکی کی انگلی سے اُتر والی" بیگم ہاشم نے کہا "اسی بات کا بڑا صدمہ ہے"

"کیسے نہ اُتروالیتا۔ اماں۔ آپ نہیں سمجھتیں" مصطفےٰ بولے "آج کل جذباتی لڑکیاں بدعقل، ناسمجھ اور انتہا پسند ہوتی ہیں۔ روحی نے جویریہ سے کہا تھا کہ اگر

اس کا بس چلے گا تو وہ ہیرہ نگل لے گی۔ خدا محفوظ رکھے۔ کسی موقعہ پر وہ یہ اقدام کر بیٹھتی تو آپ کیا کرتیں۔ اسی لیے میں نے اس بہانے سے کہ میں نے انگوٹھی اچھی طرح دیکھی نہیں ہے۔ اس سے لے لی۔ اور یہ پوچھ کر اطمینان کر لیا تھا کہ اور کوئی زیور اس کے پاس ہیرے کا نہیں ہے۔ کیا آپ واقعی یہ سمجھتی ہیں کہ اس بے حقیقت انگشتری کی مجھے اتنی ہی پرواہ تھی!۔ اگر روحی جویریہ سے اس کا تذکرہ نہ کرتی تو مجھے بخدا اس کا خیال بھی نہ تھا"

بس تنگوڑی یہی بات تھی۔ جس کے لیے تم دعا سے قسمیں لے رہے تھے؟" بیگم ہاشم نے اب ہلکا سا قہقہہ لگا کے کہا۔

جی ہاں۔!" مصطفےٰ کو حیرت ہوئی۔

تو۔ تمہاری خاطر عمر بھر کبھی تمہارا راز زبان پر نہ لاؤں گی۔ بس اب تمہارا اطمینان ہوا۔؟" وہ ہنس کر بولیں "ارے بیٹا۔ یہ سینہ کتنوں کے بڑے بڑے رازوں کا قبرستان ہے۔ ابھی دو۲ مہینے ہوئے بہن جہاں بانو نے اپنی بھانجی۔!"

نوید نے بات کاٹ دی۔ اٹھ کر مصطفےٰ کو گلے لگا لیا اور بے حد متاثر ہو کر بولے "مصطفےٰ!۔ واقعی تم بہت شریف، بے حد بلند، نہایت اعلیٰ کردار کے انسان ہو مجھے فخر ہے تم پر تمہاری جگہ اگر کوئی دوسرا نوجوان ہوتا تو وہ روحی کو بدنام کرتا۔ اسے سزا دیتا۔ اور اس کا دشمن ہو جاتا لیکن تم نے روحی کی ناسمجھی کو ظاہر نہ کرنے کی قسمیں ہم سے لی ہیں۔ مصطفےٰ! تم بہت عظیم ہو۔ تمہاری عظمت کو میں سلام کرتا ہوں"

آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں نوید بھائی!" مصطفےٰ نے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے "روحی کوئی غیر تو نہیں ہے جتنی عزیز وہ آپ کو ہے اتنی ہی مجھے بھی ہے!"

اچھا تو سنو!" بیگم ہاشم نے کہا "میں تو اب گھر نہیں جا رہی ہوں۔ تنگوڑی

رتی بھر بات کا بتنگڑ بنا کے تم نے مجھے ساری عمر کے آنسو رلوا دیے۔ رات نیند بھی کم آئی۔ میں تو ٹملی کے کمرے میں جا کے ذرا کمر سیدھی کروں گی۔!" "ان" سے کہنا کہ آپ کو جانا ہو تو جایئے!"

زندگی گزارنے کے لیے انسان کو کوئی بہانہ چاہیئے! آدمی کسی لمبے سفر پر جاتا ہے تب اِدھر اُدھر کے مناظر سے لطف اندوز ہوتا ہوا منزل پر پہنچتا ہے۔ پھیکا بے لطف بے جان سفر مسافر کو تھکا دیتا ہے۔ زندگی بھی ایک سفر ہے طویل۔ کٹھن اور دشوار گزار سفر، اس میں اگر لمحظہ بہ لحظہ نت نئی تبدیلیاں نہ آتی رہیں۔ کچھ دلچسپیوں کا سامان نہ ہو تو زندگی کا سفر بھی ہولناک، مُردہ اور بے لطف معلوم ہونے لگتا ہے!۔

شکیل کی ساری زندگی عجیب سی بے مقصد جدوجہد، کشمکش اور مشکلات کا مقابلہ کرتے گزر رہی تھی!۔ پہلی دفعہ وہ محبت کی چاشنی سے بہرہ اور ہوا تھا۔ اور پھر یہ محبت اس کی حیات بے مقصد کی سب سے بڑی دلچسپی اور سب سے بڑا مقصد بن گیا!۔ اس کی کوئی آرزو کبھی پوری نہ ہو سکی تھی!۔ وہ ان کے پوری ہونے کا خواہش مند بھی نہ رہا تھا!۔ وہ انتظار، صبر اور کوفت کا عادی بن چکا تھا۔ ہمیشہ کسی نہ کسی غیر متوقع چیز کا اس نے انتظار کیا تھا۔ نجانے کس چیز کا جس کا ادراک خود اسی کو نہ تھا اور جب وہ چیز نہیں ملی تھی تب اس نے صبر کر لیا تھا لیکن ان دنوں اس نے صبر کا دامن ہاتھ سے دبا دیا تھا۔ اور باؤلا ہو گیا تھا!۔ اس کا چہرہ مایوسیوں، حسرتوں اور ناکامیوں کا آماجگاہ بن کر رہ گیا تھا۔

عجیب سی بے چینیاں تھیں جو اسے رُلا رہی تھیں!۔ جنھیں چھپانے کی ناکام کوشش میں وہ انھیں اجاگر کر رہا تھا!۔

اس نے کوئی پچیسویں بار دروازے کے باہر جھانکا اور واپس آ گیا!۔ اور اپنی کرسی پر جا بیٹھا!۔ جب سے وہ ڈائریکٹر صاحب کی شاندار ضیافت سے واپس آیا تھا۔ اور بھی پاگل بن گیا تھا اس نے جان بوجھ کر ان کے ہاں کی شان و شوکت نہ دیکھی ہو تو کیا۔ احساس تو سب کا کیا تھا!۔ اور تبھی سے یہ خیال مستقل اس کے ذہن میں بچھو کے ڈنک کی طرح چبھ رہا تھا کہ وہ فرشِ زمیں کا باشندہ تھا!۔ اور تمنا کی تھی فلک پر چمکنے والے ستارے کی!۔

اس کا دم گھٹ رہا تھا!۔ سانسوں کی آمد و شد گراں بار ہوتی جا رہی تھی!۔ اور لب خاموش تھے۔ دردِ دل سناتا تو کسے سناتا؟۔ مجبور و ستم رسیدہ ماں کو؟۔ ان بے چاری کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ پریشان اور پژمردہ کھلائی سی رہتی تھیں ایک رات ان کی آنکھ کھلی تب انھوں نے دیکھا کہ شکیل اپنے بستر پر نہ تھا! انھوں نے دیکھا کہ باہر برآمدے کی منڈیر سے ٹیک لگائے فرش پر بیٹھا تھا۔ ناظمہ بیگم نے اس کی بھاری سسکیاں صاف سنیں اور مغموم سی واپس آ کر اپنے بستر پر لیٹ گئیں!۔

محبت کی تکلیف سے وہ نہ آشنا تھیں۔ ان کا دل چاہتا تھا کہ ان کا بیٹا بھی کسی قابل ہوتا۔ وہ اپنے گھر بہو لاتیں۔ ان کے ویران گھر میں بہو کے رنگین وجود سے بہار آ جاتی۔ پھر ان کے سونے آنگن میں ننھے منے بچوں کی کلکاریاں گونجتیں تب زندگی سپھل ہوتی!

اب زندگی اکارت جا رہی تھی۔

ان ماں بیٹے کی نظر پڑی فلک کے ماہِ تاباں پر۔ اس نے چار دن کی چاندنی

کی جھلک دکھاکر مقدرات رحالات کے گھنے بادلوں کے پیچھے چہرہ چھپالیا۔

تقدیران کے لیے ظالم رسفاک ہوگئی تھی۔ وہ تو ایک زمانے سے آنسو بہا رہی تھیں۔ انھیں یاد نہ تھا کہ کبھی خوشیوں نے ان کے گھر کا رخ کیا ہو۔ اپنی قسمت کا لکھا ہوا انھوں نے کسی نہ کسی طرح بھگت لیا تھا لیکن اولاد پر جو کچھ گزر رہی تھی۔ وہ ان کے لیے ناقابل برداشت تھا۔

ماں بننا عورت کے لیے اگر باعث رحمت ہے تو باعث زحمت ولعنت بھی ہے۔ اولاد کی مصیبتیں، پریشانیاں، اور ویران چہرے ماں کے لیے بڑے صبر آزما بن جاتے ہیں!۔

شکیل رو رہا تھا۔ اپنے من چاہے کھلونے کے لیے جو اسے نہ مل سکا تھا۔ اپنے مقدر پر جو اسے مسلسل ستا رہا تھا۔ اپنے حالات جو اس سے سنبھالے نہ سنبھل رہے تھے۔

اس کے آنسو بے بسی کے آنسو تھے!۔
زمانہ بڑا ستم ظریف بڑا ستمگر ہے۔
جب جی چاہتا ہے ابھی نہ گزرے تو جلدی سے گزر جاتا ہے۔
جب جی چاہتا ہے جلدی سے گزر جائے تو ایک جگہ جم جاتا ہے۔

اور یہ بہت برے دن تھے۔ صبر آزما، جانگسل، دل شکن، اور تکلیف دہ دن۔ یہ اپنی جگہ ایستادہ تھے۔ چٹان کی طرح۔

ساری رات ناظمہ بیگم نے بھی جاگتے گزار دی۔ کیا ہوگا شکیل کا حشر کیا اس نے بری تقدیر کے سامنے سپر ڈال دی تھی؟۔ پہلے وہ کتاب کا کیڑا بنا رہتا تھا اور اب اس کی کتابوں پر گرد تہہ بہ تہہ جم رہی تھی!۔

وہ ایک عمدہ ادیب بھی تھا!۔ اب وہ کاغذ قلم کی طرف دیکھتا بھی

گوارہ نہ کرتا۔ اسے اچھے شعر، مصرعے، عمدہ قول اکٹھا کرنے کا جنون سا تھا۔ اس کی تنہائیاں انہی اساتذہ سے محفل بنی رہتی تھیں اب اس کی یہ بیاض کسی کونے کھدرے میں پڑی تھی۔!

اس کا امتحان سر پر آ پہونچا تھا۔ اس کے ساتھی اس کے پاس آئے اور اس کے لکھے تمام نوٹس لے کر چلے گئے تھے۔ اس نے اپنے لیے کچھ بھی نہ رکھا تھا۔ جیسے اب اسے ان کی ضرورت ہی نہ رہی تھی!۔

ایک تحقیر آمیز، استہزائیہ مسکراہٹ ان کے لبوں پر اُبھری۔ انھوں نے اس کی خدمتوں پر پل پل اسے دل کی گہرائیوں سے دعائیں دی تھیں۔ وہ سب کیا ہوئیں؟ کیا ہوا ہیں تحلیل ہوگئیں۔ بارگاہ ایزدی میں ایک بھی نہیں پہنچی؟۔

خدا کو بھی اپنے بندوں سے اتنی ہی محبت ہے جتنی ایک ماں کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے۔ لیکن اب ان کا اعتقاد لرز رہا تھا۔ یہ سب دل کے بہلانے کی باتیں ہیں اب کیا ہوئی اس ماں کی محبت؟۔ کیوں وہ ماں اتنی ستمگر اتنی بے پرواہ ہوگئی ہے!۔

یا اللہ اب رحم کر۔ انھوں نے بے چین ہو کر پھر ماں ہی کو پکارا "بہت دیر ہو چکی ہے۔ تجھے کس بات کا انتظار ہے۔ کفر نکلنے لگے زبان سے۔ انتظار کی بات ختم ہو جائے۔ صبر کی حد نہ رہے۔ اور عمر تمام ہو جائے!

کب تک میرے اللہ کب تک۔؟

صبح کو انھوں نے دیکھا شکیل کی پلکیں متورم اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں!۔ ان کا دل ریت کھا انبار میں دھنسنے لگا!۔

سفینہ جو ہمیشہ کی طرح ان کے ہاں آجاتی تھی اس نے اس کی شکل دیکھ کر پوچھ ہی لیا "شکیل بھیا۔ آپ روئے تھے کیا؟ آپ کی آنکھیں کیوں لال ہو رہی ہیں؟"

میں کیوں روتا؟" وہ مسکرایا۔" وہم ہو گیا ہے تمہیں!"
آپ کی آنکھیں۔
"کیا آج ہمیشہ سے زیادہ اچھی لگ رہی ہیں؟"
آپ لاکھ چھپائیے میں نہیں مانتی۔ دراصل آپ کو روحی یاد آتی ہیں"
سفینہ نے کہا" مگر اماں۔ مجھے تعجب ہے کہ انھوں نے آنا جانا کیوں بند کر دیا۔ کیا آپ سے کچھ خفا ہو گئیں معلوم نہیں۔ وہ تو ہوا کے جھونکے کی طرح آئی اور گئی!" فاطمہ بیگم نے کہا۔
" اب میں سوچ رہی ہوں کہ ایک بار خود اس سے ملنے اس کے گھر جاؤں۔ سنتی ہوں بڑے آدمی اتنے بد اخلاق تو نہ ہوں گے کہ مجھے اس سے ملنے نہ دیں"۔ شکیل مجھے لے چلو۔ معلوم تو ہو کہ آخر اسے ہوا کیا ہے۔ خدا نہ کرے کچھ بیمار تو نہیں ہو گئی ہے کہ نہ خیر نہ خبر۔ اتنی پابندیاں یک بارگی لگ نہ گئی ہوں گی!"
اماں تو پھر جائیے نا!۔ مجھے بھی وہ بہت یاد آتی ہیں"۔ سفینہ نے کہا"۔ شکیل بھیا لے جائیے نا اماں کو۔ کیا ان سے ملنے کا آپ کا دل نہیں چاہتا؟"۔
سوچتا ہوں کہ۔ ہم وہاں کیا کہہ کر اپنا تعارف کرائیں گے؟" مذبذب لہجے میں شکیل نے کہا۔
"تم تو ان لوگوں سے مل چکے ہو۔ اب کیا تعارف۔ میں کہہ دوں گی کہ روحی بیٹی سے ملنے آئی ہوں عرصے سے خیر خیریت معلوم نہ ہو سکی!" فاطمہ بیگم نے کہا۔
ایک دفعہ راستے میں انصاری ملے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ دو تین ہفتوں سے زائد ہو گئے۔ وہ یونیورسٹی بھی نہیں آرہی"۔ شکیل نے کہا" مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں وہ جا کر یہ نہ سنیں کہ اس کی شادی ہو گئی!"
یہ کہہ کر وہ یکبارگی اٹھا اور وہاں سے چلا گیا!۔
بہر حال فاطمہ بیگم نے ارادہ کر لیا تھا کہ ایک دفعہ روحی سے ملیں گی ضرور!

شکیل راضی نہیں تھا! لیکن وہ نہ مانیں!۔

تم نہ ملنا اس سے۔ اگر خفا ہو۔ مگر مجھے کیوں رد کرتے ہو۔ مجھے پہونچا کر چلے آنا؛ وہ مُصر نکلیں۔

بہت اچھا۔ میں آپ کو پہونچا کر چلا آؤں گا!۔ شکیل بولا: اور اب میری ایک بات بھی آپ کو ماننا پڑے گی۔ روحی نے ہمیں مجبور لاچار اور غریب سمجھ کے جو پانچ ہزار کا طمانچہ ہمارے مارا تھا۔ وہ آپ اسے واپس کر آئیے۔ افسوس ہے کہ پہلے ہی آپ نے کہا نہیں۔ میں اس کے پیسے اتنے دن رکھے نہ رہتا! تبھی واپس کر دیتا!

"میں ہی واپس کر دیتی۔ مگر وہ پھر آئی کہاں۔!"

خیر اب لے چلئے۔ دے آئیے!: وہ در پردہ اس سے خفا تھا!۔ اتنی مجبور اور پابند تو ہو نہ گئی ہوگی کہ ایک بار کسی بہانے سے آکر مل جاتی۔ کیا اسے اس کی محبت' نیازمندی اور جانثاری کا احساس ذرا بھی نہ تھا۔ کیا وہ بڑے گھر کی لڑکی کی طرح صرف اداکاری کر رہی تھی۔ محبت کی اداکاری۔ وقت گزاری کا معاملہ۔ اس کی شکل و صورت سے وقتی دلچسپی۔ شکیل پر غم اور ساتھ ہی غصے کے جذبات حاوی تھے!۔

ناظمہ بیگم چلنے کو تو چل کھڑی ہوئیں مگر بے چاری راستے بھر یہی سوچتی گئیں کہ بڑے لوگوں سے کس پیرایہ میں اور کن الفاظ میں گفتگو کریں گی؟۔

بہر حال وہ ڈائریکٹر صاحب کی کوٹھی پر پہنچ ہی گئیں!۔

چوکیدار نے ایک دفعہ پہلے بھی شکیل کو دیکھا تھا۔ اسے فوراً پہچان گیا۔ اور دانت نکال کر اس کا استقبال کیا!۔ اور خود انھیں اوپر لے گیا!۔

شکیل نے کال بل بجائی!۔

سہ پہر ہو چکی تھی!۔ گرمی کی ایک خوشگوار شام شروع ہونے والی تھی۔ سعید صاحب کا پورا کنبہ صحن میں تھا! ملازم چھڑکاؤ کر گئے تھے۔ مالی نے سارے گملوں کو

سینچا تھا! ۔ ترش سے مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو اٹھ رہی تھی! اور موتیا کی بوٹی موٹی ادھ کھلی کلیاں اپنی مہک پھیلانے لگی تھیں! ۔

سب یہاں وہاں بیٹھے باتوں میں مشغول تھے ۔ بیگم ہاشم کسی طرح روحی کو بھی کمرے سے نکال لائی تھیں ۔ ابپو دہی اور جویریہ ایک میز کے پاس کھڑی شربت بنا رہی تھیں ۔ روحی اب بھی مصطفےٰ سے شرما رہی تھی لیکن یہ شرم اس سے وابستگی کی نہیں تھی ۔ اس سے جدائی کی تھی! ۔

بیگم ہاشم جو صبح کو اتنی بری طرح گریہ وزاری فرما چکی تھیں ۔ اب اتنے اونچے قہقہے لگا رہی تھیں کہ آمنہ بیگم اور سلمیٰ وغیرہ کو حیرت تھی ۔ اتنی جلدی ان کا غم بھی کیونکر گیا تھا ۔ بے چاریوں کو حقیقت کی کچھ خبر ہی نہ تھی! ۔ انھیں لطیفوں سے بڑی دلچسپی تھی ۔ رسالوں میں لطیفے ڈھونڈ کر پڑھتی تھیں ۔ اخبار میں صرف لطیفے پڑھتیں اور انھیں یاد کر کے اکیلے میں بھی خوب ہنستیں ۔ اب بھی عبید سے ایک دو لطیفے سُنے اور بس انھیں دوہرا دوہرا کر ہنس رہی تھیں ۔ پھر کچھ تذکرہ اپنی بھتیجی ... ریاست جہاں کا نکال لیا ۔ ان کی حماقتوں پر لڑکیوں کے سے ٹھٹھے لگائے! ان کی خاطر سب ہی کو اخلاقاً ہنسنا پڑ رہا تھا ۔ اور اصل بات یہ تھی کہ مصطفےٰ نے اطمینان دلا دیا تھا کہ انھیں فی الحال بہت دنوں تک کہیں جانا نہیں ہے وہ اس خبر فرحت اثر سے اتنی خوش ہو گئی تھیں کہ بس خوشی کے اظہار کے لیے لطیفوں کا بہانہ تلاش کر رہی تھیں! ۔

کمشنر صاحب جو دوپہر ہی کو آ گئے تھے وہ تک بیوی کے مزاجی تغیرات سے حیران تھے! اور آمنہ بیگم سوچ رہی تھیں کہ بیٹے کے محاذ پر جانے کا اثر بس کچھ ہی دیر کا تھا؟ ۔

روحی نے گلاسوں سے لبریز بڑے میز پر لا رکھی! ۔ اور واپس جانے کے لیے مڑی تھی ملازم وہاں آ گیا! ۔ سعید صاحب اس کی طرف متوجہ ہو گئے! ۔

" جی سرکار - وہ اس روز جو شکیل صاحب آئے تھے - وہ آئے ہیں اور ان کے ساتھ ان کی والدہ صاحبہ بھی ہیں !"

ہائیں !" نوید کے منھ سے بے ساختہ نکلا ! -

"شکیل !" روحی چیخنے ہی والی تھی کہ وقت پر سنبھل گئی اور اندر بھاگ گئی ! -

شکیل میاں تشریف لائے ہیں - واہ بھئی - !" بے ساختہ مصطفےٰ نے کہا اور ہنس کر معنی خیز انداز میں نوید کو دیکھا ! - پھر بولے -

آپ لوگ اٹھ جایئے - میں انھیں یہیں بلائے لیتا ہوں !"

مگر ان کی والدہ محترمہ تو غالباً پردہ کرتی ہوں گی !" سعید صاحب نے کہا انھیں روحی کے کمرے میں پہنچا دو دلہن ! اور آمنہ بیگم تم لوگ بھی اندر جاؤ - بھابی کیا آپ بھی پردہ کرتی ہیں ؟ -

ارے اس کل کے بچے سے کیا پردہ - اسے یہیں بلوالو - !" بیگم ہاشم نے کہا - انھیں چونکہ ساری کہانی معلوم تھی - لہٰذا وہ شکیل کو دیکھنا چاہتی تھیں -

آمنہ بیگم اور دلہن اندر چلی گئیں ! - اور زمانے ڈرائنگ میں فاطمہ بیگم کو بڑے تپاک و تمیز سے خوش آمدید کہا ! -

مصطفےٰ خود اٹھ گئے اور باہر نکلے ! - شکیل اندر آ رہا تھا - ان دونوں کی مڈبھیڑ ڈیوڑھی میں ہو گئی ! -

اپنے سامنے ایک خوش پوش، خوبصورت اور وجیہہ جوان کو دیکھ کر شکیل ٹھٹھک گیا - پھر اس نے سنبھل کر انھیں سلام کیا اور مصافحہ کی خاطر ہاتھ بڑھا دیا -

مصطفےٰ نے بڑی گرمجوشی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا -

"آپ ہی شکیل صاحب ہیں ؟"

"جی!" شکیل خفیف سا مسکرایا۔

"اسم با مسمّٰی۔!" مصطفےٰ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"جی؟" شکیل نے پوچھا۔

"میں یہ کہہ رہا تھا کہ آپ کا اسم گرامی شکیل کے علاوہ حسین و جمیل بھی ہونا چاہیئے تھا! بہت خوبصورت ہیں آپ شکیل صاحب!۔ یونیورسٹی کی کوئی لڑکی فتنہ ہونے سے بچی بھی ہے!"

شکیل کو اس اجنبی شخص کی بے تکلفی نے حیران کر دیا۔ اس کا ہاتھ ابھی تک مصطفےٰ کے ہاتھ میں تھا!۔

"آیئے اندر چلیے" مصطفےٰ نے کہا۔ "سچ مانیے کہ میں آپ سے ملنے کا مشتاق تھا۔ اور یقین کیجیے کہ میں ابھی کچھ ہی دیر بعد آپ سے ملنے آپ کے در دولت پر جانے ہی والا تھا۔ اب اسے کشش کہہ لیجیے کہ کچھ اور کہ آپ خود ہی تشریف لے آئے!"

"مجھ سے ملنے؟" شکیل نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں۔ اتنی تعریفیں آپ کی میں نے سنی ہیں کہ بس الرجک ہو گیا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ آخر وہ انسان اتنی خوبیوں کا مالک کیسے ہو سکتا ہے۔ لیکن آپ کو دیکھ کر ایمان لے آیا ہوں۔ جو کچھ لوگ کہتے ہیں آپ اس سے سوا ہیں!"

"شکریہ جناب!" شکیل حیران تھا۔ کون صاحب تھے یہ۔ جان نہ پہچان لیکن جیسے کہ مدتوں کے شناسا ہوں۔ اس کا دل بھی بے اختیار ان کی طرف کھنچا جا رہا تھا!۔

مصطفےٰ اسے لے کر صحن میں پہنچ گئے!۔ اور علیک سلیک کے بعد گفتگو کے آغاز کی ذمہ داری نوید نے لے لی۔ اعبید بھی اچک کر اس کے پاس جا بیٹھا تھا! کمشنر صاحب اور بیگم ہاشم کے اندازے سے زیادہ حسین و خوبرو! انھوں نے سوچا۔ اسے پہلے کہیں اور بھی دیکھا ہے۔ پھر دفعتاً ان کی نظر مصطفےٰ پر پڑی! زرد دھواں سے رہ گئیں مصطفےٰ!

نے شکیل کو اپنے پاس کی کرسی پر بٹھا لیا تھا۔ باری باری ان کی نظریں دونوں کے چہروں پر پڑ رہی تھیں۔ اور وہ انتہائی حیرت و تعجب سے سوچ رہی تھیں کہ ان میں کتنی مشابہت ہے!۔

کمشنر صاحب بھی یہی سوچ رہے تھے۔ ان کے خیالات بڑی دور دور کی خبریں لا رہے تھے!۔

"کیسے آنا ہوا شکیل میاں۔ ؟" نوید نے بات چیت کا سلسلہ شروع کرتے ہوئے پوچھا۔

سعید صاحب اس کے سراپا پر دزدیدہ نظریں دوڑا رہے تھے۔ سفید جھاگ۔ ایسے لباس میں کتنا حسین لگ رہا تھا! یقیناً اس قابل ہے کہ ان کے خاندان میں شامل ہو سکتا ہے۔

"جی! امی کا اصرار کئی دن سے تھا!" اس نے بڑے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ "وہ ملنا چاہتی تھیں۔ اس لیے میں۔ !"

"ملنا چاہتی تھیں" نوید نے احمقوں کی طرح پوچھا۔

"جی!"

"تمہاری مراد غالباً روحی سے ہے؟" نوید نے کہا۔

"جی ہاں!"

"آپ کی والدہ صاحبہ پہچانتی ہیں اسے؟" کمشنر صاحب نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ !" اب جان پر کھیل کر اس نے کہا "روحی صاحبہ میری کلاس فیلو ہیں جناب! دو چار مرتبہ غریب خانے پر آئی بھی تھیں۔ امی کی آنکھوں کا جب آپریشن ہوا ہے تب۔ انھوں نے امی کا بڑا خیال رکھا تھا۔ مسلسل آٹھ دس روز یونیورسٹی کا ناغہ کر کے امی کے پاس نرسنگ ہوم میں رہی تھیں!۔ اور "

مصطفٰے نے ایک طویل سانس لی۔ !عقدہ حل ہو گیا تھا کہ روحی یونیورسٹی کا ناغہ کر کے کہاں گئی رہتی !۔

اچھا اچھا۔!" نوید نے کہا" یہ تو روحی نے بہت اچھا کیا !۔ اب آپ کی والدہ صاحبہ کی کیا کیفیت ہے۔ آپریشن کامیاب ہوا ؟۔

جی ہاں۔ خدا کا شکر ہے۔! اب وہ دیکھ سکتی ہیں !" شکیل نے جواب دیا۔ "تبھی تو یہاں تک آسکی ہیں۔ روحی صاحبہ نے آنا چھوڑ دیا ہے۔ امی کو تشویش تھی ! کہنے لگیں کہ کسی طرح مجھے لے چلو !۔ اور میں خود بھی۔ پریشان تھا !۔ وہ بہت دنوں سے یونیورسٹی نہیں آرہی ہیں !۔ کیا انھوں نے پڑھنا چھوڑ دیا ہے۔ ؟ اب تو امتحان بھی نزدیک ہے۔ پروفیسر چشتی صاحب بھی انھیں پوچھتے رہتے ہیں ! کیا وہ امتحان نہ دیں گی ؟"

اس کا سیدھا سادا مخلصانہ اور بچوں کا سا معصومانہ لب و لہجہ مصطفٰے کو بہت پسند آیا۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے !۔ پھر انھوں نے ایک عجیب سی بات پوچھ لی۔

"شکیل میاں۔ کیا آپ روحی سے ملنا چاہتے ہیں !۔ آپ لوگ ایک عرصے تک ساتھ پڑھتے رہے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ کچھ دیر کی ملاقات میں کیا قباحت ؟۔"

انھوں نے مستفسرانہ انداز میں سعید صاحب کی طرف دیکھا "کیوں انکل ؟"

جی ہاں جناب !" دفعتہً خلاف توقع شکیل نے ملتجیانہ لہجے میں مصطفٰے ہی سے مخاطب ہو کر کہا" میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔ اگر آپ تھوڑی دیر کے لیے روحی سے ملنے کی اجازت دے دیں۔ دراصل ۔؟"

"دراصل ۔ ؟" مصطفٰے نے ہنس کر پوچھا۔

"مجھے ان سے صرف دو ضروری باتیں کرنی ہیں" جیسے وارفتہ ہو کر شکیل نے

کہا تھا:

انھوں نے شاید تعلیم ترک کر دی ہے۔ میں نے بھی پڑھنا چھوڑ دیا۔ اب ان سے کہیں ملنے کا امکان نہیں ہے۔ اور در اصل۔ ان کی ایک امانت میرے پاس ہے میں ان کی امانت انھیں دست بدست پہونچانا چاہتا ہوں۔ اور میری کچھ چیزیں ان کے پاس ہیں۔ وہ مجھے واپس لینی ہیں! بس۔ اس کے سوا اور کچھ مجھے کہنا نہیں ہے!"

اس نے ایک گہری بے چین نظر مصطفےٰ پر ڈالی اور نیچے دیکھنے لگا!۔ ان کا دل تڑپ اٹھا! لیکن سعید صاحب کی موجودگی میں وہ رخی سے ملنے کی اجازت کیونکر دے سکتے!۔ چپ رہے!۔

"آپ نے تعلیم کیوں چھوڑ دی۔!" سعید صاحب نے پوچھا: "کہیں کوئی کام وغیرہ مل گیا ہے؟۔

دفعتہً ہزار ضبط کے باوجود اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ جواب دینے میں اس نے ایک لمحہ کی تاخیر کی۔ پھر گلوگیر لہجہ سنبھال کر بولا۔

"جی! اب پڑھنے میں میرا دل نہیں لگتا!۔ کیا کروں گا پڑھ کے۔ جبکہ یہاں میرا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ اب میں یہ شہر چھوڑ جاؤں گا!۔ امی کے کچھ عزیز بھوپال میں ہیں۔ میں اور امی ان کے پاس چلے جائیں گے ہمیشہ کے لیے!" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا!۔

"بھوپال میں۔؟ کون رہتا ہے وہاں تمہارا!" دفعتہً بیگم ہاشم نے پوچھ لیا۔

"وہاں امی کے ایک خالہ زاد بھائی رہتے ہیں۔ در اصل امی کا وطن ہی بھوپال ہے یہاں تو کسی وجہ سے میرے والد مرحوم چلے آئے تھے۔ اب ان کے بعد یہاں ہمارا کوئی رہا نہیں ہے۔ امی بھی بہت پریشان رہتی ہیں۔ لہٰذا وہ چاہتی ہیں کہ ماموں صاحب کے ہاں چلی جائیں۔

کیوں؟ اتنی بھی بد ہمتی کیا شکیل میاں۔ ماشاء اللہ آپ مرد ہیں۔ تعلیم یافتہ ہیں۔ آپ کو کسی کے سہارے کی ضرورت نہ سمجھا گیا ہے۔ آپ خود بہتیروں کا سہارا بن سکتے ہیں۔" مصطفےٰ نے کہا: "آپ کہتے ہیں کہ اب یہاں کوئی آپ کا نہیں ہے۔ تو کیا ہمیں آپ اپنا نہیں سمجھتے!۔ اب ہم ہیں آپ کے۔!"

"جی ہاں۔ وہ تو ہے۔ مگر۔!" وہ کچھ مسکرا کر اوپری دل سے بولا۔ یہ بھلا کون ہو سکتے ہیں۔ نام تک تو ان کا اسے معلوم نہ تھا!۔ بالکل غیر انجان آدمی۔ پھر اس نے بے چینی سے پہلو بدل کر سوچا۔ نجانے امی ان خواتین سے کیا باتیں کر رہی ہیں!۔

بیگم ہاشم نوید کے کان میں کھس پھس کر کے بولیں: "نوید میاں میرے دل میں عجیب سا شبہ پیدا ہو رہا ہے۔ کہ کہیں۔ تم مصطفےٰ اور اس لڑکے کی شکل نہیں دیکھتے یہ ایک دوسرے سے کتنے مشابہ ہیں!۔ دیکھ رہے ہو نا؟"

"بھابی۔ آپ کو یقین نہ آئے گا! جب بہت دنوں قبل میں پہلی بار اس سے ملا تھا تبھی مجھے خیال ہوا تھا کہ میں نے اسے کہیں دیکھا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا بھی تھا کہ ہم پہلے کبھی ایک دوسرے سے ملے تھے؟ اب آپ بھی یہی کہہ رہی ہیں!۔ تو کیا؟"

اب اس کی ماں سے ملوں تو پتہ چلے؟" بیگم ہاشم نے پر تفکر لہجے میں جواب دیا۔

پھر دفعتہً شکیل سے مخاطب ہو گئیں!:

"بیٹا تم لوگ کتنے بھائی بہن ہو؟"

"جی میرا کوئی بھائی بہن نہیں ہے!۔ میں تنہا ہوں!۔" شکیل نے کہا۔

وہ چپ ہو گئیں!۔ اور جان بوجھ کر کوئی سوال نہ کیے۔ وہ کسی اندیشے سے خائف تھیں۔

ملازم ایک بار پھر شکیل کے لیے بسکٹ اور شربت لے آیا۔ کمشنر صاحب اور سعید

صاحب اس سے رخصت ہو کر چلے گئے!۔

شکیل نے عبید سے کہا: آپ کو زحمت ہو گی عبید میاں۔ مگر ذرا امی سے کہہ آیئے کہ اگر مل چکی ہوں تو۔ چلیں!؛

مصطفےٰ کو بے ساختہ ہنسی آ گئی! مل چکی ہوں!۔ نوید نے کہا: تم بھی تو روحی سے ملنا چاہتے تھے۔ آؤ میں تمھیں پہونچا دوں!؛

"آپ کی اجازت ہے!؛ وہ بے حد پر امید ہو کر انھیں تکنے لگا!۔ بالکل!۔ آؤ میرے ساتھ! نوید نے کہا۔

شکیل اٹھ کر ان کے ساتھ چلا گیا!۔

آمنہ بیگم چونکہ سارے حالات جانتی تھیں۔ انھوں نے روحی کے ملفوظات سے سلمیٰ کو بھی محرم نہ رکھا تھا۔ لہٰذا یہ نئی مہمان یعنی ناظمہ بیگم ان کے لیے نئی نہ رہی تھیں۔ انھوں نے اخلاقاً بھی ان سے بہت اچھی طرح گفتگو کی تھی۔ اور ابھی کچھ اپنے ذاتی حالات پر روشنی ڈال رہی تھیں کہ مصطفےٰ نے بیگم ہاشم کو پہونچا دیا۔ مصطفےٰ نے دروازے پر پڑا پردہ ایک طرف سرکایا تھا۔ اور جب تک وہ کمرے میں نہیں آ گئیں وہ پردہ تھامے آڑ میں کھڑے رہے تھے۔ آہٹ سن کر خود بخود سب کی نظریں ادھر اٹھی تھیں۔ اور ناظمہ بیگم بھی ادھر دیکھنے لگی تھیں!۔ ان کی نگاہیں مصطفےٰ کے ہاتھ پر جم کر رہ گئیں! ان کے سیدھے کف دست پر بچپن ہی سے سکے کے برابر سرخی مائل سیاہ داغ تھا! اور ہمیشہ ہی ان کا نشان شناخت رہا تھا!۔

ناظمہ بیگم کا چہرہ سفید ہونے لگا! بیگم ہاشم جب کمرے میں آگئیں تو مصطفےٰ نے پردہ چھوڑ دیا اور کہتے ہوئے چلے گئے!۔

"میں چائے ابھی بھجواتا ہوں!"

آداب بہن صاحبہ!" بیگم ہاشم نے ناظمہ بیگم کی محویت توڑی۔ !کچھ شرمندہ سی ہو کر انھوں نے ان کے سلام کا جواب دیا اور دوسرا سوال بھی کیا۔

"ان کی آواز۔ وہ ہاتھ۔ بہن مجھے معاف کیجئے۔ وہ ہاتھ کس کا تھا؟"

ہاتھ؟" بیگم ہاشم نے حیرت سے دوہرایا" میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی! آپ کسے پوچھ رہی ہیں!؟۔

میں کہیں پاگل نہ ہو جاؤں۔ خدا میرے حال پر رحم کرے!" ناظمہ بیگم نے ایک گہری سانس لے کر کہا" میں یہ پوچھ رہی تھی کہ وہ صاحب جو ابھی پردہ ہٹانے کھڑے تھے۔ کون تھے۔ ان کے سیدھے ہاتھ کی پشت پر وہ سیاہ داغ کیسا تھا؟"

ارے۔ وہ۔ وہ میرا بیٹا ہے۔ مصطفےٰ احمد" بیگم ہاشم نے جواب دیا" اور وہ۔ داغ۔ جس کا آپ تذکرہ کر رہی ہیں۔ وہ تو۔ مگر یہ بتائیے۔ کیا آپ اس داغ سے اتنی متاثر ہو گئی ہیں۔ آپ کی عجیب حالت ہو رہی ہے! کیا بات ہے؟"

ناظمہ بیگم نے خود کو سنبھال لیا اور ایک عجیب سی درد آلود رحم طلب آواز میں بولیں:

"میں آپ کو کیا بتاؤں۔ بہن۔ میرے پاگل پن کی بات ہے۔ آپ سن کر مجھے نجانے کیا کہیں گی۔ دراصل۔ میرا بھی ایک بچہ تھا۔ بہن صاحبہ۔ وہ تین ساڑھے تین سال کی عمر میں ایک سفر میں کھو گیا!۔ آپ سچ مانیے کہ ایسا ہی سیاہ داغ اس کے سیدھے ہاتھ کی پشت پر بھی تھا!۔ وہ داغ پیدائشی تھا!۔ وہ پھر کھسیائی سی ہنسی ہنس کر بولیں:" اس کے مرحوم باپ مذاق میں کہا کرتے تھے کہ خدا نے

ایک نشانی دے دی ہے۔ کہیں اگر کھو جائے گا تو اسی داغ کی وجہ سے مل بھی جائے گا!۔ میں منع کرتی تھی کہ ایسی فال بد منھ سے نہ نکالیے۔ مگر نجانے وہ کون سی گھڑی تھی کہ ان کا کہا پورا ہو گیا!"

"کیا مطلب۔ کیا وہ بچہ۔ کہیں گم ہو گیا؟" آمنہ بیگم نے پوچھا اور معنی خیز نظروں سے بیگم ہاشم کو دیکھا۔ جن کا چہرہ عجیب سا ہو رہا تھا!۔

"ہاں کھو گیا وہ!" آہ بھر کر ناظمہ بیگم نے کہا اور اپنی پرنم آنکھیں آنچل سے صاف کرتی ہوئی بولیں: "کیا بتاؤں میں اپنی داستان الم۔ گھنٹوں سناؤں تو ختم نہ ہو۔ دراصل ہم یہاں کے نہیں ہیں۔ میرا میکہ اور سسرال سب بھوپال میں ہے۔ وہاں میری شادی ہوئی۔ وہیں بچے ہوئے وہیں دنیا بھر کے ستم سہے اور وہیں سے حیدرآباد آتے ہوئے راستے میں اولاد بھی کھوئی۔!"

"توبہ۔ بڑا برا لگ رہا ہے۔ آخر کیسے کھوئی آپ نے اپنی اولاد؟" سلمیٰ کو ان پر رحم آ رہا تھا: "راستے سے کوئی آپ کا بچہ اٹھا لے گیا تھا؟"

"نہیں بی بی۔ جب سسرال والوں کی نازیبا حرکتیں حد سے بڑھ گئیں تو تبکیل کے ابا نے مناسب سمجھا کہ ان سب سے علحدگی ہی اچھی": ناظمہ بیگم بولیں: "یہاں ان مرحوم کے ایک دوست رہتے تھے انھوں نے بلا لیا تھا کہ یہاں آ کے ان کا... کاروبار دیکھیں۔ انھوں نے بھی سوچا کہ ٹھیک ہے۔ اب ہجرت ہی سہی!۔ حیدرآباد آ رہے تھے۔ ایک اسٹیشن پر ریل رکی تھی۔ میرا انجیل چھوٹا سا تھا۔ اسے لے کر اس کا کھلانے والا لڑکا اسٹیشن پر اترا تھا۔ کچھ چائے وغیرہ منگوائی تھی۔ یاد نہیں اس نے بچے کو گود سے اُتار دیا اور چائے لے آیا۔ پھر اس کو یاد ہی نہ آیا کہ بچے کو اس نے دکان پر چھوڑ دیا ہے۔ ٹرین چلنے لگی تھی۔ خود بھاگ کر ڈبے میں چڑھ گیا۔ بچہ وہیں رہ گیا!"

"ہائے اللہ۔ آپ نے اس ظالم یزید سے پوچھا نہیں۔ فوراً زنجیر کھینچ کر ریل رکوائی نہیں"۔ سلمٰی نے کہا۔

"وہ لڑکا ڈر کے مارے کہیں راستے میں اتر گیا!" ناظمہ بیگم نے کہا۔ "ہم کو یہ گمان تک نہ تھا کہ ایک محرومی سے دوچار ہو چکے ہیں۔ شکیب کے والد یہی سمجھتے رہے کہ بچہ زنانے درجے میں میرے پاس ہے۔ میں اسی خیال میں رہی کہ بچہ ان کے پاس مردانہ ڈبے میں ہے۔ یہ تو نہ جانے کتنے اسٹیشنوں کے بعد پتہ چلا کہ بلبل نہ ان کے پاس تھا نہ میرے پاس! ہم لوگ پاگل ہو گئے تھے۔ سر پیٹ کر رہ گئے!۔ اب اسے کہاں تلاش کرتے!۔ پھر بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ لیکن قسمت میں اس سے ہمیشہ کی جدائی لکھی تھی۔ کہیں نہ ملا۔ اس کے ابا پھر اس کی جدائی میں بہت دن جی نہ سکے!۔ اور ادھر روتے روتے میری بینائی چلی گئی!۔ اللہ پاک کی مرضی۔ ابھی تک آس تھی کہ شاید قدرت کو مجھ پر رحم آجائے۔ میرا بچہ کہیں سے آن ملے۔ مگر ابھی تک تو دعاؤں کی تاثیر دکھائی نہیں دی ہے۔ ہر دم پروردگار سے دعائیں مانگتی ہوں۔ جہاں کہیں بھی ہو زندہ سلامت رہے۔ خوش رہے۔ اور مرنے سے پہلے اللہ اسے مجھ سے ملا دے!"

"آپ کی دعاؤں میں اثر ضرور ہوگا۔ بہن! آپ یوں نہ روئیے۔ ناحق آپ نے یہ پرانا قصہ چھیڑا ہے۔ تکلیف دہ یادیں بھلا دی جائیں تو اچھا ہے"۔ سلمٰی نے کہا۔ "آپ آنسو پونچھ لیجئے۔ اتنے سے سیاہ داغ کو دیکھ کر آپ کی یہ حالت ہو گئی ہے کیا ایک جیسے داغوں کا ہاتھ پر ہونا ناممکن ہے؟"

"نہیں نہیں۔ آپ کچھ محسوس نہ کیجئے گا!" ناظمہ بیگم نے جلدی سے کہا۔ "یہ سچ ہے کہ ایسا ہونا ناممکن نہیں ہے۔ مگر چونکہ برسہا برس بعد ویسی ہی چیز نظر پڑی تو میں ضبط نہ کر سکی تھی۔ کیا آپ نے برا مانا ہے بہن!"

"توبہ توبہ آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں۔ آپ کی کہانی اتنی دردبھری ہے۔ اسے سن کر میرا

تو دل بھر آیا ہے۔ برا ماننے کی کیا بات ہے"۔ سلمیٰ نے کہا۔ باتیں وہی کر رہی تھیں اور بیگم ہاشم اور آمنہ بیگم چپ تھیں۔ ان کے ذہن میں گرداب سے بن رہے تھے بگڑ رہے تھے!۔

انھیں یقین کرنے میں ذرا بھی تامل نہ تھا کہ میجر مصطفیٰ حقیقتاً ناظمہ بیگم کے گمشدہ بیٹے اور شکیل کے حقیقی بڑے بھائی تھے! مگر ان میں اس حقیقت کے اظہار کی ہمت بھی نہ تھی!۔ وہ سب مصطفیٰ سے بے حد محبت کرتے تھے اور محبت کی خود غرضی مشہور ہے!۔

نوید نے اپنی مرضی سے شکیل کو اجازت دے دی تھی کہ وہ روحی سے مل سکتا تھا! جب وہ بڑے کمرے میں پہونچا تب اس کا دل اتنی شدت سے دھڑک رہا تھا کہ سینے میں تکلیف سی شروع ہو گئی تھی! وہاں جویریہ بھی تھی مگر وہ جو بڑی رازدار تھی اور روحی کی غم خوار بھی تھی۔ اس نے بھی جان بوجھ کر انھیں تنہائی عطا کر دی۔

روحی کی کیفیت بھی شکیل سے مختلف نہ تھی!۔ وہ میز کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی تھی اور لرزہ بر اندام تھی۔

شکیل نے خود پر قابو پا کر روحی کو سنبھلنے کا موقعہ دینے کی خاطر کہا۔

"تسلیم۔ روحی!"

تسلیم! وہ جیسے بہت بڑی قصور وار تھی۔ اس نے بہت چپکے سے جواب دیا۔ حالانکہ مصطفیٰ کسی کی ٹوہ میں رہنا برا فعل سمجھتے تھے لیکن انھیں ان دونوں کی گفتگو سننے کا اشتیاق تھا۔ آیا شکیل بیٹا بھی ویسا ہی تھا جیسا صورتاً تھا!۔ انھوں نے جواب الجواب تسلیمات سنیں اور بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کی!۔ کتنے احمق ہو جاتے ہیں محبت کرنے والے۔!

"بیٹھئے!" روحی بولی تھی۔

"نہیں مجھے بیٹھنا نہیں ہے۔" شکیل نے اس کے قریب آکر کہا۔ "میں ان صاحب سے دس منٹ کی اجازت لیکر آیا ہوں اور نہیں چاہتا کہ دس منٹ سے زیادہ وقت صرف کردوں۔ روحی وقت کم ہے باتیں بہت۔ مجھے بتاؤ اب کیا تم کبھی یونیورسٹی نہیں آؤگی"

"نہیں! ڈیڈی نے اجازت نہیں دی۔!" روحی جیسے سسک پڑی۔ "تمھاری اس محرومی کا ذمہ دار میں ہوں۔ روحی۔ میں جانتا ہوں۔ اگر تم مجھ سے نہ ملتیں تمھارا اضطراب کئی رازوں کی تشہیر نہ بنتا تو تمھارے ڈیڈی یہ قدم کبھی نہ اٹھاتے مجھے صرف یہ کہنا ہے روحی کہ میں نے بھی تعلیم چھوڑ دی ہے۔ اور شاید امروز فردا میں تمھارے شہر کو بھی چھوڑ جاؤں گا!۔ پھر۔ تمھاری یاد، تمھارا ساتھ۔ میرے لیے ماضی کی دلشکن داستان بن کر رہ جائے گا!۔ روحی جب بدنصیبی، انسان کے ہر ارمان، ہر خواہش اور چھوٹی سے چھوٹی ہر تمنا کو برباد کر دے تو آدمی حوصلہ، ہمت اور امنگ سب ہار جاتا ہے۔! میں نے بھی اپنے بُرے مقدر کے آگے سپر ڈال دی۔ اور اُسے دعوت دے دی ہے کہ اب جتنا چاہے مجھے تباہ کرے۔ مجھے کچلے۔ مجھے موت کے گھاٹ اتار دے۔! میں۔ تمھارا۔ بہت شکر گزار ہوں۔ تم نے کچھ عرصے ہی کے لیے سہی۔ بہاروں کے خواب مجھے دکھائے تھے! لیکن تعبیر پر نہ تمھارا اختیار رکھا نہ میرا۔ اس پر مقدرات قابض تھے۔ ان کی تعبیر خزاں کی صورت میں نکلی!۔ اب میں ۔!"

روحی نے اسے مزید کہنے سے روک دیا۔ اور آگے بڑھ کر اس کا بازو دونوں ہاتھوں میں جکڑ لیا۔ اور بے اختیار پھوٹ پڑی۔

"نہیں شکیل صاحب۔ ایسا نامراد فیصلہ مت کیجئے! میں تو ابھی امید پر جی رہی ہوں۔ آج نہیں تو کل۔ کبھی مقدر ہم پر مہربان ہوگا! کبھی تو میرے ماں باپ کو معلوم ہوگا کہ میری زندگی جس سے عبادت ہے۔ وہ آرزو کیا ہے۔

آپ کے جانے کے بعد۔ میں ناشاد و محروم مر جاؤں گی !۔ آپ خود پر اور مجھ پر ستم ڈھا رہے ہیں !۔ ذرا سوچیے کہ ۔ ۔ !"

اس کی بات بھی شکیل نے کاٹ دی۔ اور آہستہ سے اپنا بازو اس کی گرفت سے آزاد کر لیا پھر گلا صاف کر کے بولا ۔

" روحی ۔ وقت ہو رہا ہے۔ مجھے اجازت دو ۔! اگر کبھی میں یہاں آؤں گا تب تم سے ملوں گا !۔ سنو روحی ۔ انسان کی زندگی میں مختلف نشیب و فراز آتے ہیں ان سے متاثر ہو کر کوئی نامناسب قدم اٹھانا دانشمندی نہیں ہے ۔ تم ایک پر مسرت زندگی کی طرف قدم بڑھاؤ گی اور تم یہ بھی بھول جاؤ گی کہ یہ دن کبھی تمہارے لیے سب سے حسین دن تھے !۔ اب میری ایک خواہش تم پوری کر دو ۔ مجھے میری تصویر واپس کر دو یا پھر اسے تلف کر دو ۔ اس کا تمہارے پاس رہنا مناسب نہیں ہے میں اپنی بیاض بھی واپس چاہتا ہوں ۔ مجھے یہ گوارہ نہیں ہے کہ وہ کسی کے ہاتھ پڑے اور اس سلسلے میں تم سے پوچھ گچھ کی جائے !۔

روحی کا چہرہ چاک کی مانند سفید ہو رہا تھا۔ وہ اسے تک رہی تھی !۔

" تم نے ۔ امی کو ۔ یہ رقم دی تھی !۔ شکیل نے ہنس کر اپنی آنکھیں ملا ڈالیں " وہ خرچ نہیں ہو سکی ۔ ضرورت نہیں پڑی ۔ وہ تم رکھ لو ۔ سچ مچ تم بہت اچھی بہت مہربان رہی ہو ہمارے لیے !"

اس نے جیب سے ایک لفافہ نکالا اور میز پر رکھ دیا ۔ اور جانے کے لیے مڑ گیا ۔

" دس منٹ پورے ہو گئے !۔ اب میں جاتا ہوں ۔ اور تم سے دست بستہ التجا کیے جاتا ہوں کہ کبھی کوئی خطرناک و خوفناک اور نامناسب قدم نہ اٹھانا ۔ اچھا روحی ۔ خدا حافظ !"

وہ مڑا اور اسے دیکھے بغیر کمرے سے نکل گیا !۔

جب ناظمہ بیگم اس سے مل کر رخصت ہوئیں تب وہ یوں روئی تھی۔ جیسے اس کے دل کا خون آنکھوں سے بہہ رہا ہو!۔ اسے احساس تھا کہ شکیل کی غربت و تنگدستی نے اسے اس قدر مایوس و نامراد کر دیا تھا!۔

اور اب ظالم تقدیر کے سامنے وہ بھی سپر انداز ہو چکی تھی!۔ جس اندھے کنوئیں میں چاہیں اسے جھونک دیں!۔

مشہور ہے کہ خون کو خون پکارتا ہے!۔ یہ بات صحیح ہو یا غلط، لیکن شکیل سے ملنے کے بعد ایک بیقراری سی مصطفےٰ کو لگ گئی!۔ اس کی وہ گفتگو بھی انھوں نے سنی تھی اور اسے عام نوجوانوں کی صف سے بہت مختلف پایا تھا!۔ اب ان کی کوشش یہی تھی کہ کسی طرح اسے روحی سے وابستہ کر دیں۔ ایثار و قربانی جب تک عملی شکل میں نہ آئے۔ اس کا احساس کیسے ہو سکتا ہے!۔

انھوں نے جب سعید صاحب سے اس امر پر گفتگو کی تو خلاف امید وہ راضی ہو گئے!۔ اور بولے "میں جانتا ہوں کہ وہ صاحبزادے میری کوئی مالی امداد قبول نہیں کریں گے۔ ان کی گفتگو و انداز سے میں ان کی فطرت سے بخوبی واقف ہو گیا ہوں۔ اگر روحی ان کے ساتھ گزر کر سکتی ہے۔ تو پھر بسم اللہ کرو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں!۔ اگر روحی کی شادی اس کے ساتھ ہو جاتی۔ بعد کو وہ مالی پریشانی کا شکار ہوتا تو کیا ہم اسے گھر بٹھا لیتے!"

"ایسا نہ ہو کہ ہم اپنے فیصلے میں دیر کر دیں اور وہ لوگ چلے جائیں۔ میں تو یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ کسی صورت ان تک اپنی رضامندی کی بات پہونچا

دی جائے۔ اور پھر جلد ہی یہ فرض پورا بھی ہو جائے!" نوید نے کہا۔ اب ہم لوگ بھی جانے جانے والے ہیں۔ بار بار اتنی دور سے آنا جانا کچھ دشوار ہو جائے گا!۔

"ہاں سوچ رہا ہوں کہ کس طرح کہا جائے گا؟" سعید صاحب نے کہا۔ ان دنوں بیگم ہاشم یہیں تھیں اور جب سے انھوں نے ناظمہ بیگم کی گفتگو سنی تھی۔ عجیب سے اضطراب و ہیجان میں مبتلا تھیں۔ انھوں نے کمشنر صاحب سے کہہ دیا تھا کہ ان کا شبہ یقین میں بدل گیا ہے۔ مصطفےٰ یقیناً ناظمہ بیگم ہی کے گمشدہ بیٹے ہیں!۔

آمنہ بیگم اور سلمیٰ و نوید کو بھی یہ بات پریشان کر رہی تھی! سلمیٰ نے کہا۔

"بھابی آپ کیسے برداشت کریں گی۔ اتنی کم عمری سے آپ نے مصطفےٰ کو پالا پوسا ہے۔ اور اب۔!"

"نہیں بیگم" ہو کر کمشنر صاحب نے بات کاٹ دی "برداشت کی ایک ہی کہی۔ اب وہ چھوٹے سے بچے نہیں رہے ہیں کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے آنسو بہائیں ضد کریں!۔ نہ یہ اتنی نا سمجھ ہیں!۔ میں تو اس بات کو مصطفےٰ سے چھپانے کی تائید میں نہیں ہوں۔ ان کے سامنے ساری باتیں رکھ دینی چاہئیں!۔ پھر جو فیصلہ وہ کریں۔ وہی ہمارے لیے بھی قابلِ قبول ہو گا!"

"وہ مجھے چھوڑ کر چلے جائیں گے!۔ جب سگی ماں مل جائے گی!" بیگم نے کہا!۔

"یقیناً انھیں جانا بھی چاہیے!" کمشنر صاحب نے فیصلہ دے دیا "مزید براں میں تو یہ سوچتا ہوں کہ اگر خدانخواستہ وہ اسی دھوکے میں رہ گئیں کہ ان کا بیٹا کہیں موجود نہیں ہے اور اس غم میں انھیں کچھ ہو گیا تو پھر۔ ہم اپنے ضمیر کی ملامت کو کس طرح برداشت کر سکیں گے؟۔

ہاں۔!" آمنہ بیگم نے بھی خدا کے خوف سے کانپ کر کہا "اللہ کو تو منہ دکھانا ہے اور یہ بہت بڑا گناہ ہے کہ جانتے بوجھتے غم نصیب دکھیاری ماں سے اس کا بیٹا

دور رکھا جائے!۔

خدا کو منھ دکھانا ہے۔" بیگم نے زیر لب کہا۔

"اور پھر۔ یہ بھی تو سوچئے کہ شکیل دل شکستہ ہوکر وطن بھاگ رہے ہیں ان کی والدہ مالی بحران میں مبتلا ہیں۔" نوید نے کہا۔ "مصطفےٰ خدا کے فضل سے چار ہزار ماہانہ تنخواہ پاتے ہیں۔ صورت حال کا علم انھیں ہوگا تو کیا وہ ماں اور چھوٹے بھائی کی کفالت نہ کریں گے؟"

میں سب سے پہلے تو مصطفےٰ ہی سے نظریں نہ چار کرسکوں گی!" بیگم بولیں۔"

ابھی تک جس راز کو میں نے چھپایا ہے۔ اس کا کیا جواز ہے؟۔

۔ اس کا جواز یہی ہے کہ ان کے خاندان کا جب پتہ چل گیا تو انھیں حالات سے آگاہ کردیا گیا!۔ وہ سمجھدار ہیں۔ ان سے کسی حماقت کی توقع نہ رکھو۔ اور جو کچھ بھی کہنا ہے۔ جلد فیصلہ کر کے بولو۔!"

بھابی! آپ نے کہا تھا کہ وہ محاذ پر بھی جانے والے ہیں۔ اس صورت میں تو جو کچھ کیجئے جلدی کیجئے!" سلمیٰ بولیں۔

بروقت بیگم کو معقول بہانہ سوجھ گیا!" میں تم لوگوں سے کہنا بھول گئی تھی۔ بعد کو انھوں نے کہا تھا کہ ابھی آرڈر نہیں ملے۔ شاید روانگی منسوخ ہوگئی ہے۔"

یہ تو بہت اچھا ہوا!" سلمیٰ نے کہا۔

بہرحال ایک فیصلہ پر پہنچنے کے بعد ان سب نے ہرچہ بادا باد کہہ کر مصطفےٰ کو تمام حالات سے آگاہ کردیا۔ یہ جان جوکھم کا کام کمشنر صاحب نے کیا تھا!۔ ان کا خیال تھا کہ مصطفےٰ پر حیرت، مسرت اور نجانے کون کون سے جذبات کا حملہ ہو جائے کہ پھر وہ سنبھل نہ سکیں! مگر سب کچھ سن کر انھوں

نے بڑے سکون سے کہا۔!

"سچ مانیے انکل!" وہ مسکرائے تھے "جب پہلے پہل میں نے شکیل کو دیکھا تھا تب اس سے مجھے بڑی محبت معلوم ہوئی تھی! بے اختیار جی چاہا تھا کہ اسے کھینچ کر سینے سے لگالوں۔ حالانکہ تب تو پتہ ہی نہ تھا کہ وہ محترمہ ناظمہ بیگم کا بیٹا ہے! واہ"

سعید صاحب اب بے حد خوش رہنے لگے تھے۔ بے ساختہ ہنس کر بولے "یہ کیا بات ہوئی۔ وہ تو محترمہ ناظمہ بیگم کا بیٹا ہے ہی۔ یہ کہو تمہیں پتہ نہ تھا کہ تم بھی انہی کے بیٹے ہو!۔

ہو سکتا ہے کہ یہ بات صحیح ہو لیکن میں جسے ماں کہہ چکا۔ کہہ چکا!" مصطفےٰ نے بیگم ہاشم کا رنگ پریدہ دیکھ کر کہا "اب آپ لوگ ان سے یہ مت کہیے کہ وہ بھی میری ماں ہیں!۔ وہ اپنے بیٹے کو کھو چکی ہیں۔ لیکن باجی اماں کے حق میں گم ہو کر ان کے آنسوؤں کا سبب نہیں بن سکتا!"

ہزار سلام پہونچیں اس ماں کو۔ جس نے تجھے جنم دیا ہے بیٹا۔!" بیگم ہاشم نے انھیں سینے سے لگا کر چوم لیا "تجھے خدا خوشیاں دے۔ تیری عمر بڑی کرے۔! ایسا نہ کہو میرے لال۔ تو کیا جانے کہ دکھ کا درد کیا ہوتا ہے۔ اب تو میں خود تجھے ساتھ لے جاؤں گی اور ان بیوی سے ملاؤں گی کہ لیجیے اپنی کھوئی ہوئی امانت بیٹا۔ میں تجھے اپنا بنا کر اللہ کی اتنی بڑی گنہگار نہ بنوں گی!"

"اور یہ کہ۔ ایک ماں اپنے کئی بچوں کو پالتی انھیں یکساں محبت دیتی ہے تو کیا ایک بیٹا اپنی دو ماؤں کو اپنی برابر برابر محبت نہیں دے سکتا!"

سعید صاحب نے کہا!۔

بالکل!" مصطفےٰ نے کہا "اور حقیقت تو یہ ہے کہ میں جس قدر اس ماں

سے محبت کرتا ہوں۔ اس ماں سے نہیں کر سکوں گا!۔ وہ نئی ہیں! مگر یہ بتائیے کہ جو انکشافات آپ نے بتائے ہیں وہ کیا واقعی حقیقت پر مبنی ہیں کہ آپ لوگ خود کسی دھوکے میں ہیں۔ کسی غیر خاتون کے حوالے کر رہے ہیں مجھے خوامخواہ کا گمشدہ بیٹا بنا کر۔۔!"

جو حالات انھوں نے سنائے ہیں!۔ وہ من وعن یہی ہیں۔ جو انہیں پیش آئے تھے!" کمشنر صاحب بولے۔

سہ پہر ڈھل چکی تھی۔ جب بیگم ہاشم اور سعید صاحب وغیرہ کاروں میں بھر کر شکیل کے گھر پہونچے تھے!۔ یہاں تک رہنمائی روحی نے کی تھی!۔ اس کی دنیا ایک بار پھر بدل گئی تھی!۔ اب وہ خود کو سب سے زیادہ خوش نصیب ہستی سمجھ رہی تھی!۔

دروازہ شکیل نے کھولا تھا اور ان تمام لوگوں کو دیکھ کر وہ حیرت کی زیادتی سے گنگ ہو گیا!۔ پھر بمشکل بولا تھا۔

"تشریف لائیے جناب!"

ناظمہ بیگم بیچ دالان میں کھڑی تھیں۔ حیران حیران سی۔ کیوں یہ لوگ آئے تھے۔ اس وقت انھیں پردہ کرنے کا بھی خیال نہ تھا۔ نہ ان میں سے کسی کو اس کا ہوش تھا۔ ناظمہ بیگم سراپا چشم بنی مصطفےٰ کو دیکھ رہی تھیں!۔ اور مصطفےٰ اس تصویر کو جو میز پر رکھی تھی!۔ ان کے اپنے مرحوم باپ کی تصویر۔ جس میں اور مصطفےٰ میں زیادہ فرق نہ تھا!۔

دالان میں رخت سفر بندھا رکھا تھا!۔ تخت چادروں سے محروم تھے۔ پلنگ اٹھا کر کھڑے کر دیے گئے تھے۔ چولھے کے پاس خاک اڑ رہی تھی!۔ معاملہ کچھ الٹا نظر آ رہا تھا!۔

آپ لوگ کہیں جا رہے ہیں کیا؟" سلمیٰ نے پوچھا اور ہنس کر سب سے بولیں "ارے بیٹھ جایئے نا آپ لوگ ادھر ادھر۔ اب کاہے کا تکلف۔؟

ناظمہ بہن۔ کہاں کا قصد ہے؟" بیگم ہاشم نے پوچھا۔

بس یہاں۔!" وہ بولیں۔

کیوں کیا کچھ پتہ چل گیا ہے کہ اُدھر۔!" وہ بولیں۔

اب کیا پتہ چلے گا؟" انھوں نے کہا۔

جاؤ بیٹی تم لوگ چائے بناؤ!" سعید صاحب نے روحی اور جویریہ کو حکم دیا" روحی تو یہاں آتی رہتی تھی نا اسے سب پتہ ہوگا!۔

میں شرمندہ ہوں کہ۔آپ لوگ ایسے وقت تشریف لائے جبکہ ہمارے نکلنے میں تھوڑی ہی دیر باقی ہے" ناظمہ بیگم کہا" گھر کباڑخانہ ہو رہا ہے۔ ٹھہریئے۔ میں دری بچھاتی ہوں!"

اب آپ کہاں جا سکتی ہیں بہن صاحبہ!" کمشنر صاحب نے بھاری آواز میں کہا" آپ اگر دل کو مضبوط کریں تو میں آپ کو ایک خوشخبری سناتا ہوں کہ آپکا برسوں پہلے کا کھویا ہوا بیٹا۔"

ہاں۔ وہ۔ کہاں ہے" ناظمہ بیگم نے ان کی بات کاٹ دی" کچھ خبر آپ کو ملی ہے۔ بھائی صاحب!"

مصطفےٰ!" انھوں نے کہا۔

اور مصطفےٰ اٹھ کر ناظمہ بیگم کے سامنے جھک گئے!۔ اپنے آنسوؤں کو سب سے چھپا کر۔

"آپ؟" شکیل خوشی حیرت و مسرت سے گنگنایا۔ وہ حیران تھا۔

آپ کا بیٹا۔!۔ آپ کا بیٹا!" کمشنر صاحب نے کہا" ہمیں آپ نے بالا ہے جو

کہ اُس نیا تھا بے خبری میں۔ ہم اسے چھ فٹ کے جوان کی صورت میں واپس کر رہے ہیں!"
پھر انھوں نے مختصر سی تفصیل انھیں سنائی!
فاطمہ بیگم نے جھک کر اپنے پہاڑ سے بیٹے کی پیشانی پر بوسہ دیا تھا پھر وہ یک لخت
زار و قطار رونے لگی تھیں۔!
انھیں دفعتہً بے پناہ خوشیاں نصیب ہوگئی تھیں!۔ اب بھی انھیں یقین نہیں آرہا تھا
کہ وہ واقعی کوئی خواب نہیں دیکھ رہی تھیں!۔
اب وہ سب ایک ہی خاندان کے افراد کی طرح باتیں کر رہے تھے!۔ روحی اور جویریہ بھی تھیں
کمشنر صاحب نے اعلان کر دیا "اب آپ کہیں نہیں جائیں گی آپ کو اپنا بچہ ملا ہے
اس خوشی میں بڑا بھاری جشن ہوگا!۔ مصطفیٰ دل بھر کے اپنے بھائی میاں شکیل سے باتیں
کریں گے اور وہاں سب سے اہم بات تو میں کہنا بھول گیا کہ جشن کی رات میں ایک اور
اہم اعلان کروں گا!" "وہ ابھی کر دیجیے نا!" زیر بحث شکیل نے منہ کھولا اور کھول کر پچھتایا
کیونکہ فوراً ہی کمشنر صاحب نے قہقہہ لگا کر اعلان کیا۔
"صاحبزادے سنیے وہ اعلان۔ یہ ہے کہ جشن کی رات تمھاری اور مصطفیٰ کی شادیوں کا
جشن بھی ہوگا مطلب یہ کہ ڈبل جشن ہوگا! عین اسی وقت اتفاق سے شکیل کی نظر روحی کی
طرف اٹھ گئی اور مصطفیٰ نے شرارت سے مسکرا کر جویریہ کو دیکھ لیا تھا!۔
انھیں یکبارگی ہنسی آگئی تھی!" روحی اور جویریہ مارے شرم کے لال ہوگئیں! مصطفیٰ
نے بڑی محبت سے فاطمہ بیگم کا ہاتھ تھام کر کہا
"چلیے امی اب آپ اپنے بیٹے کے گھر چلیے!!"
اور پھر شکیل کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔
"آؤ بھائی! چلیں!!۔
پھر شکیل کا تھما ہوا ہاتھ تھام کر مصطفیٰ نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا!!! ختم شد

خواتین کے لئے سدا بہار اور مشہور رومانی ناول

ناول	مصنفہ	ناول	مصنفہ
سارے جہاں کا درد	رفیعہ منظور الامین	غم جاناں	ہاجرہ نازلی
آتش خاموش	صالحہ عابد حسین	گھنی چھاؤں تلے	״
قطرے سے گہر ہونے تک	״	خوابوں کے سویرے	״
افشاں	اے۔ آر۔ خاتون	انتظار سحر	״
چشمہ	״	نمود سحر	״
رخشاں	مشرف تمیز	رومہ	سرور جہاں
صباحت	״	تزئین	״
سلما	بلقیس ظفر	تاباں	״
پلکوں تلے	عطیہ پروین	گردشیں	״
ناظمہ	״	چارہ گر	بشریٰ رحمٰن
ترا غم رہے سلامت	״	نادرہ	زبیدہ خاتون
مہ لقا	״	ترنم	״
تیری آنکھوں کے دیے	״	ناہید	رفیعہ بٹ
بہاریں پھر بھی آتی ہیں	״	صاعقہ	״
چندا	״	عاشی	״
شہابی	شہناز کنول	صدف	سلمیٰ کنول
بادل کا سایہ	״	صبا	״
نیلوفر	شاہدہ بانو	سوز و ساز	نجمہ اعزاز